من کے موتی
صفیہ بشیر سامی - لندن

دَرد کی ڈور میں یادوں کا سہارا لے کر
اپنی پلکوں سے پِرو لائی ہوں من کے موتی

مکرم بشیرالدین احمد سامی صاحب اور صفیہ بشیر سامی کی تحریرات

صفیہ بشیر سامی - لندن

نام کتاب	:	من کے موتی
مصنفہ	:	صفیہ بشیر سامی-لندن
سال اشاعت	:	2019ء
تعداد	:	500
رابطہ	:	

105, Salisbury Road
Worcester Park, Surrey - KT4 7BZ
United Kingdom.
safiasami@live.com

The Pearls of My Heart
A Memoir
by
Mr. Bashiruddin Ahmad Sami
Mrs. Safia Bashir Sami

إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ
وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (التوبۃ:116)

یقیناً اللہ ہی ہے جس کی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔

وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا بھی ہے

اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔

اُس شخص کے نام

جس کے ساتھ اللہ نے میری ایسی جوڑی بنائی

کہ میں سب بھول بھال گئی

اور اُس کی ہوگئی جو میرا پہلے کچھ بھی نہیں تھا

اور یہ آج اُسی کے نام کرتی ہوں

جس نے جنت میں بھی

ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے!

وباللہ التوفیق

○○

عرضِ حال

بچہ پہلے گھٹنوں کے بل چلتا ہے، پھر پاؤں پاؤں چلنا شروع کرتا، جب وہ چلتا ہے تو بار بار گرتا ہے، وقت کے ساتھ پہلی سیڑھی چڑھتا ہے، ماں باپ خوشی سے پھولے نہیں سماتے، پھر وہ خوش ہوکر دوسری سیڑھی پر پاؤں رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

کچھ ایسے ہی میرا حال ہے۔ مَیں نے جب ''میری پونجی ،، لکھی تو یقین بھی نہیں کرسکتی تھی کہ اس کتاب کو کوئی پڑھے گا کافی دیر اُس کو گھر میں ہی رکھے رکھا، کسی کو بھی دکھاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ باوجود اس بات کے کہ اُس میں میرے اپنوں نے بہت اچھے تبصرے کئے تھے بہت حوصلہ افزائی فرمائی تھی، مگر اپنے اُوپر ہی اعتماد نہیں تھا، لیکن الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔

پڑھنے والوں نے 'میری پونجی' پسند کی داد بھی دی دعائیں بھی دیں، سب سے بڑھ کر میری خوش نصیبی کے پیارے آقا نے بھی دلجوئی فرمائی ۔محترم مولانا مبارک احمد نذیر صاحب (مشنری کینیڈا) نے بہت محبت بھرا تبصرہ فرمایا اور کینیڈا سے ہی محترم جناب لال خان ملک صاحب امیر جماعت کینیڈا نے بھی بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور اسی طرح لندن سے ہمارے بہت ہی اچھے ادیب، شاعر محترم مباک احمد صدیقی صاحب نے دل کھول کر داد دی اور پھر بے شمار لوگوں کے فون اور تبصرے مجھے ملے۔

مَیں اُن سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کی نظر سے بھی 'میری پونجی' گزری ہوگی جنہوں نے پڑھی اور پڑھنے کے بعد مجھے لکھا بھی اور حوصلہ بھی بڑھایا ہے۔

'من کے موتی' میری دوسری کتاب ہے، پہلی کتاب کی طرح دوسری کتاب کی

اشاعت میں بھی میری کوئی بہادری نہیں۔اس کتاب میں وہ تحریریں ہیں جو پہلے شائع ہو چکی ہیں۔ میں ان تحریروں کے متعلق صرف یہی کہوں گی ان میں زیادہ تر سامی صاحب کی لکھی ہوئی وہ تحریریں ہیں جن کا تعلق اپنی جماعت احمدیہ کی رپورٹ کے متعلق ہے اور میری وہ تحریریں ہیں جن کو میں انجانے میں لکھ گئی ہوں اور زیادہ تر پہلے ہی چھپ چکی ہیں۔ یہ وہ تحریریں نہیں ہیں جو اگر میں نہ لکھتی تو کوئی بھی لکھ نہ پاتا۔اگر میں نہیں تو کوئی بھی لکھ سکتا تھا اور شاید مجھ سے بہتر ہی لکھتا اور یہ سب بوند بوند میرے من کے موتی ہیں جن کو پِرو کر میرے من کی مالا بن جائے گی۔

سب سے پہلے میں سامی صاحب کا لکھا ہوا وہ مضمون جس میں حضرت المصلح الموعودؓ کا لکھا ہوا بہت ہی جذباتی پیغام ہے، پیش کروں گی جو تقریباً آج سے 64 سال پہلے کراچی کی جماعت میں خدام الاحمدیہ کے اجتماع کے موقع پر پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ بہت ہی جذباتی اور ایمان افروز پیغام ہے اور اُس کے بعد سامی صاحب پر اُس پیغام کا کیا اثر ہوا اور اور اُنہوں نے کیسے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا وہ اُنہیں کے انداز میں لکھنے لگی ہوں۔ یہ مضمون ماہنامہ خالد ربوہ میں چھپ چکا ہے۔ یہ مضمون میں نے کراچی کے شعبہ اشاعت سے لیا ہے۔ میں دل کی گہرائی سے کراچی والوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

پھر اسی طرح سامی صاحب کے وہ مضامین جو اخبار الفضل میں چھپ چکے ہیں اور تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں اور جتنے بھی مجھے ملے ہیں وہ بھی لکھوں گی ، انشااللہ۔اور کچھ وہ بھی جو میرے مضامین الفضل میں یا اخبار احمدیہ میں چھپ چکے وہ بھی اس کتاب کا حصہ بنیں گے۔

صفیہ بشیر سامیؔ ۔لندن

○○

مکتوب مبارک
حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی عَبْدِہِ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھوالنّاصر

لندن

Z-31/3/14

مکرمہ صفیہ بشیر سامی صاحبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی کتاب ''میری پونجی'' میں نے جستہ جستہ پڑھی ہے۔ماشاء اللہ اچھی کتاب ہے۔ بزرگوں کا ذکر، ان کے واقعات، ان کی نیکیاں اگر یاد رکھی جائیں تو یہ ان بزرگوں کی اولادوں کو اپنے آباء کے نقش قدم پر چلانے کا ذریعہ ہیں۔آپ کی ''میری پونجی'' میں جہاں بزرگوں کا ذکر ہے وہاں تاریخ احمدیت کے کچھ باب ہیں۔پھر آپ کے خاوند مرحوم کی خدمات، جماعت سے تعلق آپ نے بڑی محنت سے اپنے خاندان کو سرمایہ جمع کر کے دیا ہے۔اللہ کرے آئندہ نسلیں اس کی قدر کرتے ہوئے اپنے آباء کے اس سرمائے کا صحیح استعمال کریں اور خلافت اور جماعت سے وفا کا تعلق رکھیں۔ تعلق باللہ میں بڑھنے والی ہوں اور آپ کی اس عظیم خدمت پر آپ کے لئے دعائیں کرنے والی ہوں۔آمین

والسلام

خاکسار

[دستخط]

خلیفۃ المسیح الخامس

مکتوب محترم لال خان ملک صاحب

امیر جماعت ہائے احمدیہ کینیڈا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیارے منیر سامی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کتاب ''میری پونجی'' کا مطالعہ کر کے خوشی حاصل ہوئی۔ مصنفہ (صفیہ سامی صاحبہ) کا پوری کتاب میں ایک ہی فقرہ ایسا پڑھا جس سے میں اتفاق نہیں رکھتا، اور وہ یہ ہے کہ اُن کو لکھنے کا علم نہیں۔

آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ایسے نیک اور پیارے والدین نصیب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی اولاد کو اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ آپ سب کے ساتھ ہو۔ آمین۔

والسلام

لال خان ملک

○○

مکتوب محترم مولانا مبارک نذیر صاحب

مشنری انچارج کینیڈا

Dear Munir

Assalāmu ʻAlaikum wa Raḥmatullāhi wa Barakātuh

I have been reading this very interesting book written by your mother who I consider as my sister. She is a unique writer. Once you start reading any page at random it is difficult to put it down. You know that her elder sister Saida Shameem is married to my mammu Sheikh Abdul Majeed Sahib. She is also a great help to our mammujees's writings. But your mother has surpassed all. MashaAllah. I fondly remember when we used to visit your house opposite the Jamia on Rabwah. Sister Saffia would talk to me but always in strict parda. Please tell her that by my reading her book she looks taller than her actual height. Then your late father and his service and humility and piety further polished her. And most of all the relationship with the Khulafa.

I have read some portions many times and it is a companion at my free hours. May Allah bless her and all her family. Amen.

Mubarak Nazir

○○

مکتوب عزیزم محمد اسلم خالد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمعۃ المبارک 31/جنوری 2014

پیاری آپا!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے آپ کی کتاب 'میری پونجی' کو بار بار پڑھنے کا موقع ملا ہے۔اس پر محترم امام بشیر احمد رفیق خان صاحب (سابق مشنری لندن)، محترم لئیق احمد طاہر صاحب (ریجنل مشنری بریڈ فورڈ)، محترم بھائی جان عبد الباسط صاحب شاہد اور محترمہ باجی امتہ الباری ناصر صاحبہ کے کئے گئے تبصرے ایسے ہیں جن کی ہاں میں ہاں مجھے بھی ملانا ہے۔ چونکہ انہوں نے جو غیر جانبدار تبصرے کئے ہیں اور داد تحسین دی ہے اس سے بڑھ کر اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ مَیں ان سب کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نہ صرف انہوں نے آپ سے اپنے تعلق کو نبھایا ہے بلکہ میری بہن کے کاموں میں اپنے شب و روز سے وقت نکالا اور نہ صرف اس کی نوک پلک درست کرنے میں ممد و معاون ہوئے بلکہ کتاب میں ذکر کیفیات کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے پیار کی کلیاں چنتے رہے۔آپ کے لئے انہوں نے جو اپنائیت دکھائی ہے میرا دل ہمیشہ انکے لئے محبت کے جذبات سے لبریز رہے گا۔اللہ تعالیٰ دونوں جہان کی

حسنات سے نوازتا رہے۔آمین۔

عزیزم عثمان نے کتاب کے مضمون کو جس انداز میں تصویر کشی میں باندھا ہے وہ کمال کیا ہے، باہر سے ہی اندر کا مضمون سمٹا ہوا دکھائی دیتا ہے اور جوں جوں اندر کے مضامین کھلتے چلے جاتے ہیں باہر کی تصویر بھی خوشبو بکھیرنے لگتی ہے۔ اللہ اسکے تخیلات کو جلا بخشے اور اس سے بڑھ کر جوہر ظاہر ہوں۔آمین۔

آپ نے اپنی نااہلیوں کا ذکر تو کیا ہے لیکن آپ کی قابلیت بھی قدم بہ قدم مضامین کے ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہے۔آپ نے وہ مضامین جو آپ کے لکھے ہوئے نہیں ان کا برملا اظہار کیا ہے، ان کا برمحل ذکر کر کے ساتھ ساتھ اپنے تبصروں سے جو حسن پیدا کیا ہے بہت بھلا دکھائی دیتا ہے۔ بھائی جان سامی کی تحریر کا جادو بھی سر چڑھ کر بولتا رہا۔ جہاں جہاں آپ نے اپنی تحریر لکھی ہے اس کا بانکپن بھی دل کھول کر تحسین کا متقاضی ہے۔تحریر کا زیروبم پڑھنے والے کو ان لہروں کی طرح اپنے ساتھ لئے چلتا ہے جیسے ایک کاغذ کی ناؤ پانی کے بہاؤ پر بے بس چلتی چلی جاتی ہے۔

جہاں تک امی، ابا جان اور باجی بشریٰ کا ذکر ہے میں نے آج تک انکے حالات لکھنے سے خود کو پرے رکھا ہوا تھا، چونکہ انکا ذکر طبیعت برداشت نہیں کرتی ، اگرچہ مجھے آپ کے چھیڑے ہوئے سازوں کو برداشت کرنا پڑا، یہ ایسے تار ہیں جن کے چھیڑنے سے بے بسی طبیعت پر قبضہ کر لیتی ہے جس سے آج تک اجتناب ہی کرتا رہا۔

بہرحال ناقابل برداشت ذکر اور بھرپور واقعات وحالات سے گزرنا پڑا، اس لئے ان یادوں سے چُور چُور ہوں اور جوں ہی کسی یاد کا جھونکا آتا ہے زخمی دل پر چرکے لگاتا گزرجاتا

ہے، ہاں اس حالت کواُن کے لئے دعاؤں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں تو پُرسکون وادیوں کا سفر شروع ہوجاتا ہے جہاں اس پونجی سے نکلی ہوئی خوشبوئیں دل ودماغ کو معطر کرنے لگتی ہیں۔بس یہ دکھ سکھ کے دھارے مجھے بہت عزیز ہیں، میں نے جن عزیزوں کے ذکر کوارادتاً چھوڑا ہوا تھا آپ نے گلے ملوادیا ہے۔جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

والسلام

آپ کا بھائی

محمد اسلم خالد

○○

محترم عبدالسلام جمیل صاحب کا 'میری پونجی' پر تبصرہ

درد سے ثَمرِ دُعا شُکر کے پہلو نکلے
ہجر کی وصل کی صد یادوں کے آہو نکلے
مَیں تو سمجھا کہ ہے درہم و دینار کی بات
تیری 'پونجی' سے تو آہیں کئی آنسو نکلے

OO

مکتوب محترم مبارک صدیقی صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمہ ومحترمہ صفیہ سامی صاحبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خاکسار آپ کو آپ کی اس کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔ جن روشن ستاروں کا آپ نے ذکر کیا ہے اُن کی زندگیاں واقعی مشعل راہ ہیں۔

خدا رحمت کنند ایں عاشقان پاک طینت را

آپ نے بھی اُن کی محبتوں دعاؤں اور اُن کے ایمان افروز واقعات کو محفوظ کر کے خوب حق ادا کیا ہے۔ کتاب کیا ملی ؎

خوب سجی یادوں کی محفل، مہمانوں نے تاپے ہاتھ
ہم نے اپنا کوئلہ کوئلہ دل دہکایا ساری رات

تقریباً دو نشستوں میں ساری کتاب پڑھ لی۔ اس کی ایک وجہ تو آپ کی تحریر میں سادگی، روانی اور سلاست ہے دوسرے اس کتاب میں درج اُن پیاروں کے واقعات ہیں جنہیں پڑھ کے حسرت ہوتی ہے کہ کاش ہم میں بھی یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں۔

محترم بشیر احمد سامی صاحب مرحوم کی باتیں پڑھتے ہوئے اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ عاجزانہ انداز اور مشفقانہ گفتگو خوب یاد آئی اور وہ پیارے خواب سے چہرے یاد کر کے آنکھیں اشکبار ہوئیں۔

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

پہلا مشاعرہ غالباً سن دو ہزار میں، جس میں خاکسار نے بطور شاعر شرکت کی تھی وہ محترم بشیر سامی صاحب نے ہی منعقد کروایا تھا اور اُس کی نظامت محترم ناظم غوری صاحب نے کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ محترم رشید حیدر آبادی صاحب کا فون آیا کہ محمود ہال میں مشاعرہ ہو رہا ہے آپ کی شرکت لازمی ہے۔ اُس دن میں نے اپنے آپ سے پوچھا، اچھا میں بھی شاعر ہوں؟

اس کتاب میں میری خصوصی دلچسپی کا باعث ایک تو یقیناً ایمان افروز واقعات ہیں دوسرے کچھ یوں بھی ہے کہ کتاب میں مذکور ناموں میں، گو ہر مقصود صاحب میرے عزیز ترین دوست، محلے دار اور کلاس فیلو ہیں۔ مصور خان صاحب یہاں لندن میں میرے محلے دار ہیں اور اُن کی اہلیہ، سارہ خان صاحبہ ہمارے حلقے کی تبلیغ میں سرگرم اور پرخلوص خواتین میں سے ایک ہیں۔ منیر سامی صاحب آف کینڈا ابھی میرے بہترین دوستوں میں سے ہیں اور اسلم خالد صاحب سے تو آتے جاتے ملاقات ہو جاتی ہے۔ سب اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خدمت دین میں، مصروف ہیں۔ سو ان سب کے بارہ میں پڑھ کے اور بھی اچھا لگا۔

کتاب لکھنے کا ارادہ بہت لوگ کرتے ہیں لیکن کتاب لکھنے والے تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ آپ نے اس ایمان افروز اثاثے کو قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا کے ایک قابل تعریف کام کیا ہے اور یہ بھی محض اللہ کا ہی فضل ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

15 دسمبر 2013ء مبارک صدیقی

OO

مکتوب محترم مولانا لئیق احمد طاہر صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزہ بہن محترمہ صفیہ سامی صاحبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

’’من کے موتی‘‘ پڑھنے میں تاخیر ہوگئی۔ بیچ میں جلسہ سالانہ 2018ء کی مصروفیات آ گئیں اور وقت گزرتا گیا۔

خیال تھا کہ جلدی جلدی جستہ جستہ مضمون دیکھ کر واپس کر دوں گا۔لیکن جب پڑھنا شروع کیا تو کوئی حصہ چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ کہہ سکتا ہوں کہ کم وبیش لفظ لفظ پڑھا ہے۔آپ کا ممنون ہوں کہ اتنی خوبصورت تحریرات پڑھنے کے لئے دیں۔سیر روحانی کی تقریر کی ریکارڈنگ۔ پشاور اور کراچی کے پرانے بزرگوں کا ذکر خیر۔مکرم سامی صاحب کے والد بزرگوار اور ڈاکٹر سلام صاحب کے گہرے مراسم اور دلچسپ یادیں۔آپ کے پہلے اعتکاف کی ایمان افروز روداد۔جلنگھم میں شادی کی تقریب جس میں آپ مفت میں چیف گیسٹ بنادی گئیں۔فیصل آباد سے جلسہ سالانہ ربوہ کا سفر جس میں ٹکٹ اور رقم تایا کے پاس رہ گئے تھے۔آپ کے بھانجے عبدالوحید کا سفرِ یورپ و پاکستان اور سفر بھائی پھیرو کی دلچسپ و بے تکلف کہانی، یہ سب پڑھ کر بہت مزہ آیا۔

دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔اور برادرم مکرم بشیر الدین سامی صاحب کیلئے آپ کے جذبات، آپ کی دعائیں، آپ کے دل سے اٹھتی ہوئی ہوک کو خدا تعالیٰ قدر اور محبت کی نظر سے دیکھے اور اس محرومی کا ایک ایک لمحہ دعا اور التجا بن کر آپ کا ہم سفر بن جائے۔آمین۔

والسلام

خاکسار

آپ کا بھائی

لئیق احمد طاہر۔(مشنری یوکے)

8 ستمبر 2018ء

○○

مکتوب محترم مولانا نسیم احمد باجوہ صاحب

بیت الفتوح/19-7-22

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمہ ومحترمہ صفیہ بشیر سامی صاحبہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وعافیت سے رکھے۔آمین۔

گزشتہ دنوں مکرم ومحترم امیر صاحب نے خاکسار کو آپ کی کتاب ''من کے موتی'' کا مسودہ نظر ثانی کیلئے بھیجا تھا۔جب خاکسار کتاب کے اختتام تک پہنچا تو درج ذیل الفاظ بے اختیار لکھنے کو دل چاہا جو خاکسار کے دل کی عکاسی کر رہے تھے:

''ماشاءاللہ! بہت خوب تحریر ہے۔ پڑھ کر بہت لطف آیا۔کبھی بے اختیار ہنسی آئی اور کبھی بے اختیار آنسو نکل گئے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بہت دلکش تحریر لکھنے کی توفیق دی ہے۔اللّٰھم زد فزد۔اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، نافع الناس بنائے اور اجر آخرت کا ذریعہ بنائے۔آمین۔''

والسلام

محتاج دعا

نسیم احمد باجوہ

○○

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

من کے موتی

مضامین صفیہ بشیر سامی

OO

مضامین
محترم بشیر الدین سامی صاحب مرحوم

پیغام حضرت خلیفۃ المسیح الثانی رضی اللہ عنہ

برموقع سالانہ اجتماع مجلس خدام الاحمدیہ کراچی

سالانہ اجتماع خدام الاحمدیہ کراچی 1956ء کے موقع پر مکرم چودھری عبدالمجید صاحب قائد مجلس خدام الاحمدیہ کراچی نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ؓ کا ایک دردانگیز پیغام پڑھ کر سنایا۔اس پیغام کا کچھ حصہ اور اس پر سامی صاحب کا تأثراتی مضمون درج ذیل ہے۔

حضرت مرزا محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانی ؓ کے پیغام کا ایک حصہ

پیغامی (خلیفہ کو-ناقل) ستر ابہتّر اقرار دے کر معزول کرنے کا فتویٰ دیتے تھے اور (وہ شخص جس نے کہا تھا کہ-ناقل) جس کے آگے اور دائیں بائیں لڑ کر مَیں نے اس کی خلافت کو مضبوط کیا اس سے تعلق رکھنے والے چند بے دین نوجوان جماعتوں میں آدمی بھجوا رہے ہیں کہ خلیفہ بڈھا ہو گیا ہے اسے معزول کر دینا چاہئے۔

اگر واقعی میں مَیں کام کے قابل نہیں ہوں تو آپ لوگ آسانی کے ساتھ ایک دوسرے

قابل آدمی کو خلیفہ مقرر کر سکتے ہیں اور اس سے تفسیر قرآن لکھوا سکتے ہیں۔ میری تفسیریں مجھے واپس کر دیجئے اور اپنے روپے لے لیجئے اور مولوی محمد علی صاحب کی تفسیر یا اور جس تفسیر کو آپ پسند کریں اسے پڑھا کریں اور جو نئی تفسیر میری چھپ رہی ہے اس کو بھی نہ چھوئیں۔ یہ اول درجے کی بے حیائی ہے کہ ایک شخص کی تفسیروں اور قرآن کو دنیا کے سامنے پیش کر کے تعریفیں اور شہرت حاصل کرنی اور اسی کو نکما اور ناکارہ قرار دینا۔ مجھے آج ہی اللہ تعالیٰ نے الہام سے سمجھایا کہ ''آؤ ہم مدینہ والا معاہدہ کریں۔''

یعنی جماعت سے پھر کہو کہ یا تم مجھے چھوڑ دو اور میری تصنیفات سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔ نہیں تو میرے ساتھ وفاداری کا ویسا معاہدہ کرو جیسا کہ مدینہ کے لوگوں نے مکہ کی عقبہ جگہ پر رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ کیا تھا اور پھر بدر کی جنگ میں کہا تھا یا رسول اللہ ﷺ! ہم آپ کے دائیں بھی لڑیں گے بائیں بھی لڑیں گے، آگے پیچھے بھی لڑیں گے اور دشمن اس وقت تک آپ تک نہیں پہنچ سکتا جب تک ہماری لاشوں کو روندتا ہوا آگے نہ آئے۔

سو گو میرا حافظ خدا ہے اور اس کے دیئے ہوئے علم سے آج بھی ساری دنیا پر غالب ہوں لیکن چونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنی جماعت کا امتحان لے اور اس سے کہہ دے کہ ''آؤ ہم مدینہ والا معاہدہ کریں۔''

سو تم میں سے جو شخص خدا تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھا کر معاہدہ کرتا ہے کہ وہ آخری سانس تک وفاداری دکھائے گا وہ آگے بڑھے وہ میرے ساتھ ہے اور میں اور میرا خدا اس کے ساتھ ہے۔ لیکن جو شخص دنیوی خیالات کی وجہ سے اور منافقوں کے پراپیگنڈا کی وجہ سے بزدلی دکھانا چاہتا ہے اس کو میرا آخری سلام۔ میں کمزور اور بوڑھا ہوں۔ لیکن میرا خدا کمزور اور بوڑھا نہیں وہ اپنی قہری تلوار سے ان لوگوں کو تباہ کر دے گا جو کہ اس منافقانہ پراپیگنڈا کا

شکار ہوں گے۔اس پراپیگنڈا کا کچھ ذکر الفضل میں چھاپ دیا گیا ہے۔ چاہئے کہ قائد خدام اس مضمون کو بھی پڑھ کر سنا دیں۔اللہ تعالیٰ جماعت کا حافظ و ناصر ہو۔ پہلے بھی اس کی مدد مجھے حاصل تھی اب بھی اس کی مدد مجھے حاصل رہے گی۔میں یہ پیغام صرف اس لئے آپ کو بھجوا رہا ہوں تا کہ آپ لوگ تباہی سے بچ جائیں ورنہ حقیقتاً میں آپ کی مدد کا محتاج نہیں۔ایک مرتد کے مقابلے میں خدا تعالیٰ ہزاروں آدمی مجھے دے گا اور مجھے توفیق بخشے گا کہ میرے ذریعہ سے پھر سے جماعت جواں سال ہو جائے۔آپ میں سے ہر مخلص کے لئے دعا اور کمزور کے لئے رخصتی سلام۔

خاکسار

مرزا محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی

24 جولائی 1956ء

جب مکرم قائد صاحب مجلس کراچی مندرجہ بالا پیغام پڑھ کر سنا رہے تھے تو حاضرین پر ایک رقت کا عالم طاری تھا آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

تقریر قائد صاحب مجلس کراچی

پیغام سنانے کے بعد مکرم چودھری عبدالمجید صاحب قائد مجلس خدام الاحمدیہ کراچی نے تقریر کی جس میں آپ نے بتایا کہ الٰہی جماعتوں میں منافقوں کا وجود نئی یا اچنبھے کی بات نہیں، پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بھی منافق ایسی کاروائیاں کیا کرتے تھے مگر انجام کار وہ ذلیل و رسوا ہوئے تھے۔اسی طرح اب بھی ہوں گے۔انشااللہ۔

مکرم قائد صاحب کی ہدایت کی روشنی میں ایک ماہ سے اس اجتماع کی تیاری اورنگرانی کے لئے ایک کمیٹی کام کر رہی تھی۔ اس اجتماع کے پروگرام کے افسر اعلیٰ مرزا عبد الرحیم صاحب اس پروگرام کی نگرانی فرماتے رہے، جبکہ مقام اجتماع کی تیاری ونگرانی کے فرائض مکرم چودھری افتخار احمد صاحب نائب قائد نے ادا کئے۔

اجتماع کی کمیٹی درج ذیل تھی:

❁ افسر سالانہ اجتماع	مکرم ملک مبارک احمد صاحب
❁ سیکرٹری سالانہ اجتماع	مکرم بشیر الدین احمد سامی صاحب
❁ افسر سالانہ اجتماع (پہرہ وحفاظت)	مکرم شیخ ممتاز رسول صاحب اور مکرم نیاز قطب بٹ صاحب
❁ ناظم آب رسانی	مکرم صدر الدین کھوکھر صاحب
❁ ناظم روشنی وصفائی	مکرم ملک سارنگ خان صاحب
❁ ناظم نشر واشاعت ومذہبی امور	مکرم مرزا محمد لطیف صاحب شاہد مربی سلسلہ کراچی
❁ ناظم ضیافت	مکرم صوفی مبارک احمد صاحب
❁ ناظم لنگر خانہ	مکرم مولوی عبد المجید صاحب
❁ ناظم حفاظت	مکرم سید نذیر احمد شاہ صاحب
❁ منتظم دینی وعلمی مقابلہ جات	مکرم مولانا عبد المالک خان صاحب مربی سلسلہ کراچی
❁ ناظم ورزشی مقابلہ جات	مکرم چودھری افتخار احمد صاحب نائب قائد

تاثراتی مضمون۔''پھول اور کانٹے''

''بھیگی ہوئی سیاہ رات تھوڑے تھوڑے وقفے پر اپنے شبنمی آنسو گراتی ہوئی گزر رہی تھی... یہاں تک کہ پَو پھٹ گئی۔

آسمان پر رنگ برنگ کے بادل دنیا والوں کو لطف اور مستی کی صلائے عام دے رہے تھے... کبھی کبھی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگتی۔ عجیب پُر کیف سماں تھا... جی بے اختیار کرتا کہ ایسی سہانی صبحیں ہمیشہ قائم رہیں... اور قدرت کے عطا کردہ دلفریب مناظر سے پورے طور پر لطف اندوز ہوا کریں... بارش کبھی تیز ہو جاتی۔ کبھی ٹپ ٹپ کا سماں بندھ جاتا... یہ سلسلہ بدستور جاری تھا... اور نوجوانوں کے عزم میں مخل ہونے کی ناکام کوشش میں مصروف لیکن غیر مستقل مزاجی سے برسنے والی بارش بھلا اٹل ارادوں کے سامنے کیا حقیقت رکھتی تھی... وہ اپنے عزم اور جذبے میں سرشار رواں دواں تھے... روحانی، علمی، ذہنی اور جسمانی قویٰ کو صیقل کرنے اور دین کی خدمت کے لئے تقویٰ اور سعی سے کام لینے کی تربیت کے لئے کمر بستہ۔

پُر رونق بازار سنسان پڑے تھے۔ البتہ کبھی کبھی کوئی تیز رفتار گاڑی کیچڑ اچھالتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ بارش کو رہ رہ کر برسنے کا خیال آتا تھا... ہوٹل لوگوں سے بھرپور تھے۔ گراموفون چیخ رہا تھا اور چائے کی پیالیوں کی کھنک ایک مترنم سا نغمہ پیدا کر رہی تھی... کتنے دماغ تھے، عقلیں اور ذہن تھے جو رنگ رلیوں اور سکرین کی ضرر رساں چائے کی بھینٹ چڑھ رہے تھے... سگریٹ کا دھواں چاروں سمت پھیل رہا تھا یوں جیسے کسی پہاڑی مقام پر ٹھٹھرے ہوئے بادل سر چھپانے کو کمروں میں آ گھسے ہوں... ایک ناخوشگوار سی بو تھی کہ جو پھیلتی جا رہی تھی۔

سینما ہال کے باہر اس بارش میں بھی تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ نہ جانے اس ہال کے اندر اخلاق و کردار کا جنازہ کس دھوم دھڑکے سے نکلنے والا تھا...اور یہ 'قند' کتنوں کے لئے زہر ہلاہل بننے والی تھی...غرضیکہ کونسی سمت تھی جہاں 'کانٹے' دامنگیر نہ تھے۔آہ!...زندگی۔ انسانیت آج کتنے گھٹن اور پُرخطر راستوں پر گامزن تھی...ہر راہ اور ہر موڑ پر خونخوار درندے منہ پھاڑے حریص نگاہیں بچھائے ہوئے تھے۔

ان ہنگاموں سے دور...ان رنگینیوں سے نا آشنا...ان ہی پُر پیچ و پُرخطر رستوں سے گزرتا ہوا کارواں ایک چٹیل میدان میں جہاں کہیں کہیں گھاس بھی اُگ آئی تھی ،ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔کتنی خاموش اور حُسنِ حقیقی سے معمور فضا تھی کہ رنگ برنگ کے بادل بھی اس پُرکیف اور نئے ماحول کا مطالعہ کرنے کے لئے اپنی رنگ رلیاں بھول گئے تھے...اُن کی اٹھکیلیاں ماند پڑ گئی تھیں۔

فضا میں پاکستان اور خدام الاحمدیہ کے پرچم لہرا رہے تھے اور اس ابر آلود موسم میں جبکہ ہوا بھی نغمہ ریز تھی۔یہ دونوں پرچم لہراتے ہوئے عجیب بہار دے رہے تھے...اس خاموش فضا میں ایک مترنم آواز گونجنے لگی:

دے ہم کو یہ توفیق کہ ہم جان لڑا کر
اسلام کے سر پر سے کریں دُور بلائیں
ربوہ کو تیرا مرکز توحید بنا کر
اِک نعرۂ تکبیر فلک بوس لگائیں
پھر ناف میں دنیا کی تیرا گاڑ دیں نیزہ
پھر پرچم اسلام کو عالم میں اُڑائیں

اس مقصد کا نعرہ جب اُس فضا میں گونجا تو سیاہ وسفید بدلیاں اس زور سے ٹکرائیں کہ ایک گونج پیدا ہوئی، ایک روشنی نمودار ہوئی اور اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ انسان گوشت پوست کے ویسے ہی نوجوان تھے... جیسے ابھی شہر کے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں لطف اندوزیوں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ آخر ان میں کیا جذبہ کارفرما ہے کہ وہ دیوانوں کی طرح بھری برسات میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ شہر کی رنگینیاں کیا ان کو نہ بھائیں؟ آخر یہ بھی تو اُنہیں جیسے جسم وجان کے انسان ہیں... لیکن یہ بھولی بھالی بدلیاں کس سوچ میں پڑ گئیں کہ یکا یک سکوت ایک نغمے میں بدل گیا۔

ہمارے حالِ خراب پر گو ہنسی اُنھیں آج آ رہی ہے
مگر کسی دن تمام دنیا کو ساتھ اپنے رُلائیں گے ہم
خدا نے ہے خضرِ راہ بنایا ہمیں طریق محمدیؐ کا
جو بھولے بھٹکے ہوئے ہیں ان کو صنم سے لا کر ملائیں گے ہم
مٹا کے کفر و ضلال و بدعت کریں گے آثار دیں کو تازہ
خدا نے چاہا تو کوئی دن میں ظفر کے پرچم اُڑائیں گے ہم

اس خوش الحان کا فضا میں گونجنا تھا کہ بدلیاں پھر لہرانے لگیں اور ٹپ ٹپ شفاف موتی گرنے شروع ہو گئے۔

رات ظلمتوں کی دھار پر بہے چلی جا رہی تھی... گرینڈ ہوٹل جو اس ماحول سے متصل تھا خوشی ومسرت کا گہوارہ بن رہا تھا... اس کے ہال بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ جام ومینا گردش میں تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کی تمام رنگینیاں سمٹ سمٹا کر آج کی شب کے لئے اسی ہوٹل کی مہمان ہیں... رات گزرتی جا رہی تھی... خمار بڑھتا جا رہا تھا... اور آہستہ آہستہ بجلی کے

قمقمے خاموش اور مدھم سی روشنی میں منتقل ہونے لگے اور مصنوعی جنت کا کاروبار ختم ہوا۔

نصف شب سے اُوپر کا وقت تھا۔ سبزے کے مخملی فرش پر پڑے ہوئے نوجوان یکے بعد دیگرے بیدار ہونے لگے... خدا تعالیٰ کا دربار سجنے لگا... چاروں سمت سے خدائی دربار کے نقارے بجنے لگے... فرشتوں کا نزول شروع ہوا... خدا تعالیٰ عرش سے اُترا اور ان بندوں کی باتیں سننے کے لئے نچلے آسمان پر آ گیا... سجدہ ریزیاں شروع ہوئیں... عشق الٰہی میں ہر کوئی سرشار نظر آنے لگا... اور فضا دعاؤں سے معمور ہو گئی۔

سورج کوئی نیزہ بھر اُبھر چکا تھا لیکن بدلیوں کی وجہ سے اس کی چمک کچھ ماندسی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا فضا میں پھریروں کو جھولا جھولا رہی تھی... اور۔

خاموشی سی طاری تھی مجلس کی فضاؤں پر

آنکھوں سے اشک رواں تھے رقت کا سماں بندھ چکا تھا... ہچکیوں کی دلخراش آوازیں اُٹھ رہی تھیں... کان قائد کی آواز پر لگے ہوئے تھے... اور وہ الفاظ دل کو بے قابو کر رہے تھے:

''آؤ ہم مدینہ والا معاہدہ کریں سو تم میں سے جو شخص خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر قسم کھا کر معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اپنے آخری سانس تک وفاداری دکھائے گا وہ آگے بڑھے وہ میرے ساتھ ہے اور میں اور میرا خدا اس کے ساتھ ہے۔''

(الفضل 4 اگست 1956ء اقتباس از پیغام حضرت اقدس خلیفۃ المسیح الثانیؓ مورخہ 24 جولائی 1956ء)

سیدنا حضرت اقدس المصلح موعودؓ کے پیغام کے یہ الفاظ کان میں پڑنے تھے کہ سب نے کھڑے ہو کر یہ عہد کیا کہ:

''ہم تمام زندگی خلافت کے ساتھ وابستگی رکھیں گے۔''

...فضا فضل عمر زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی...شہر کے ہنگامے بدستور جاری تھے۔ دن ڈھل چکا تھا۔شب کی سیاہ چادر اپنا دامن وسیع کر رہی تھی۔ظلمتیں ہر لحاظ سے بڑھ رہی تھیں ہر شخص اپنے خیال مین مگن رواں دواں تھا کہ دور سے وہی قافلہ شہر میں ان عزائم کے ساتھ داخل ہو رہا تھا کہ:

''ہم نے زمانہ کی اس گندی رو کو بہر حال بدلنا ہے ہم نے نوجوانوں میں قومی روح اور ایثار کا جذبہ پیدا کرنا ہے ہم نے اسلامی اخلاق کو قائم کرنا اور خدمت خلق کا عملی جذبہ پیدا کرنا ہے۔''

(ماہنامہ خالد،ستمبر،اکتوبر 1957ء)

○○

حضرت اقدس المصلح الموعودؓ کے پہلے مصدق

ایک تاریخی یادداشت

پیشگوئی بابت مصلح موعودؓ جو اشتہار تکمیل تبلیغ مورخہ 12/جنوری 1889ء میں شائع ہوئی۔اس کے حاشیہ میں بھی اور بعض دوسرے مقامات پر بھی حضرت مسیح موعودؑ نے حضرت مصلح موعودؓ کے متعلق اشارات فرمائے مثلاً:

''محمود جو میرا بیٹا ہے۔اس کے پیدا ہونے کے بارے میں اشتہار دہم جولائی ۱۸۸۸ء اور نیز اشتہار یکم دسمبر ۱۸۸۸ء میں جو سبز اشتہار کے کاغذ پر چھاپا گیا تھا، پیشگوئی کی گئی اور سبز رنگ کے اشتہار میں بھی لکھا گیا کہ اس پیدا ہونے والے لڑکے کا نام محمود رکھا جائے گا...پھر جب کہ اس پیشگوئی کی شہرت بذریعہ اشتہارات کامل درجہ پر پہنچ بھی چکی...تب خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم سے ۱۲/ جنوری ۱۸۸۹ء کو بمطابق ۹/ جمادی الاول ۱۳۰۶ھ میں بروز شنبہ محمود پیدا ہوا۔''

(تریاق القلوب،روحانی خزائن جلد 15 صفحہ 219)

حضرت مسیح موعودؑ کی وفات کے بعد بھی صحابہ حضرت اقدسؑ جو بکثرت قادیان میں رونق افروز تھے، حضرت اقدسؑ کے ان اشارات کی روشنی میں پیشگوئی کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ جو حضرت مسیح موعودؑ کے ہی تخم سے اور ذریت و نسل سے تھے اور دیگر اوصاف اور کمالات سے بھی متصف تھے۔ وہ اس کی تصدیق کے خواہاں اور وقت کے منتظر رہے۔ چنانچہ ۲۸ رجنوری ۱۹۴۴ء کا دن بھی آ گیا جو کہ جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ مسجد اقصٰی قادیان نمازیوں سے حسب معمول بھری ہوئی تھی۔ خلیفۃ المسیح کا منبر جو مسجد اقصٰی کے درمیانی حصہ میں باہر کے رُخ پر ہوا کرتا تھا جس سے صحن میں بیٹھے ہوئے نمازی بخوبی حضورؓ کو دیکھ سکتے تھے۔ اس تاریخی خطبہ جمعہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے خدا تعالیٰ سے علم پا کر اپنی رؤیا کے بیان کے بعد بالصراحت یہ اعلان فرمایا کہ:

''خدا تعالیٰ نے اپنی مشیت کے ماتحت آخر اس کو ظاہر کر دیا اور مجھے اپنی طرف سے علم بھی دے دیا کہ مصلح موعود سے تعلق رکھنے والی پیشگوئیاں میرے متعلق ہیں۔''

(الفضل یکم فروری 1944ء)

تو عاجز مسجد اقصٰی کے اس اندرونی حصہ میں بیٹھا ہوا تھا جو حصہ مسجد مبارک سے ملحق ہے۔ قریب ہی حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ تشریف فرما تھے۔ اس جگہ بیٹھے ہوئے حضور انورؓ کے منبر کا نظارہ پورے طور پر نہیں کیا جا سکتا تھا مگر جونہی حضورؓ نے اعلان فرمایا تو حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ یکدم کھڑے ہوئے، کچھ فرمایا اور ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ عاجز اس وقت ۱۲، ۱۳ سال کی عمر میں تھا۔ ایسی بزرگ شخصیت کا خطبہ کے دوران کھڑا ہونا کچھ عجیب سا لگا اور پھر جبکہ یہ بھی نہ پتہ چل سکا کہ انہوں نے کھڑے ہو کر کیا فرمایا تھا۔ اس بات کا علم بعد میں

تاریخ احمدیت کے حوالے سے ہوا کہ حضرت مفتی صاحبؓ نے کھڑے ہوکر حضرت مصلح موعودؓ کی تصدیق میں ''آمنا و صدقنا'' فرمایا تھا۔اس طرح وہ پہلے مصدق ٹھہرے۔

اللہ..اللہ، ایسی سبک روی، ایسی حاضر دماغی عارفین باللہ کا ہی شیوہ ہے۔کاش ہم بھی اپنے وقت میں نیکیوں میں سبقت کی اس روح کو اپنا سکیں۔

(ماہنامہ اخبار احمدیہ برطانیہ-مارچ،اپریل 1998ء)

○○

''خطوط کے رشتے''

آپ کا خط ملا!

'خطوط کے رشتے' یہ تحریر پہلے الفضل ربوہ میں چھپی، اس کے بعد یہ اخبار احمدیہ میں بھی شائع ہوئی لیکن میرے پاس اس کا حوالہ نہیں کہ کب چھپی۔ ہاں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں جس دور میں یہ خطوط کے رشتے لکھا گیا تھا اس وقت موبائل فون کا بھی زمانہ نہیں تھا، سوچتی ہوں اگر آج سامی صاحب حیات ہوتے تو یہ جدید Technology ان کیلئے حیران کُن ہوتی اور اگر مجھے دیکھ لیتے کے میں Computer پر کمپوز کر رہی ہوں اور بچوں نے جدید قسم کا آلہ بھی میرے ہاتھ میں دے رکھا اور مجھے اس کا استعمال بھی سکھا دیا ہے اور اس سے آمنے سامنے بات بھی ہو جاتی ہے، ایک سیکنڈ میں دنیا کے کناروں تک بات سنی اور سنائی اور دکھائی جا سکتی ہے، اور وہ بھی مفت میں، تو یہ سب یقیناً اُن کے لئے بہت حیرانی کی بات ہوتی کیونکہ وہ تو درویش انسان اور قلم کا پجاری تھا۔ ان کا اُٹھنا بیٹھنا اوڑھنا بچھونا، پین اور پیپر تھا اور یہ ہر وقت ان کے پاس ہوتا جس سے ان کو تسکین ملتی تھی، اور اپنے احساس اور جذبات کا اظہار کر سکتے تھے۔ (صفیہ بشیر سامی)

یہ رشتے بھی بہت پیارے رشتے ہیں مگر ان رشتوں کو نبھانے والے اب خواب ہوتے جا رہے ہیں۔ جو ان رشتوں سے منسلک تھے وہ بھی جب ان رشتوں کو کاٹنے لگیں تو لکھنے والے بھی ''قلم برداشتہ'' ہو جاتے ہیں۔ دوش دیتے ہیں تو زمانے کی جدید سہولتوں کو جن کے ذریعہ اب وہ نصف ملاقاتیں بھی آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہوئی جاتی ہیں۔ ٹیلیفون پر بات کر لی، خیریت معلوم ہوگئی۔ منہ در منہ بات ہوگئی۔

گاہے بگاہے یوں فرض پورا کرلیا۔لیکن اس آلہ کے استعمال کی چند ساعتوں میں جو رقم کے حساب سے بھی بہت مہنگی پڑتی ہیں، اس خوف اور خدشہ سے دل کی بات دل میں ہی رہ جاتی ہے۔ جذبات کو پورے طور پر پیش بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چند ساعتوں میں چند ضروری الجھنوں یا کاموں کا ذکر کر کے رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود بھی سمجھ لیا جاتا ہے کہ چلو ان سے بات ہوئی، ان کی آواز تو سن لی۔ یہ کیا کم ہے؟ مگر میں سوچتا ہوں کہ... اس کمی کو تو پورا کرنا ان جدید آلات کے بس میں نہیں۔ وہ کمی جن کو کبھی سر کنڈے کے قلم یا پروں کی نوک سے بھرا جاتا تھا اور کس قدر انتظار ہوا کرتی تھی۔ اس انتظار میں کس قدر مزہ اور لطف ہوتا تھا۔ جو پیاروں کے خط سے ملتا تھا۔لیکن اب ٹیلیفون پر تکلفاتی زبان کہاں وہ رس گھول سکتی ہے جو قرطاس پر سیاہی گھول دیا کرتی تھی۔ ایک ایک حرف میں محبت اور خلوص کی لپٹیں نکلتی دکھائی دیا کرتی تھیں۔ ٹیلیفون پر بات کر کے آج ان نصف ملاقاتوں کا لطف کہاں حاصل ہوتا ہے۔ وہ کہلاتی تو نصف ملاقات ہی تھی لیکن وہ ایک ایسی مستقل اور پائیدار ملاقات کو جنم دے جاتی تھی جس کو انسان زندگی بھر اپنا اثاثہ بنائے رکھتا تھا۔

محبوب کا لکھا ہوا ہر حرف اس کے محفوظ خزانے کو بھر دیا کرتا تھا۔ وہی محفوظ خزانہ جس کے بارے میں کسی شاعر نے کہا تھا:

چند تصویرِ بُتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

سوچتا ہوں آج گھروں کے وہ ساماں کہاں گم ہو گئے جن میں خلوص تھا، محبت تھی، پیار تھا، دوستی تھی، وہ خزانے کدھر گئے؟ میں اس چور کو پکڑنا چاہتا ہوں... لیکن ڈرتا ہوں... کہ چور تو میں خود ہوں۔

OO

نقوش

سامی صاحب اخبار احمدیہ کے مدیر تھے۔ایک نیا کالم شروع کرنے پر وہ دوسروں کو اس میں لکھنے پر آمادہ کرتے ہیں۔آغاز خود کرتے ہیں۔ بڑی دلچسپ تحریر ہے۔

(صفیہ سامی)

آپ کی زندگی میں ضرور کوئی دلچسپ اور ایمان افروز واقعہ گزرا ہوگا۔ اگر آپ ہمیں لکھیں گےتو ہم انشاءاللہ شکریہ کے ساتھ اس کالم میں اسے جگہ دیں گے۔

آپ سوچیں گے کہ کیا لکھیں اور کہاں سے شروع کریں۔ چلئے آج میں ہی شروع کر دیتا ہوں۔

میرا بچپن قادیان میں گزرا۔ قادیان میں ساون کی جھڑیاں خوب لگا کرتی تھیں۔ ان گلیوں میں اچھل کود کرنے والے آج کے بچوں سے ہی پوچھ سکتا ہوں۔ کیا اب ویسے ہی وہاں برساتیں ہوتی ہیں؟ کیا اب بھی ویسے ہی جل تھل ہوتا ہے؟ کیا ہر راہ آج بھی ویسے ہی دریا بنتی ہے؟ ضرور ایسے ہی ہوتا ہوگا۔ مجھے یاد ہے کم سنی کی یہ بات ہے۔ ایسی ہی کیفیت میں ایک موقع پر میں ریتی چھلہ کی طرف جا رہا تھا کہ میرے جی میں خیال اُبھرا کہ بازار جا رہا ہوں۔

رستہ میں اگر ایک روپیہ گر امل جائے تو مزا ہی آ جائے۔ اس خیال کے آتے ہی تھوڑی دور ہی چلا تھا۔ کہ ایک دھوتی پوش میرے سامنے سے گزرا اور مجھ سے آگے نکل گیا۔ میرے جی میں پھر آیا کہ اگر اس کی دھوتی میں سے ایک روپیہ گر جائے تو پھر کیا؟

قارئین، آپ حیران ہونگے۔ ادھر یہ خیال آیا ادھر سامنے چلتے ہوئے آدمی نے اپنی دھوتی پر کسی وجہ سے ہاتھ مارا اور ایک روپیہ کیچڑ میں گر گیا۔ میں نے دو قدم تیز لئے اور وہ روپیہ اٹھالیا۔ اب میں اس روپیہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ روپیہ میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ مجھے ملا تھا، وہ میرا تھا۔ مگر سوچا جس آدمی کا یہ روپیہ ہے وہ تو ابھی بھی میرے سامنے جار ہا ہے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ بھاگ کر اس آدمی کو جالیا۔ اس آدمی نے مڑ کر بڑی ترش نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا:

''بابا..! یہ تمہارا روپیہ گر گیا تھا۔''

بابا نے وہ روپیہ بغیر کسی شکریہ کے ادا کئے مجھ سے لے لیا کیونکہ جب اس نے اپنی 'ڈب' کو ہاتھ لگایا تو واقعی وہ وہاں نہ تھا۔ یہ واقعہ جب مجھے یاد آتا ہے تو سوچتا ہوں روپیہ تو اسی کا تھا، اسی کو مل گیا۔ کاش اس بابا کو شکریہ کہنے کی توفیق بھی مل جاتی۔

○○

محترم مرزا عبدالرحیم صاحب ۔ایک تاریخ ساز خادم اور جماعت احمدیہ کراچی کی تاریخ کے ادوار

جماعت احمدیہ کراچی کی تاریخ کے حوالہ سے سال 1918ء کا دور ایسا دور تھا جبکہ کراچی میں احمدیوں کی قابل ذکر آبادی نہیں تھی ۔ کیماڑی بندر گاہ کے قریب کا علاقہ تھا اور اس خصوصیت کی وجہ سے یہ علاقہ محنت و مزدوری اور روزگار کے مواقع پیدا کرتا تھا۔اس علاقہ میں ان دنوں صرف ایک ہی احمدی تھے جن کا نام بابو فرزند علی تھا۔ وہ اپنے نام کے ساتھ احمدی لکھتے تھے۔ان کا اپنا کہنا تھا کہ وہ اکثر دعائیں کیا کرتے تھے کہ خدا تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور احمدی ساتھی بنا دے۔ چناچہ 1918ء میں ہی اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس علاقہ میں 17 احمدی جمع ہو گئے۔(بحوالہ الفضل یکم اگست 1918ء)اور یکم اگست 1918ء با قاعدہ جماعتی تنظیم قائم ہوگئی۔

اس طرح کراچی کا بحیثیت جماعتی مرکز سلسلہ قادیان سے رابطہ ہو گیا۔ اسی سال ہندوستان کی ریاست جیند سے مرزا عبدالحکیم بیگ صاحب بھی کراچی تشریف لائے اور پھر وہیں کے ہی ہو رہے۔اسی اثناء میں اِن کی بابو اللہ داد صاحب سے جان پہچان ہوگئی جو علمی

ذوق رکھتے تھے۔ مرزا عبدالحکیم بیگ صاحب اپنی ذات میں سادہ مزاج، کم گو، تقویٰ شعار اور مرنجاں مرنج شخصیت تھے۔ سفید پوشی میں گزر بسر تھی۔ بابو اللہ داد صاحب سے جونہی ان کی دوستی کا تعلق آگے بڑھا انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کی ایک کتاب مطالعہ کے لئے پیش کر دی۔ بابو اللہ داد صاحب اس قدر متاثر ہوئے۔ کہ بہت جلد وہ احمدیت کی آغوش میں آ گئے۔ رفتہ رفتہ یہی دوستی خاندانی تعلقات پر منتج ہوئی۔

مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب ان کے بڑے بیٹے تھے ۔ ہائی سکول کی تعلیم مکمل کرنے کے ساتھ ہی معاش کی دنیا میں نکل آئے۔ اپنے کنبے کی ذمہ داریوں میں اپنے والد کے ممدّ ومعاون ہو گئے۔ اسی تگ و دو کے ساتھ ساتھ بابو اللہ داد صاحب سے ان کے خاندانی تعلقات بیگ صاحب کے لئے انہیں قریب سے دیکھنے کا بہانہ بھی بن رہے تھے۔ اوران کی نہاں صلاحیتوں کو چابک لگا رہے تھے۔ جس نے ان کے علمی ذوق، خدمت خلق اور دعوت الی اللہ کے جذبہ میں ایک ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ بابو اللہ داد صاحب کراچی میں پوسٹ ماسٹر جنرل تھے اسی عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔ وہ ایک محقق اور سکالر تھے۔ دعوت الی اللہ کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ آگے چل کر وہ جماعت کراچی کے جنرل سیکرٹری بھی ہوئے۔

کراچی میں صدارت کا قیام

تاریخی اعتبار سے کراچی کی جماعت کے لئے سال 1928ء ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ کراچی کی جماعت نے باقاعدہ انجمن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جس کی تشکیل میں مکرم شیخ نیاز محمد صاحب انسپکٹر پولیس پریذیڈینٹ ،مکرم محمد عبدالرحمن صاحب کلرک کسٹم ہاؤس (جنرل سیکرٹری)۔ مکرم شیخ رفیع الدین احمد صاحب انسپکٹر پولیس (محاسب) ۔مکرم

چودھری محمد شریف صاحب سب انسپکٹر پولیس (آڈیٹر و امور عامہ) اور مکرم چودھری علی احمد صاحب ہیڈ کانسٹیبل (سیکرٹری دعوت الی اللہ)، شامل تھے۔

(بحوالہ احمدیہ گزٹ قادیان 11 / اگست 1926ء)

اسی سال سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے قادیان سے ایک وفد، جس میں بزرگ صحابہ حضرت مسیح موعودؑ شامل تھے، کراچی کی جماعت میں بھجوایا۔ اس وفد نے کراچی کی جماعت کو تربیتی اور دعوت الی اللہ کے لحاظ سے متحرک کر دیا۔ اس وفد میں حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکیؓ، حضرت مولوی ابراہیم صاحب بقاپوری، مکرم حافظ جمال احمد صاحب فاضل اور مکرم مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری شامل تھے۔ چنانچہ 30 ستمبر 1926ء کو تھیوسا فیکل ہال میں مکرم مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری نے 'زندہ اور عالمگیر مذہب' کے عنوان سے نہایت دلچسپ اور مؤثر تقریر فرمائی۔

رنچھوڑ مارکیٹ کے نزدیک ایک چوک میں حضرت مولانا ابراہیم صاحب بقاپوری اور مکرم حافظ جمال احمد صاحب فاضل نے محاسن اسلام کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

2 / اکتوبر 1926ء کو گاڑی کھاتہ میدان (رام سوامی) میں مکرم مولانا ابوالعطاء صاحب فاضل جالندھری نے 'کیا اسلام بزور شمشیر پھیلا؟' کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

3 اکتوبر 1926ء اکتوبر کو خالقدینا ہال میں حضرت مولوی ابراہیم صاحب بقاپوری اور مکرم حافظ جمال احمد صاحب فاضل نے ختم نبوت کے موضوع پر پُر اثر تقاریر فرمائیں۔ اسی شام کو مکرم مولانا ابوالعطاء صاحب جالندھری نے صداقت حضرت مسیح موعودؑ پر تقریر فرمائی۔ ایک اہل حدیث مولوی محمد عثمان صاحب دہلوی جو جلسہ میں موجود تھے، ان کے اعتراضات کے جوابات نہایت عالمانہ قابلیت کے ساتھ دئے۔ یہ سلسلہ اگرچہ نصف گھنٹہ کے لئے مقرر تھا

لیکن سامعین کی دلچسپی کی وجہ سے رات کے بارہ بجے تک جاری رہا۔

(الفضل 19/اکتوبر 1926ء)

حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکیؓ نے جہاں جماعت کے دوستوں سے مل کر اور اپنی دعاؤں کے اثر سے روحانی تغیر پیدا فرمایا۔ وہاں دعوت الی اللہ کے کام میں بھی جان ڈال دی۔ مکرم شیخ امتیاز علی احمدی تھانیدار ڈرگ روڈ اسٹیشن پر تشریف لائے تو غیر از جماعت شرفاء سمیت بہت سے دوستوں نے پر جوش استقبال کیا اور پھولوں کے ہار پہنائے۔ پھر ڈرگ روڈ کی ایک غیر از جماعت لوگوں کی جامع مسجد میں ان کا لیکچر کروایا۔ حضرت راجیکی صاحبؓ کے تربیتی اور دعوت الی اللہ کے دورے اس قدر پُر اثر ثابت ہوئے کہ جماعت احمدیہ کراچی نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں درخواست کی کہ حضرت راجیکی صاحبؓ کا قیام ایک ماہ سے بڑھا کر چار ماہ کر دیا جائے۔ چنانچہ حضورؓ نے اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔ اس طرح حضرت راجیکی صاحبؓ کی بابرکت موجودگی سے سلسلہ کا وقار عام لوگوں کے دلوں پر منقوش ہوا۔ اس دوران دس سعید روحیں سلسلہ عالیہ احمدیہ میں داخل ہوئیں۔ جماعت احمدیہ کراچی نے اس موقع پر حضور انور کی خدمت میں شکریہ کا اظہار باقاعدہ ایک قرارداد کی صورت میں کیا کہ حضورؓ نے ازراہِ شفقت حضرت راجیکی صاحبؓ کو مزید یہاں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(بحوالہ اخبار الفضل 10/اگست 1926ء)

غرضیکہ ان بزرگوں کے فیوض کا اثر واضح طور پر دوسری دہائی میں کراچی شہر میں نظر آ رہا تھا۔ جس کی ایک صورت یہ تھی کہ 1926ء میں رنچھوڑ لائین کراچی شہر میں بھی ایک چھوٹی سی جماعت قائم ہو گئی اور انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کراچی جیسی مشہور بندرگاہ اور بڑے

شہر کی مناسبت سے اچھے پیمانے پر ایک لائبریری قائم کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے محدود وسائل کے باوجود ایک لائبریری قائم کرلی جو رنچھوڑ لائین طیب جی محمد ملا بھائی بلڈنگ میں تھی۔

(بحوالہ الفضل 11/جنوری 1927ء)

سولجر بازار میں جماعت کا قیام

پھر اسی طرح 1928ء میں سولجر بازار میں بھی جماعت کا قیام عمل میں آ گیا۔ جس کے پریذیڈنٹ مکرم عبدالرزاق خان صاحب (ریلوے گارڈ) مقرر ہوئے۔ مکرم عبدالغفور خان صاحب (میونسپل ٹیچر) جنرل سیکرٹری ۔مکرم رفیع الزمان خان صاحب (کلرک کسٹم) سیکرٹری۔ مکرم فضل الٰہی صاحب دوکاندار۔ سیکرٹری تعلیم و تربیت، امام الصلوٰۃ اور ڈاکٹر محمد بخش صاحب محاسب۔

(بحوالہ احمدیہ گزٹ قادیان 11/اگست 1928ء)

مکرم بابو اللہ داد صاحب جنرل سیکرٹری کی رپورٹ کے مطابق حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ نے 1929ء میں تھیوسافیکل ہال میں ایک کامیاب لیکچر دیا۔

(بحوالہ الفضل 22/ستمبر 1929ء)

حضرت مفتی صاحبؓ 1911ء میں بھی کسی کام کی غرض سے کراچی آئے تھے اور 23 روز تک قیام فرمایا۔ اس کا ذکر 5/اکتوبر 1911ء کے اخبار بدر میں ملتا ہے جس کی زیادہ تفصیل درج نہیں۔

جماعت احمدیہ کراچی کے اس تاریخی پس منظر کے بیان کا مقصد یہ تھا۔ کہ اندازہ ہو سکے

کہ اس وقت کی احمدی نسلیں کیسے کیسے مستجاب الدعوات بزرگوں سے شعوری اور غیر شعوری طور پر فیض پا رہی تھیں۔ مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب اسی ماحول میں پنپنے والی نسل کے نمائندہ تھے۔ خلافت اور سلسلہ کے ساتھ گہری وابستگی اور محبت رکھنے والے نوجوان، تاریخ اسلام کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کر رکھا تھا۔

حضرت رسول کریم ﷺ کی سیرت کے ہر پہلو پر مؤثر تقریر کا ملکہ تھا۔ نوجوانوں کے مسائل کو تاریخ اسلام کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کا سلیقہ رکھتے تھے اور یہی ان کی تقریر، تحریر اور گفتگو کا انداز تھا۔ یہی وہ ان کی مدبرانہ خصوصیات تھیں جنہوں نے ان کے لئے ہر کس و ناکس کے دل میں جگہ بنا رکھی تھی اور وہ عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔

تربیت و اصلاح کے میدان میں بھی بیگ صاحب کے طریق نرالے تھے۔ وہ قابل اصلاح نوجوانوں کے دل کی سختیوں پر ضرب لگانے کے عادی نہ تھے، بلکہ اپنے دھیمے پن، شفقت اور پیار سے ایسی نرمی کی فضاء پیدا کر دیتے کہ وہ انسان ٹوٹنے سے بچ جاتا۔

کراچی کے مخلصین

پاکستان بنا تو بیگ صاحب اپنی عنفوان شباب میں تھے۔ ان کا شہر کراچی ایک عظیم مملکت کا صدر مقام بن چکا تھا۔ اس شہر قائد نے اپنی مادرانہ شفقت سے لاکھوں لاکھ انسانوں کو اپنی آغوش میں سمو لیا تھا۔ اسی رو میں جماعت کے دوستوں کا بھی ایک گروہ کثیر کراچی کا حصہ بن چکا تھا۔ جس سے کراچی میں مخلصین کی ایک بھیڑ لگ گئی تھی۔ وہ مخلصین جنہوں نے کراچی کی جماعت کو اس وقت انتظامی لحاظ سے سنوارنے میں حصہ لیا۔ ان کی ایک لمبی فہرست ہے۔

'المصلح' کا اجراء

مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب سے پہلے میجر شمیم احمد صاحب قائد خدام الاحمدیہ کراچی تھے۔ انہوں نے بہت سے نئے پروگراموں کو عملی جامہ پہنایا۔ جن میں ایک پندرہ روزہ 'المصلح' کا اجراء تھا۔ جو یکم اگست 1951ء کو ہفتہ وار ہو گیا۔ بیگ صاحب نے مجلس خدام الاحمدیہ کے اس رسالہ کو زندہ رکھنے کے لئے مسلسل جدو جہد کی۔ بیگ صاحب 1952ء میں خدام الاحمدیہ کراچی کے قائد منتخب ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کی ودیعت فرمودہ صلاحیتوں سے بھرپور کام لیتے ہوئے کامیاب قائد بنے۔ ان کی قیادت میں 1953ء کا سال خاص اہمیت کا سال ہے۔ جبکہ ملک بھر میں جماعت کے خلاف معاندین سلسلہ نے مخالفت کا طوفان برپا کر دیا تھا۔ اس موقع پر بیگ صاحب نے کمال فراست سے نوجوانوں کی صلاحیتوں سے کام لیا۔ اور اُن کے جذبات کو اعتدال پر رکھا۔ اسی طوفان میں ضرورت محسوس ہونے پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے جماعت کراچی کو صدر انجمن کا اعزاز عطا فرمایا تھا۔ جس میں بیگ صاحب بھی شامل تھے۔ اسی طوفان میں حکومت پنجاب نے اخبار الفضل جو لاہور سے شائع ہوتا تھا بند کر دیا جس سے مرکز سلسلہ کا رابطہ جماعتوں سے کٹ گیا۔ اس دورِ خرابی میں رابطہ کی اس کمی کو المصلح نے پورا کیا۔ اس طرح یہ اعزاز بھی خدام الاحمدیہ کراچی کو حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

کراچی چونکہ مرکزی شہر تھا اور آئے دن نئے نئے مسائل ابھرتے رہتے تھے۔ حکومتیں بھی مضبوط پاؤں پر جم نہ رہیں تھیں۔ جس سے شور و غوغا کراچی کا ایک مزاج بن چکا تھا۔ ادھر مودودی صاحب اپنی نام نہاد اصلاحی کوششوں میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے ''قادیانی

مسئلہ'' لکھ کرعوام الناس کو اپنی گرفت میں لینا چاہا۔ چنانچہ مرکز سلسلہ نے فوری طور پر اس کا جواب شائع کر دیا۔اس کتابچہ کو وسیع پیمانہ پر پھیلانے کے لئے مکرم بیگ صاحب نے مؤثر پروگرام بنائے اور مختلف طبقات میں جماعت کے موقف کو پہنچا دیا۔ یہاں تک ہی اکتفاء نہ کیا ۔ جماعت کی آواز کوعوام الناس تک پہنچانے کے لئے شہر کراچی کے ہر علاقہ میں دور دور تک اس کی درو دیوار کو رات رات بھر میں احمدیت کے اعتقادات اور مؤقف کو کتبوں، stencilsاور پوسٹر کی صورت میں سجا دیا۔صبح جب طلوع ہوئی تو پورے کراچی نے بیک وقت حیرت سے نوشتہ دیوار کو پڑھا۔حتیٰ کے اخبار نے بھی اپنی رپورٹس میں استعجاب کا اظہار کیا کہ رات رات بھر میں یہ کیا ماجرا ہوا کہ کراچی کے درو دیوار سے احمدیت کے موقف کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ یہ کیسے جن تھے۔جنہوں نے پورے کراچی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

خدمت خلق کا میدان

مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب نے یہ محسوس کیا کہ خدمت خلق کا میدان خالی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس میدان کو بھی سر کرنے کی ٹھان لی اور دیکھتے ہی دیکھتے مارٹن روڈ میں ایک لائبریری اور ایک ڈسپنسری کھول دی۔ یہ اُس وقت کے مطابق ایک وسیع پروجیکٹ تھا۔جس پر 18 ہزار روپیہ کی لاگت آئی۔اس ڈسپنسری کو علاقہ کے لوگوں نے تحسین سے دیکھا اور استفادہ کیا۔اس ڈسپنسری کا سنگ بنیاد مورخہ 20 فروری 1958ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے اپنے دست مبارک سے رکھا تھا اور 8 مارچ 1959ء کو جناب نیاز محمد خان صاحب کمشنر کراچی نے اس کا باقاعدہ افتتاح کیا۔اس ڈسپنسری کو دیکھنے کے لئے مکرم پروفیسر ڈاکٹر

عبدالسلام صاحب بھی تشریف لائے اور مجلس خدام الاحمدیہ کی کارکردگی کو سراہا۔اسی پروجیکٹ کواور وسعت دیتے ہوئے 14 اگست 1958ء کو گولیمار علاقہ میں بھی ایک فری ڈسپنسری کھول دی گئی۔ڈسپنسری کے کام سے نکل کر ایک سیکنڈری سکول کا اجراء بھی بیگ صاحب کے نئے پروجیکٹ کا حصّہ تھا جو پلاننگ کے مطابق بہت جلد مرحوم سید سخاوت شاہ صاحب کی نگرانی میں چل نکلا۔غرض کہ بیگ صاحب نے جس پروجیکٹ کو بھی ہاتھ لگایا اس کو جدید تقاضوں کے مطابق مکمل کیا۔

1956ء میں پنجاب شدید سیلاب کی زد میں آ گیا،جس سے دیہات اور شہروں میں بہت تباہی آئی حتیٰ کہ لاہور شہر اور اس کے مضافات میں خستہ عمارتیں سیلاب کی زد میں آ گئیں۔اس حادثہ پر جہاں پنجاب کے خدام نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا،وہاں کراچی کے خدام بھی سیلاب زدگان کی مدد میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔آناً فاناً کراچی سے کپڑوں، خوراک اور ادویات کی بھاری کھیپ امدادی کیمپوں میں پہنچا دی گئیں۔بیگ صاحب قومی ضروریات کو ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے۔انہوں نے دیکھا کہ کراچی جیسے عظیم مرکزی شہر میں شہری دفاع اور فرسٹ ایڈ کا حکومت یا سماجی اداروں کی طرف سے خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔اس وقت صرف ایک ہی سماجی ادارہ سینٹ جون ایمبولینس اس کارخیر میں ہمہ تن مصروف عمل تھا۔ چنانچہ بیگ صاحب نے اس ادارہ سے رابطہ پیدا کیا اور 30 خدام پر مشتمل ایک ٹیم کو شہری دفاع اور فرسٹ ایڈ کے لئے منظم کیا۔ان کو باقاعدہ تربیت دلوائی اور خدمت کے میدان میں لگا دیا۔اس ٹیم نے مورخہ 28 فروری 1959ء کو گورنمنٹ سکول جیکب لائنز میں شہری دفاع اور فرسٹ ایڈ کا کامیاب مظاہرہ کیا۔

چارسال عَلَمِ انعامی کاحصول

انتظامی لحاظ سے بیگ صاحب نے مجلس خدام لاحمدیہ کو اس قدر مضبوط کر دیا تھا کہ اس کی کارکردگی میں نمایاں تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں اور تمام شعبہ جات میں ایک باقاعدگی پیدا ہو چکی تھی اور یہی باقاعدگی آنے والے قائدین کے کام کو آسان بنا گئی۔

خاکسار (بشیرالدین احمد سامی) کو مکرم بیگ صاحب کے ساتھ بحیثیت معتمد اور ناظم اعلیٰ کام کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے عاجز کی ادنیٰ کوششوں کو ہمیشہ سراہا بلکہ سب کے سامنے برملا کہہ دیا کرتے تھے کہ سب کام تو یہ کرتا ہے اور نام میرا ہوتا ہے۔ حوصلہ افزائی کا یہ انداز بھی انہی کا حصہ تھا۔ جہاں تک حسن کارکردگی کا سوال ہے بیگ صاحب کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ انہوں نے اپنی قیادت کے دوران 1954ء سے لیکر 1957ء تک چار سال لگا تار عَلَمِ انعامی حاصل کیا۔ اگلے دو سالوں میں بھی یعنی 59-1958ء میں یہ اعزاز محترم چودھری عبدالمجید صاحب نے حاصل کیا جبکہ وہ قائد تھے۔

محترم مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب جہاں عمل کے میدان میں آگے آگے تھے وہاں کارکردگی کو جامع رنگ میں پیش کرنے کا بھی ملکہ رکھتے تھے۔ مورخہ 24 اگست 1953ء کو خدام کے اجلاس میں بیگ صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی خدمت میں رپورٹ کارگزاری پیش کی تو حضورؓ نے فرمایا:

> ''کام کا اندازہ آپ لوگ زیادہ لگا سکتے ہیں کہ جنہوں نے خود اس کی سرانجام دہی میں حصہ لیا ہے۔ اگر رپورٹ مبالغہ سے خالی ہے اور پوری احتیاط سے لکھی گئی ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ خدام الاحمدیہ کی مجالس میں بہت کم مجالس

مکمل رپورٹ پیش کرسکتی ہیں۔''

(المصلح 25 اگست 1953ء)

اس رپورٹ کی تیاری میں مکرم شیخ عبدالوہاب صاحب مرحوم نے حصہ لیا جو اس سال ان کے ساتھ معتمد تھے۔

بیگ صاحب نے معاشی ذمہ داریوں اور جماعتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کو بھی مکمل کیا اور بفضلہٖ تعالیٰ کامیاب ایڈووکیٹ ہوئے۔ وہ سیکرٹری دعوت الی اللہ بھی رہے۔ اور جماعت کے نائب امیر بھی جس حیثیت میں بھی وہ رہے، مکرم عبداللہ خان صاحب سے لیکر مکرم چودھری احمد مختار صاحب اور مکرم مودود احمد خان صاحب تک ہر امیر جماعت نے بیگ صاحب کو اپنا دست راست پایا اور ان پر مکمل اعتماد کیا۔ بلا شبہ مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب انتظامی صلاحیتوں کے لحاظ سے جماعت ہائے احمدیہ کراچی کے لئے ایک سرمایہ تھے۔ دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے کراچی کی جماعت کو مخلصانہ قیادت اور قربانی کرنے والی جماعت میسر رہی جس کی برکت سے اسے خدمت سلسلہ کا اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ اسی حوالہ سے حضرت چودھری عبداللہ خان صاحب کی وفات پر الفضل مورخہ 4 جولائی 1959ء میں حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ کا ایک تعزیتی نوٹ شائع ہوا تھا، جس میں آپ لکھتے ہیں:

''جماعت کراچی کا اس موقع پر اولین فرض ہے کہ وہ اس ترقی کے مقام میں ہرگز کمی نہ آنے دے جس پر وہ اس وقت خدا کے فضل سے پہنچ چکی ہے۔ اسے یاد رکھنا چاہئے کہ دینی جماعتوں کی ترقی کی بنیاد ایمان، اور عمل صالح کے بعد اصولاً چار باتوں پر ہوتی ہے یعنی اوّل اخلاص۔ دوسرے قربانی۔ تیسرے

تنظیم۔ چوتھے اتحاد۔

پس جبکہ خدا کے فضل سے کراچی کی جماعت کو یہ چار باتیں بصورت احسن حاصل ہیں تو ان کا فرض ہے کہ اس مقدس چار دیواری کو نہ صرف قائم رکھیں، بلکہ اسے بلند سے بلند کرتے چلے جائیں۔''

مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب کی خصوصیات تو ایک کھلا میدان ہے۔ مگر اس تحریر میں کوشش تھی کہ جہاں بیگ صاحب کا ذکر خیر ہو اس کے ساتھ ساتھ قارئین کو جماعت احمدیہ کراچی کی تاریخ سے بھی گزارتا چلا جاؤں۔ اللہ تعالیٰ بیگ صاحب کی خدمات کو قبولیت کا شرف عطا فرمائے۔ مغفرت کی چادر میں ڈھانپ لے اور اعلیٰ علیّین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ آہ پرجذب انسان ہم سے رخصت ہوا۔

(روزنامہ الفضل ربوہ 7/اگست 2000ء)

○○

الفضل کے درویش

پاکستان کی خوش قسمتی تھی کہ 1953ء میں خواجہ ناظم الدین کی صورت میں اسے ایک شریف النفس حکمران میسر آیا۔اس دور میں پاکستان کے بانی مبانی قائد تو دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔مسلم لیگ کی بساط اسی طرح بچھی تھی اور تمام مہرے اپنی اپنی جگہ پر تھے۔ڈھاکہ سے کراچی تک ایک پلیٹ فارم تھا۔سندھ کا مرکزی شہر کراچی مختلف طبقات کی آماجگاہ تھا۔ اخوت کا یہ مظہر یہ شہر عظیم امن کا گہوارہ تھا۔جہاں ہر سطح کا انسان دو وقت کی روٹی سکون سے کھا سکتا تھا۔بھلے،فٹ پاتھ پر سوئے،چین سے تو سوتا تھا۔صحافت آزاد تھی۔ضمیر زندہ تھے۔ حق بات کہنے کا حوصلہ رکھنے والے موجود تھے اور صاحب اقتدار اپنی طاقت کے ناجائز استعمال کو گناہ سمجھتے تھے۔یہ تھی وہ کھلی فضا جس میں سندھ سانس لے رہا تھا۔یہ تھا وہ سندھ جس نے پاکستان کے لئے قربانیاں دینے والوں کو والہانہ طور پر سینے سے لگایا تھا۔اس سندھ میں کس کی مجال تھی جو کسی کو بدنظر سے دیکھ سکے۔

1953ء کے احمدیوں کے خلاف ہنگاموں کے دوران روزنامہ الفضل کو جو ان دنوں لاہور سے شائع ہوتا تھا، بند کر دیا گیا۔الفضل بند تو ہوا لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کے ذریعہ

ہونے والی آبیاری بھی رک جاتی ۔ یہاں بھی کراچی کا سینہ وا ہوا۔ کراچی سے ان دنوں خدام الاحمدیہ کا ترجمان پندرہ روزہ 'المصلح' نکلا کرتا تھا۔ جس کی ادارات میں فیض عالم چنگوی اور تاثیر احمدی شامل تھے۔ یہ حضرات بخوشی ایک طرف ہٹ گئے اور اس کی جگہ الفضل نے لے لی۔ یوں الفضل نے المصلح کا پیراہن اختیار کیا۔ بس پھر کیا تھا۔ کراچی کے وارے نیارے ہو گئے۔ مفت میں مکرم روشن دین تنویر صاحب، مکرم مسعود احمد دہلوی صاحب، مکرم شیخ خورشید احمد صاحب اور مکرم شیخ محمد احمد پانی پتی صاحب جیسے طرز ادیب اور اخبار نویس آ موجود ہوئے۔ الفضل کے اداراہ کی تفصیل بھی اس وقت یہی تھی۔ جن کے خامے، حضرت سلطان القلم کے علم کلام اور اسلوب بیان سے ترشے ہوئے تھے۔ بس اسی حادثہ نے ہمیں بھی روشن دین تنویر سے ملا دیا۔ ملانا تو بہت بڑی بات ہے ہمارے جیسوں کے تو پر جلتے تھے۔ بس نظارہ تھا اور وہ بھی دور دور سے ایسی ہستیاں اپنی ذات میں ایک انجمن ہوتی ہیں ۔ مگر حسرت رہی کہ ہم کبھی کسی مجلس میں تنویر کو دیکھ پاتے ۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ انہوں نے بھی احمدیہ ہال کے پچھواڑے ایک کمرہ کو اپنا مسکن اور دفتر بنائے رکھا اور دوسری طرف احمدیہ ہال کا ماحول ایسا فعال ماحول تھا جس نے اُن دنوں فقط اپنی گہما گہمیوں میں سرمست رہنے کا طورا پنا رکھا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ روشن دین تنویر کو باہر نہ لا سکے ۔ وہ تو تھے بھی اپنی جگہ خاموش طبع اور تنہائی پسند انسان، ان کے خرام میں بھی تو کوئی آواز نہ تھی ۔ کاش کراچی کو کبھی ان کے ساتھ کوئی شام منانے کا خیال آتا۔

اسی ماحول میں ایک مسعود احمد خان دہلوی بھی تھے، بولتے کم تھے۔ آس پاس کو پڑھتے زیادہ تھے ۔ کہیں کہیں ایک آدھ فقرہ چست کر دیا۔ ان کے ساتھیوں میں ایک شخصیت اللہ بخشے، محمد احمد پانی پتی کی بھی تھی، جنہوں نے احمدیہ ہال کے بازو میں سٹور نما کمرہ میں ایک

چٹائی کو دفتر بنا رکھا تھا۔ ایک ہاتھ میں عربی کی کوئی پرانی کتاب تھامے رکھتے، دوسرے ہاتھ میں قلم ہوتا جو، رہٹ کی طرح علوم وفنون کے خزانے انڈیلتا چلا جاتا۔ ترجمہ کرنے میں ایسی مہارت اور روانی تھی کہ دیکھنے والا محسوس کر سکتا تھا، کہ محمد احمد پانی پتی کو ایک دوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ وقت نے بھی یہی بتایا، واقعی وہ دوڑ ہی تھی۔ زندگی نے وفا نہ کی، نوجوانی میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے اور اپنے کام سے اردو بازار لاہور کے کتب فروشوں کی الماریاں بھر گئے۔

باوجود تنگیٔ داماں، انتظامی لحاظ سے ایک مولوی عبداللہ اعجاز تھے جنہوں نے دفتری آن بان کو بنا رکھا تھا۔ اسی طرح عملہ میں ایک نہایت ہردلعزیز، سادہ اور منکسر مزاج ہستی منشی سبحان علی صاحب کی تھی۔ جتنے خوش طبع تھے، اتنے ہی خوش نویس تھے۔ کراچی کی ہر ادا انہیں بھلی لگتی تھی۔ خاص طور پر موسم سے وہ بہت خوش تھے۔ ایک روز وہ مارکیٹ سے کالے رنگ کا سیکنڈ ہینڈ مخملی کوٹ خرید کر پہن آئے۔ ان کا گزر تنویر صاحب کے سامنے سے ہوا، بس یہاں تو وہ پکڑے گئے۔

”کیا خوب! منشی صاحب آپ تو بالکل بیگم لیاقت علی خان لگ رہے ہیں۔“

تنویر صاحب نے چلتے چلتے یہ فقرہ چست کر دیا۔ دراصل منشی صاحب نے جو کوٹ پہن رکھا تھا، اس کے بٹن لیڈیز کوٹ ہونے کی چغلی کھا رہے تھے۔ بہت دیر تک عملہ میں ان کے ساتھ یہ چھیڑ رہی۔ لیکن ان کی ہمت کی داد دینا پڑے گی اُنہوں نے وہ کوٹ اتارا نہیں۔ انہوں نے تو آخر اسے خرید کر ہی پہنا تھا۔ اور اس پر ان کے دام خرچ ہوئے تھے۔ الفضل کا سٹاف ایک سال تک کراچی میں رہا۔ ان کی مستقل مزاجی، لگن، ان تھک محنت اور ذمہ داری کے احساس نے ایک لحظہ بھی انہیں اجنبی مہمان ہونے کا کوئی تصور پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ المصلح

کے نام کے سوا، انہوں نے کراچی کی جماعت سے اپنے لئے کسی سہولت کی خواہش نہیں کی۔ کس حال میں وہ کراچی آئے۔کس حال میں وہ واپس گئے۔یہ سب اثاثے وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔اور ہمیں خواب دیکھنے کے لئے چھوڑ گئے۔۔

اللہ۔اللہ۔کتنے خوددار، کتنے حوصلہ مند، درویش صفت تھے وہ لوگ۔

تنویر صاحب اور منشی سبحان علی صاحب (مولانا عبدالسلام ظافر صاحب کے والد) اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔مکرم مسعود احمد خان صاحب دہلوی، جرمنی میں رونق افروز ہیں اور اپنے قلم کو ہر طرح سے دین کی خدمت میں مستعد رکھے ہوئے ہیں۔جناب شیخ خورشید احمد صاحب کینیڈا میں ہیں۔موخر الذکر دونوں احباب کی صحت اور لمبی عمر کے لئے دعاؤں کی درخواست ہے۔

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے، وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں، مگر ایسے بھی ہیں

(روزنامہ الفضل مورخہ 13 جنوری 1996ء)

○○

مری میں ربوہ کی خبریں الفضل سے ہی ملتی تھیں

(تحریر: صفیہ سامی)

میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ میں نے جب سے آنکھ کھولی ہے تب سے الفضل کو دیکھا ہے۔ مگر ہاں میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے، تب سے الفضل کو اپنے گھر میں ہی پایا ہے۔

میں اب نہیں جانتی کہ ربوہ کے گھروں میں اخبار کس وقت آتا ہے۔ جب کی میں بات کر رہی ہوں اس وقت ہمیں ہر روز شام کو الفضل مل جاتا تھا۔ اور وقت کا بھی ہمیں اندازہ تھا کہ کس وقت تک اخبار والا اخبار پھینک کر جائے گا۔ تو ہم بہنیں انتظار میں ہوتیں، جیسے ہی اخبار کے گرنے کی آواز آتی ، ہم اخبار کی طرف جھپٹتیں اور کوشش کرتیں کہ پہلے مجھے مل جائے۔ اُن دنوں کوئی بہت زیادہ دلچسپی کی اور چیزیں نہیں ہوتی تھیں۔ یہی علمی ، ادبی اور معلوماتی اخبار تھا۔

اُن دنوں سب سے اوپر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی صحت کے بارے میں اعلان ہوتا تھا جو ہم پہلے پڑھتے تھے۔ پھر پورا اخبار پڑھا جاتا تھا۔ اُس کے بعد دوسرے اخبار بھی آنے لگ گئے۔ مگر دینی معلومات، اپنی جماعت کی خبریں اور دنیاوی خبریں صرف ہمیں الفضل

اخبار سے ہی ملتی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ شادی کے بعد ہم گرمیوں کی چھٹیوں میں اکثر پشاور سے مری چلے جاتے تھے جہاں میرے جیٹھ اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ میرے سسر ابا جی محترم سردار مصباح الدین صاحب بھی ہمارے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں الفضل اخبار کتنے شوق سے پڑھتی ہوں اور وہ خود بھی اخبار کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ہر روز وہ بہت دور جا کر میرے لئے اخبار لاتے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اخبار ہمیشہ میں پہلے پڑھتی ہوں۔ اس لئے وہ ہمیشہ دو اخبار لاتے۔ ایک الفضل اور دوسرا مشرق اخبار۔ الفضل مجھے دیتے کہ مجھے ربوہ کی خبروں کا انتظار ہوتا تھا۔ بعد میں ابا جی الفضل پڑھتے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

ہاں جیسے میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ جب تو ہم بہنیں ربوہ میں شام کا انتظار کرتی تھیں کہ کب اخبار آئے گا لیکن اب تو میری یہ عادت بن گئی ہے کہ صبح کو اپنا کمپیوٹر آن کرتی ہوں تو الفضل میرے سامنے آ جاتا ہے۔ ہمیں اتنی بڑی سہولت پہنچانے کیلئے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ الفضل کا میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس اخبار کی احسان مند ہوں۔ کیونکہ اس کو پڑھ پڑھ کر میں نے کچھ نہ کچھ لکھنا سیکھا۔ اور الفضل نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس اخبار کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقیات عطا کرتا چلا جائے۔ آمین۔ اور ہم ہمیشہ اس سے علم حاصل کرتے رہیں۔ سچی اور آخری بات یہ ہے کہ الفضل سے ہم روحانی مائدہ حاصل کرتے ہیں۔

(روزنامہ الفضل صد سالہ جوبلی سوونیئر 2013ء صفحہ 267)

○○

کوچہ گل بادشاہ میں خانہ خدا کے مجاور

پٹھان قوم بہت بہادر، بے باک اور نڈر رہے۔ اپنے عقائد، اپنی روایات پر اس مضبوطی سے قائم کہ کسی کی مجال نہیں کہ اُنہیں اِدھر سے اُدھر کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کو زیر رکھنے کے لئے جس جابر شہنشاہیت نے زور مارا اس کا اپنا ہی دم خم نکل گیا۔ اس قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ سعادت بھی بخشی ہے، کہ اس سرزمین کے چند مخلصین نے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے فدائی اور جانثار ساتھی بننے کا شرف حاصل کیا۔

پلک جھپکتے دیر نہیں لگتی۔ 1960ء سے بات آگے بڑھا رہا ہوں۔ صوبہ سرحد بدستور صحابہ کرامؓ حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے فیض پا رہا تھا جن میں ایک ممتاز شخصیت حضرت قاضی محمد یوسف صاحبؓ کی تھی۔ آپؓ امیر صوبہ سرحد بھی تھے۔ حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکیؓ اس وقت پشاور سے ربوہ منتقل ہو چکے تھے۔ لیکن کوچہ گل بادشاہ کی رونقیں بہت ہستیوں نے قائم کر رکھی تھیں۔ مکرم خان شمس الدین خان صاحب، مکرم مولوی الطاف خان صاحب، مکرم ارباب احمد خان صاحب، مکرم کالا خان صاحب، مکرم محمد یوسف صاحب صراف، مکرم مرزا نثار احمد صاحب فاروقی، مکرم عبد الکریم صاحب، مکرم عبدالسلام خان

صاحب، مکرم عبدالقدوس خان صاحب، مکرم خان خواص خان صاحب، مکرم فرزند علی خان صاحب، مکرم مولوی چراغ دین صاحب (مربی سلسلہ) مکرم مولوی خلیل الرحمن صاحب، مکرم مسیح الدین خان صاحب، مکرم مرزا عبدالحمید صاحب، مکرم سیّد محمد نور کابلی صاحب۔

یہ وہ سب اللہ والے لوگ تھے جو کوچہ گل بادشاہ (بیت الحمد) کے مجاور تھے۔ ان خان باباؤں میں ایک نیک صفت حضرت خان دانشمند خان صاحب بھی تھے۔ علم فراست، دلائل و براہان سے مسلح، ڈیرہ ڈیرہ، دعوت الی اللہ دوٹوک پہنچانے کا مشغلہ ان کا روزمرہ تھا۔ وہ اس میدان کے نڈر سپاہی تھے۔ جان پر کھیل جانا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

بالآخر ان کی زندگی میں وہ وقت بھی آیا جبکہ ان کی عمر 70 سال کے قریب تھی۔ دشمن نے قتل کے ارادے سے سوتے میں ان کے سر کو گولی کا نشانہ بنایا ہی تھا کہ اسی لحظہ ان کی آنکھ کھل گئی جس سے ان کا بازو ڈھال بن گیا اور گولی بازو کو جا لگی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کی جان کی حفاظت فرمائی مگر وہ بازو سے محروم ہو گئے۔

مکرم خان شمس الدین صاحب امیر جماعت احمدیہ پشاور تھے۔ بہت مدبر، مخلص اور فدائی انسان تھے۔ امامت پر جان دینے والے وجود، جلسہ سالانہ کے سٹیج پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے ساتھ ریوالور کی بیلٹ زیب تن کئے اکثر تصاویر میں مستعد نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ڈٹ کر امارت کی۔ نظام جماعت کی بات ہوتی تو چٹان بن جاتے تھے۔ ان کی زندگی کے آخری لمحات میں لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں اس وقت ان کی عیادت کا موقع ملا جبکہ کے ان کے بدن پر جگہ جگہ مددگار آلات لگے ہوئے تھے۔ مگر ان کی مہمان نوازی کا جذبہ تسکین نہیں پا رہا تھا جب تک کہ اس حال میں بھی انہوں نے اپنے خادم کو بھجوا کر چائے نہیں منگوا لی۔ اسی طرح ان کی آخری شام کا نظارہ بھی ان آنکھوں نے دیکھا ہے۔ جانے اُن پر کون سا عالم

طاری تھا، مسلسل کچھ پڑھتے جارہے تھے عربی دعائیں تھیں یا پشتو تھیں، اس دنیا کا انسان بھلا کیا سمجھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے ایسے فدائی تھے جن پر ہر کوئی رشک کرے۔ سول کواٹرز کی مسجد میں خطبہ دیا کرتے تھے۔ ایک خطبہ میں انہوں نے ایک نوجوان کے جذبہ خدمت اور اخلاص کا دعا کی غرض سے اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نوجوان کو ایک بائیسکل لے کر دے دی گئی ہے تا کہ وہ شہر بھر میں محصل کا کام آسانی سے کر سکے۔ مکرم خان صاحب کے یہ الفاظ کراچی سے نو واردنو جوانوں کے لئے تازیانہ کا کام کر گئے۔

یہ سب دوست 1960ء میں کراچی سے تبدیل ہو کر یہاں آئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے فی الفور ایک کمیٹی تشکیل دے کر مکرم امیر صاحب سے منظوری حاصل کی جس میں مکرم میاں عبدالرفیق صاحب، مکرم میاں عبدالرشید صاحب، مکرم نصیر احمد خان صاحب، مکرم مرزا نثار احمد صاحب، مکرم چودھری رکن الدین صاحب، مکرم شمس الدین اسلم صاحب، مکرم نیاز احمد بٹ صاحب اور خاکسار بشیر الدین احمد سامی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے اس سرعت سے کام کیا کہ اگلے ہی روز سول کواٹرز کی مسجد میں 40 سے زائد مقامی دوست مکرم خان شمس الدین خان صاحب کے سامنے خدمت کے جذبہ سے سرشار حاضر ہو گئے۔ اس ٹیم کے علاوہ اس کمیٹی نے حلقہ جات کے نظام کا بھی ایک خاکہ پیش کیا۔ اس طرح تنظیم کا یہ سلسلہ پشاور سے نکل کر پورے صوبہ سرحد میں پھیل گیا اور ہر جماعت میں ذیلی تنظیموں کا وجود نظر آنے لگا۔ کارکنان میں دوڑ شروع ہوئی۔ مسابقت کی روح نے اپنے جوہر دکھانے شروع کئے۔ بس پھر کیا تھا، ایک سے ایک بڑھ کر مخلصین کی بھیڑ لگتی گئی۔ اس چکا چوند ماحول سے مرکز کی توجہ بھی ادھر ہوئی الفضل اور رسائل میں صوبہ سرحد کی کارکردگی جگہ پانے لگی۔ مرکز سے علماء سلسلہ اور دیگر عہدیداران کا آنا شروع ہوا۔ صدر مجلس انصاراللہ مرکزیہ حضرت مرزا ناصر احمد

صاحبؒ (خلیفۃ المسیح الثالث) کے ساتھ یونیورسٹی کے علمی اور ادبی حلقوں میں مجالس ہونے لگیں۔ پھر وقت کے ساتھ مردان کی مسجد میں صدر مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ حضرت مرزا طاہر احمد صاحبؒ (خلیفۃ المسیح الرابع) کے ساتھ رشد و اصلاح کی رونقیں بڑھنے لگیں۔ اسی دور میں بازید خیل کے ایک بزرگ صحابی حضرت خان سیف الرحمٰن خان صاحبؓ وفات پا گئے اور وہیں مدفون ہوئے۔ صوبہ سرحد کے اس معمر، مدبر، مفکر جید عالم کا جنازہ جب اُٹھا تو بڑے بڑے سیاسی سماجی رہنما موجود تھے۔ ان کی موجودگی اس بات کا اعتراف تھی کہ اس عظیم انسان نے صوبہ سرحد کی عملی، لسانی، اخلاقی اور سیاسی لحاظ سے بھرپور خدمت کی ہے۔

قارئین! پشاور کے تعلق سے اس مختصر نوٹ کے ذریعہ، دراصل آنے والی نسلوں کے لئے ان کے آباء کی خدمات کے ناتے اپنی بھولی بسری یادوں کے دریچے دعا کی غرض سے کھول رہا ہوں۔ کیونکہ اس وقت جو ستارے افق پر دیکھے تھے، وقت ملے تو وہ بھی انہیں ڈھونڈ سکیں۔ مثلاً مکرم مرزا آفتاب احمد صاحب، مکرم مرزا بشیر احمد صاحب، مکرم مولا بخش صاحب، مکرم مرزا مقصود احمد صاحب، مکرم مرزا عبداللطیف صاحب، مکرم ڈاکٹر غلام اللہ صاحب، مکرم مرزا عبدالرشید صاحب، مکرم ڈاکٹر ماجان علی صاحب، مکرم ڈاکٹر محمد زمان خان صاحب، مکرم عبدالسمیع صاحب، مکرم مصلح الدین خان صاحب، غرضیکہ کس کس کا نام لوں۔ کس کس کو نہاں خانہ دل میں تلاش کروں۔ کتنے ہیں جو ملک عدم کو مسکن بنا چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ایسے خادمانِ دین پر اپنی رحمتیں اور برکات نازل کرے۔ آمین۔

(روزنامہ الفضل ربوہ۔10 مارچ 1996ء)

○○

وہ گنجہائے گرانمایہ

ربوہ کے قیام کے بعد پنجاب کے صحافی نمائندوں کے ساتھ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی پہلی پریس کانفرنس منعقد ہوئی تو ربوہ ان دنوں چھوٹے چھوٹے خیموں پر مشتمل خانہ بدوشوں کا ایک ڈیرہ تھا۔ معزز مہمانوں کے لئے اس موقع پر ایک بڑا شامیانہ لگایا گیا تھا اور جملہ انتظامات کی نگرانی مکرم سید محمود اللہ شاہ صاحب ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول کے سپرد تھی۔ مکرم ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنی مدد کے لئے دسویں جماعت کے طلباء کو اپنے ساتھ رکھا۔ اس کلاس میں نسبتاً میں کلاس میں سب سے چھوٹا تھا یا کہہ لیجئے خاموش طبع تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی جب نظر مجھ پر پڑی تو بلایا اور فرمایا کہ حضرت صاحبؓ کی میز پر تم سروس کرو گے۔ اس اچانک سعادت کے حصہ میں آنے کی وجہ سے میری پیشانی پسینہ سے بھیگ گئی۔ میری گھبراہٹ کے باوجود ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھ سے حضرت صاحبؓ کے سامنے پھل وغیرہ اور دوسری چیزیں چنوا دیں۔ حضرت صاحبؓ مہمانوں سے گفتگو فرماتے رہے اور نمائندگان کے استفسار پر جوابات عطا فرماتے رہے اس موقع پر جناب عبدالمجید سالک صاحب پیش پیش تھے جن کی زبان حضرت صاحبؓ، حضرت صاحبؓ کہتے نہیں تھکتی تھی۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو حضرت صاحبؒ اخبار نویسوں کو لے کر ربوہ کی فضاء دکھانے کے لئے پہاڑیوں کی طرف چل پڑے اور فرما رہے تھے کہ اس کلرزدہ وادی اور چٹیل پہاڑیوں کو ہم انشاءاللہ ہرا بھرا کردیں گے۔

یہ ساری باتیں اخبار نویس بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے اور سوچتے بھی ہوں گے کہ حضرت مرزا صاحبؒ یہ سب کچھ کیا فرما رہے ہیں اور یہ سب کیسے ممکن ہے۔ کلر اور دھول سے اَٹی ہوئی بے آب گیاہ وادی کیسے گُل و گلزار ہوگی۔ انہیں لگتا ہوگا کہ ساری باتیں اسی دھول میں گم ہوجائیں گی۔ لیکن آج یہ وہی ربوہ ہے جو ہر زائر کے لئے حدِنظر تک سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔

مکرم شاہ صاحب کی شفقت تھی کہ انہوں نے مجھے ملازمت کے لئے کراچی بھجوا دیا۔ وہاں جا کر بھی یہی دیکھا کہ اسی ایک شمع کے گرد، صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا جمگھٹا رہتا تھا اور ہر قسم کا فیض بھی وہ پاتے تھے۔ حضرت صاحبؒ کی مجلس میں ان حضرات کو مشاعرہ پڑھتے میں نے خود بھی سنا تھا۔ جن میں ظریف جبلپوری، ادیب سہارنپوری، صہبا اختر جیسے نامور شعراء اور ادیب شامل ہوا کرتے تھے۔ جہاں ایسے ایسے دانشوران کی شفقتوں اور عنایتوں کے بھوکے پیاسے رہے ہوں، وہاں مجھ جیسے ناچیز بھلا ایسی صحبتوں کے چند لمحات پر کیوں نہ اِترائیں۔

کراچی میں قیام کے دنوں مکرم مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب کی قیادت میں مجلس عاملہ کے چند خدام کو حضرت صاحبؒ کے ساتھ ان کے کھانے کی میز پر دعوت کا شرف حاصل ہوا۔ ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تھے اور منتظر تھے کہ ہمارے پیارے آقا کی آمد آمد ہے۔ آپس میں ہم سرگوشیاں بھی کر رہے تھے کہ اتنے میں ڈائننگ روم کا پردہ سرکا اور ایک لمحہ بھر کی سرعت

کے ساتھ حضرت صاحبؒ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے۔ پاؤں میں چونکہ جوتا بھی نہیں پہن رکھا تھا، اس لئے بھی آمد کا احساس نہ ہو سکا۔ دوسرا جو کرسی حضرت صاحبؒ کے لئے مخصوص تھی اس جگہ وہ نہیں بیٹھے بلکہ خدام کے درمیان میں ایک کرسی پر تشریف فرما ہو گئے۔ یوں عاجز نے خود کو حضرت صاحبؒ کے سامنے والی کرسی پر پایا۔ ہماری حالت کچھ عجیب سی تھی آداب کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بیٹھنے کا ارشاد فرمایا اور کھانا شروع ہوا۔ ہماری ہچکچاہٹ وہ بخوبی بھانپ رہے تھے۔ اس لئے ہمیں بے تکلفی سے کھانے کے لئے فرمایا۔ ایسے میں ہم نے کہاں تک کھایا یہ ہم ہی جانتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور ملاقات کا چسکا بھی بدستور قائم ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب 'المصلح' روزنامہ اخبار کے طور پر چھپ رہا تھا۔ اس اخبار کی انتظامیہ خدام الاحمدیہ کراچی تھی۔ خدام نے اخبار کو روزنامہ تو بنا دیا۔ لیکن وسائل اتنے محدود تھے کہ اس کی مارکیٹنگ کی کوئی صورت نہیں تھی اور مجلس پر اخراجات کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔

حضرت صاحبؒ جب ربوہ سے کراچی تشریف لائے تو مکرم مرزا عبد الرحیم بیگ صاحب نے اس سلسلہ میں مشورہ حاصل کرنے کا پروگرام بنایا مکرم چودھری عبداللہ خان صاحب امیر جماعت، مکرم ملک مبارک احمد صاحب، مکرم چودھری عبد المجید صاحب اور خاکسار کو ساتھ لیا اور حاضر خدمت ہو گئے۔ دل میں ڈرتے تھے کہ جس ولولہ سے اخبار کو روزنامہ نیوز پیپر بنایا ہے اس پر پورا اترنا اب مالی وسائل کے لحاظ سے تو ممکن نہیں رہا تھا۔ کس دل گردے سے حضرت صاحبؒ کی خدمت میں عرض کریں گے۔ لیکن جب مکرم مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب نے اپنا عندیہ عرض کر دیا تو حضرت صاحبؒ نے فرمایا کہ کس حکیم نے کہا ہے کہ زیر باری قبول کرتے رہو اور اخبار کو چھاپتے رہو۔ بس یہ سننا تھا ہماری جان میں

جان آئی اور چند منٹوں میں یہ ملاقات ختم ہوئی۔حساب کتاب کے جو بستے ہم ساتھ لیکر گئے تھے اسی طرح بند کے بند لے کر واپس ہوئے۔

اب تھوڑا اور آگے چلتا ہوں۔1954ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ پر چاقو سے حملہ ہوا اور مارچ 1955ء میں علاج کے لئے انگلستان جاتے ہوئے کراچی میں قیام فرمایا۔یہ وہ زمانہ تھا جب کراچی میں اچھی رہائش ایک عظیم مسئلہ تھا۔باوجود کوشش کے جماعت احمدیہ کراچی کوئی حسب منشاء رہائش کا انتظام نہ کرسکی۔مجبوراً کراچی شہر سے دور مالیر کی بستی میں قیام کا بندوبست ہوسکا۔یہ علاقہ شہری آبادی سے بالکل الگ تھلگ تھا۔وہاں گرینڈ ہوٹل کے عقب میں ایک بہت بڑی حویلی تھی،اس حویلی میں داخل ہوکر یوں لگتا تھا جیسے مدتوں اس میں کوئی رہا نہ ہو،صحن کی بے ترتیبی،در و دیوار کا سبزہ یہ سب اس حویلی کی سنسانی کا پتہ دینے والے مناظر تھے۔

حضرت صاحبؓ جب بھی کراچی تشریف لاتے تو جملہ انتظامات خدام الاحمدیہ کے سپرد ہوا کرتے تھے۔مکرم مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب قائد تھے اور خاکسار ان کے ساتھ معتمد تھا۔اس لحاظ سے انتظام اور رابطہ کے لئے فرائض میں اور بھی اضافہ ہوجاتا۔حضرت صاحبؓ کا قیام چونکہ کراچی شہر سے دور دراز علاقہ میں تھا اور اس دور میں آمد و رفت کے ذرائع بھی محدود تھے۔شاذ شاذ ہی احباب کے پاس اپنی سواری ہوا کرتی تھی۔حسب معمول اپنے دنیاوی کام کاج سے فارغ ہوکر اپنے رفیق مکرم عبدالمجید بٹ صاحب برادر اصغر مکرم مولوی عبدالحکیم اکمل صاحب مربی سلسلہ ہالینڈ کے ہمراہ ہم رہائش گاہ واقع مالیر کی طرف جارہے تھے کہ محسوس کیا اس شاہرہ پر دونوں جانب فاصلے فاصلے پر پولیس کے سپاہی تعینات ہیں۔حیران ہورہے تھے کہ عام طور پر اس قسم کے حفاظتی انتظام حکومت کے سربراہان کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔

جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے، حفاظتی انتظامات رہائش گاہ تک پھیلے ہوئے پائے، پولیس کے منتظمین اس حویلی کے اندر باہر بھی مستعد نظر آئے، خدام بھی چاک و چوبند تھے۔

حضرت صاحبؓ کی رہائش اوپر کی منزل پر تھی۔ ملاقات کے لئے نچلے حصے میں ایک کمرہ مخصوص تھا۔ عام، سادہ سا کمرہ، جس میں کرسیاں بچھی تھیں۔ مکرم عبدالرحیم درد صاحب بھی اس موقع پر اپنی دانشمندیوں اور فراستوں کو اپنی سادگی میں چھپائے چھپائے پھرتے تھے۔ بوجہ علالت یہ پہلا موقع تھا کہ حضرت صاحبؓ کو اوپر کی منزل سے نیچے لایا گیا۔ آپ سفید عمامہ، سفید قمیص شلوار کوٹ زیب تن فرمائے ہوئے تھے اور حسب معمول ہاتھ میں چھڑی تھی۔ حالانکہ چند روز قبل جب جماعت نے صدر ریلوے اسٹیشن پر استقبال کیا تھا تو آپ شب خوابی کے لباس میں تھے، کمبل سے گھٹنے ڈھکے ہوئے تھے سر پر گرم سکارف تھا۔ جو کانوں کو ڈھانپے ہوئے نیچے تک سرک گیا تھا اور کار تک لیجانے کے لئے ویل چیئر لائی گئی تھی۔

چند لمحے ہی گزرے تھے کہ جناب غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان کی سیاہ فلیگ کار اس حویلی میں داخل ہوئی۔ گیٹ پر موجود خدام نے سیلوٹ کیا جس کا انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا۔ کار استقبالیہ کمرہ کے سامنے روکی گئی۔ مکرم درد صاحب اس معزز مہمان کے استقبال کے لئے آگے تشریف لائے۔ گورنر جنرل سوٹ میں ملبوس تھے جناح کیپ پہن رکھی تھی اور کار کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چہرے پر سنجیدگی اور وقار تھا اور نظریں اشتیاق سے لبریز تھیں۔ خاکسار نے حضرت صاحبؓ کی طرف نگاہ ڈالی تو آپ کی پیشانی پر صحت مندانہ روپ نکھرا ہوا نظر آیا۔ گورنر جنرل کی کار کا دروازہ ملٹری اتاشی نے کھولا اور دونوں شانوں اور بازوؤں سے تھام کر جناب غلام محمد صاحب کو اپنی نشست سے اٹھایا۔ جسم

میں لرزہ تھا۔ کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی، پاؤں زمین پر ٹکتے نہ تھے۔، قد لامبا، مگر کوئی جھول نہ تھی، منہ سے پانی اور جھاگ سی نکلتی تھی جسے اتاشی سفید رومال سے صاف کر رہے تھے۔ یہ نحیف نزار مہمان، آج اپنے چند لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ؓ کے سامنے تیمارداری کے لئے حاضر تھا۔ اس پر رقت طاری تھی استقبالیہ کمرہ کی خامشی میں ڈوبی ہوئی کئی ہلچلوں کی دھوم باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ اس کیفیت میں کہاں تک لب ہلے؟ اگر ہلے بھی تو ذرہ سی جنبش نے نجانے جذب شوق کی کتنی داستانیں کہہ ڈالی ہوں گی۔ چند ساعتوں کی یہ ملاقات پلک جھپکتے ختم ہوگئی۔

حضرت صاحب ؓ کا یہ بیمار اور بے کس تیماردار جن سہاروں اور جن لڑھکتے قدموں سے حاضر خدمت ہوا تھا انہی پر واپس اپنی شاہی سواری میں بٹھا دیا گیا۔ چہرہ پر بلا کی خاموشی، سنجیدگی، متانت اور گہری اداسیوں کے آثار نمایاں تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے اپنی آس اور پیاس بجھا کر اس اطمینان کو پالیا ہے جو نہ ہوتا تو اسے حسرت ہی رہ جاتی۔ جذبہ وشوق، افسردگی و یاس میں ڈوبی ہوئی اس تاریخی ملاقات کا منظر جب بھی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے تو دل سے اِک ہوک سی اُٹھتی ہے۔

واہ! کس قدر روح پرور نظارہ تھا
آہ! کس قدر دلخراش جدائی تھی

جناب غلام محمد صاحب صبح سے ہی عیادت کے لئے بے تاب تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ؓ کا بے حد اصرار تھا کہ آپ اپنی صحت کا خیال کریں اور تکلیف نہ اٹھائیں لیکن جناب غلام محمد صاحب کی بھی اپنی ضد تھی کہ وہ آئیں گے۔ چنانچہ عزم استقلال کے اس پیکر نے اپنی تمام خستہ حالیوں کے باوجود تیمارداری کا شوق پورا کیا۔ کتنی پیاری تھی... ضد! جس نے حسرت

مٹا کر ہی دم لیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ جب انگلستان سے واپس کراچی تشریف لائے تو ان کی اپنی کوٹھی تعمیر ہو چکی تھی۔ واپسی کا پروگرام کسی قدر سرعت اور خاموشی میں طے پایا تھا۔ اس موقع پر خاکسار کے سپرد جماعت کراچی کی طرف سے دو اہم ذمہ داریاں عائد ہوئیں۔ اوّل یہ کہ حضرت صاحبؓ کی واپسی کے لئے دو بکرے جماعت کی طرف سے صدقہ کئے جائیں۔ چنانچہ خاکسار چند خدام کے ساتھ بکرا پیڑھی گیا اور زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اپنے ہاتھ سے دو جانور صدقہ کے لئے ذبح کئے اور پھر گوشت مستحقین میں تقسیم کروایا۔

وقت اتنا کم تھا کہ شام کی پرواز سے حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی تشریف آوری تھی اور جماعت کے درجن بھر کارکنان خدام چودھری عبداللہ خان صاحب کی معیت میں استقبال کے لئے ائیر پورٹ پر جا چکے تھے۔ خاکسار کے سپرد چونکہ رہائش گاہ کی دیکھ بھال کے اہم انتظامات کر دئے گئے تھے اور مستعد خدام کا ایک گروپ بھی ساتھ تھا اس طرح یہ دونوں ذمہ داریاں مختصر وقت میں خوش اسلوبی سے طے پائیں۔

حضرت صاحبؓ جب تشریف لائے تو صحت اچھی تھی اور معمول کے مطابق مصروفیت اور ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔ ایک روز خاکسار جب اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے قیام گاہ پر پہنچا تو دیکھا کہ مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب کی زندگی کا یہ بہت نازک دور تھا۔ تجردانہ زندگی، عمر کے تقاضے، اردو کالج اور ٹرسٹ کے تعلقات میں کشیدگی یہ ساری باتیں یکدم ان کی شخصیت پر براہ راست اثر انداز ہو رہی تھیں۔ مالی حالت اسی جگہ جا پہنچی تھی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ یعنی نان نفقہ کا بندوبست

بھی (بالواسطہ حضرت چودھری سر محمد ظفر اللہ خان صاحبؓ) جماعت احمدیہ نے کیا اور مولوی صاحب کو اپنی علمی استعدادوں کو اردوئے معلیٰ کی خدمت کے لئے یکسوئی کے ساتھ اُبھرنے کا موقع فراہم کیا تھا تا وہ اپنی ذہانتوں کو قلم کے ذریعہ قوم کے سامنے پیش کر سکیں۔

یہی وہ عوامل تھے جو انہیں بابائے اردو کا مقام عطا کر گئے۔ آج پھر ان پر وہی ادبار آن پڑی تھی۔ تنگ دستی، دل رفتگی نے ان کا سینہ چھلنی کر رکھا تھا۔ انہیں علم تھا کہ ابتداء میں بھی کس نے ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس وقت تو ان کے کندھے جوان اور مضبوط تھے۔ لیکن اب تو یہ کندھے بوڑھے اور نحیف تھے یقیناً عافیت کی ایک ہی جگہ تھی۔ حاجت روائی، دکھ درد کہنے کی ایک جا تھی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی شفقتوں اور عنایتوں کو وہ کب بھولے تھے۔ آج پھر وہی کشش انہیں اس دربار میں لے آئی تھی اور یوں وہ امام جماعت کی شفقتوں اور عنایتوں سے جھولی بھر کر واپس لوٹے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ 27 ستمبر 1995ء)

○○

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب

محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بارے میں ان کی عارضی زندگی میں ہی ان کی خدمات کے اعتراف میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب ان کی ابدی زندگی شروع ہونے کے بعد ان کے ہم عصر اور ان کے ہمکار اور کیا لکھیں گے؟ لیکن پھر بھی بہت کچھ لکھیں گے کیونکہ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب عظمت کے وہ مینار تھے جنہوں نے کلام الٰہی کی روشنی میں علم و تحقیق کی ایسی شمعیں روشن کیں جن سے تیسری دنیا کے ہونہار سائنسدانوں میں اس کائنات کے رازوں پر غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ ایسے میں وہ اپنے محسن کو بھلا کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔

دراصل ڈاکٹر صاحب تو ان وجودوں میں سے تھے جو قرآن کریم کی رو سے کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بارے میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے رب تو نے اس عالم کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔ تو ایسے بے مقصد کام کرنے سے پاک ہے۔ پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا اور ہماری زندگی کو بے مقصد بنانے سے بچا لے۔ پس ایسی شخصیت کے تعارف کے بارے میں

مجھ جیسے ناچیز کی کیا مجال کہ کچھ اضافہ کر سکے مجھے تو بس اتنا یاد پڑتا ہے کہ جب ہم سکول میں تھے تو ہمارے استاذی المکرم مولوی تاج الدین صاحب علمی میدان میں محنت کی ترغیب دینے کے لئے ہمیں ایک ہونہار لڑکے کی نمایاں کامیابیوں کی کہانی سنایا کرتے تھے۔اور یہ تھے ڈاکٹر عبدالسلام جن کے بارے میں سنتے تو تھے مگر دیکھا نہیں تھا۔محض حوالے کے طور پر وہ ہمارے گردوپیش رہا کرتے تھے۔

1958ء کی بات ہوگی وہ اپنی مہمات کے سلسلہ میں انگلستان سے کراچی تشریف لائے۔اس وقت کے قائد خدام مکرم مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب اوران کے رفیق خاص مکرم چودھری افتخار احمد صاحب کے کانوں میں ان کی آمد کی بھنک پڑگئی بس کسی نہ کسی وسیلہ سے ان تک رسائی کر لی۔یہ کمال افتخار کا ہی تھا۔مکرم ڈاکٹر صاحب کے علم میں جب لایا گیا کہ کراچی کے خدام ان سے ملنا چاہتے ہیں اور کچھ سننا بھی چاہتے ہیں تو نو جوانوں کی اس درخواست کو اپنی بے حد مصروفیت کے باوجود مان لیا اور احمدیہ ہال میں وقت دے دیا۔ظاہر تھا، ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی آمد تھی۔احمدیہ ہال کھچا کھچ بھر گیا۔

ڈاکٹر صاحب ٹھیک سیکنڈ کے حساب سے احمدیہ ہال تشریف لائے جبکہ ان کے ساتھ یہ طے تھا کہ ایک گھنٹہ کا وقت جو وہ دیں گے ہم اس کی پوری پابندی کریں گے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔اس موقعہ پر انہوں نے قرآن پاک کے علوم کی روشنی میں ایٹم کے بارے میں وقت کی ضرورت بیان فرمائی اور بتایا کہ آج کی دنیا میں ایندھن کے جو قدرتی ذخائر ہیں۔وہ اس قدر کم ہورہے ہیں کہ آئندہ آنے والے دور کے لئے یہ ایک مسئلہ بن سکتا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عین وقت پر انسان کی رہنمائی فرمادی جو پرامن ضروریات زندگی کے لئے وافر ایندھن کا خزینہ بننے والا تھا۔

اس کے علاوہ طلباء کومخاطب کرتے ہوئے خاص طور پر انگلستان کی یو نیورسٹیوں کے حوالہ سے بتایا کہ کس طرح وہاں درس تدریس اور امتحانات کے شیڈول بنتے ہیں اور کس سختی اور پابندی کے ساتھ ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے ،حادثاتی بات ہو، جنگ ہو، تاج پوشی ہو، امتحانات ملتوی نہیں ہوتے اور کرسیاں نہیں ٹوٹتیں۔ان کے آداب میں یہ سب باتیں ایسے شامل ہیں جیسے نصاب میں کتب ہوتی ہیں۔

لیجئے! ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کو پہلی بار ہم نے دیکھ لیا اور پالیا۔مگر قائدین کراچی کی تشنگی کی بھی انتہا نہیں تھی۔ان کے جی میں کیا آئی کہ مارٹن کے علاقہ میں فلاح وبہبود کے لئے مفت طبی سہولتوں کا مرکز کھول دیا اور ڈاکٹر صاحب سے فرمائش کر دی کہ تشریف لاویں۔ڈاکٹر صاحب یہاں بھی مان گئے اور تشریف لے آئے۔اس وقت کی تصویریں کراچی کی جماعت کے پاس موجود ہوں گی۔گھنی مونچھیں ، سیاہ فریم کا چشمہ، خوش لباس، خوش رو، بے تکلفانہ انداز گفتگو، سادگی اور خلوص، عجیب انسان تھے کہ آنکھیں دیکھے نہ تھکتی تھیں۔

1977ء کی بات ہے انگلستان میں جماعت نے صلیب کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔اس موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے ارشاد پر خاکسار کے والد بزرگوار سردار مصباح الدین صاحب بھی لندن تشریف لائے۔1922ء سے 1924ء تک وہ انگلستان کے مربی رہ چکے تھے۔اس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ لندن آئے تھے۔انہی دنوں مجھے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا پیغام ملا کہ میں اباجی کو ان کے گھر کھانے پر لے کر آؤں۔چنانچہ ان کے ساتھ گھنٹہ بھر نشست رہی اس دوران وہ اپنے والدین کی باتیں کرتے رہے۔اسی طرح اباجی سے بھی انہی کا ذکر خیر سنتے رہے۔

جب ہم رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے توجہ دلائی کہ بزرگوں کو کار کی اگلی

سیٹ پر نہ بٹھایا کریں پچھلی سیٹ پر بٹھایا کریں، زیادہ آرام رہتا ہے۔ سادہ سی بات تھی جس کے اندر بزرگوں کا احترام اور ان کے آرام کا مشورہ جھلکتا تھا۔ اس ملاقات کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے والد صاحب بزرگوار کا کس حد تک احترام کرتے ہیں اور مجھ سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔

والد صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے مابین دعا کا رشتہ تھا۔ جس کے لئے وہ کہتے بھی تھے، اور اپنی تحقیق اور مہمات کے ہر مرحلہ پر دعا کے لئے لکھتے بھی رہتے تھے۔ وہ دعا گو بزرگ تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان کا احترام اسی طرح کرتے تھے جس طرح اپنے والد صاحب کا کیا کرتے تھے۔ یہ تعلق ابا جی کے ساتھ ان کی زندگی تک رہا اور خوب نبھایا۔ ابھی جس روز ڈاکٹر صاحب کا لندن سے جنازہ اٹھا، اسی روز احمدیہ ٹیلی ویژن پر کراچی کے پرل کانٹینینٹل ہوٹل میں ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی خدمات اور کارہائے نمایاں کے اعتراف میں ایک عظیم الشان تقریب کی فلم دکھائی جا رہی تھی جس میں پاکستان کے سائنس میگزین کے معروف ایڈیٹر جناب قاسم محمود صاحب ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کے بارے میں اپنا خطبہ پڑھ رہے تھے۔ جس میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا، جس پر پوری مجلس مبہوت تھی کہ اس واقعہ کی تان کہاں جا کر ٹوٹے گی۔ جناب قاسم محمود صاحب نے کہا:

''ڈاکٹر صاحب کا لاہور سے ٹیلی فون آیا ہے۔ آپ میری بہن کے گھر پہنچ جائیں۔ پتہ آپ ان سے خود پوچھ لیں۔ گلیوں میں ایک مکان تھا۔ جس کے دروازہ پر ایک پردہ لٹک رہا تھا۔ کچھ مشتاق حضرات ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے لئے موجود تھے۔ جس کمرے میں ہم بیٹھے ہوئے تھے بیٹھک کہنا چاہئے جو ہمارے متوسط طبقہ میں ہوا کرتا ہے۔ دیواروں پر خوبصورت کلام الٰہی کے رنگین

طغرے آویزاں تھے۔ لیجئے ڈاکٹر صاحب کی سواری آ گئی ۔لیکن وہ وہاں بیٹھک میں نہیں آئے جہاں ہم سب بیٹھے ہوئے تھے، انہیں چپکے سے ساتھ والے بغلی کمرہ میں لیجایا گیا۔ دونوں کمروں کے درمیان جو کواڑ تھے بند تھے۔ پھر بھی ایک تھوڑی سی جھری رہ گئی تھی، خواہ مخواہ میری نظر اس طرف کو جمی ہوئی تھی ۔ایک اُونچی سی کرسی پر ایک بت رکھا ہوا تھا۔ سر پر پگڑی لمبی سفید داڑھی میں نے سوچا یہ بت مرزا صاحب کا ہی ہوسکتا ہے۔ میں نے دیکھا ڈاکٹر صاحب جھک کر اوتار کی قدم بوسی کر رہے ہیں۔ کسی نے کواڑ بند کر دیا اور میں خفیف سا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جو خیالات میں ڈاکٹر صاحب کے لئے رکھتا تھا، وہ اس بت پرستی سے بُری طرح متزلزل ہو گئے گو یا دنیا ہی بدل گئی۔

ڈاکٹر صاحب اپنی ہمشیرہ و بھانجیوں سے مل کر بیٹھک میں آئے۔ ان کی مہربانی کہ انہوں نے سب سے پہلے مجھے قریب بلایا۔ اگرچہ میں اندر سے گھلا ہوا تھا، میں نے جلدی سے اجازت لی اور وہاں سے اُٹھ آیا۔ میں نے وہ رات کانٹوں پر بسر کی۔ کتنا عظیم انسان جو بات بات پر قرآن مجید کے حوالے دیتا ہے، وہ بت پرست ہوسکتا ہے؟ سمجھ میں نہ آئے۔

دوسرے دن مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ان کی ہمشیرہ صاحبہ کو فون کیا وہ بہت خوش تھیں کہ ان کے بھائی جان نے غریب نوازی کی تھی اور عرصہ دراز کے بعد ان کے گھر آئے تھے۔ ورنہ پہلے باہر ہی باہر ہوٹلوں میں ٹھہر کر چلے جاتے تھے۔ کہنے لگیں کہ میرا بھائی بہت خوش خوراک ہے۔ میں نے ان کی پسند کی تینوں ڈشیں بنائی ہوئی تھیں۔لیکن آپ جلدی چلے گئے۔ میں نے جسارت کر لی

کہ بتائیں ہمارے کمرہ میں آنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب بغلی کمرہ میں کس کے پاس گئے تھے؟

کہنے لگیں یہ بہت ہی ذاتی بات ہے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ یہ ان کے آخری استاد ہیں جو بقید حیات ہیں باقی سب اللہ کو پیارے ہو گئے، کیا بتاؤں بھائی جان اپنے استادوں کی بہت عزت کرتے ہیں اتنی عزت کرتے ہیں کہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ یہ آخری استاد ہیں سکول کے زمانے کے، 80 - 85 برس کے تو ہوں گے۔ بھائی جان کو انہوں نے چھوٹی کلاسوں میں پڑھایا ہے۔ پتہ نہیں فارسی، عربی، تاریخ، یا جغرافیہ پڑھایا۔ مجھے معلوم نہیں پہلے وہ جھنگ میں رہتے تھے اور جب مصروفیت اجازت دیتی تھی تو ڈاکٹر صاحب ان کو ملنے کے لئے جھنگ چلے جاتے تھے۔ پھر مصروفیات زیادہ بڑھیں تو ان کو کراچی بلوا لیا اور کورنگی میں کوارٹر لے دیا۔ حسب توفیق خدمت کرتے رہتے ہیں اپنے استاد کی قدم بوسی کے لئے وہ خود کراچی آتے جاتے ہیں، ان کے پاس پیش ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن کل صبح ہی بھائی جان نے لاہور سے فون کیا تھا کہ میں ماسٹر صاحب کو کورنگی سے اپنے گھر ایسی گاڑی بھیج کر بلوا لوں جس میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اس لئے ہم نے گاڑی بھجوا کر انہیں بلوا لیا تھا لیکن وہ تو پانچ منٹ میں واپس چلے گئے تھے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں میرا بھائی انسان کے بھیس میں فرشتہ ہے فرشتہ۔''

اس مبہوت کن واقعہ کی حقیقت جب واضح ہوئی تو مدعوئین نے بھرپور تالیوں سے ڈاکٹر صاحب کی عظمت اور سعادت مندی کی داد دی۔ لیکن اس تاریخی واقعہ کا ایک راز بدستور پردہ میں ہے آج اس سے پردہ مَیں اُٹھا رہا ہوں۔

سفید پگڑی اور سفید داڑھی والے بزرگ جن کا اس واقعہ میں ذکر تھا۔ وہ اس عاجز کے والد بزرگوار سردار مصباح الدین صاحب تھے۔ ڈاکٹر صاحب اور اباجی کا آپس میں محبت و پیار کا جو تعلق تھا، اس کا ذکر شروع میں گزر چکا ہے۔ یہ اس پیار اور احترام کا آخر تھا جس کو میں کبھی بھی بیان نہ کر سکتا تھا لیکن باہر سے ایک شخصیت نے جو دیکھا اور محسوس کیا وہ ڈاکٹر صاحب کے اوصاف حمیدہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے کہ کس طرح وہ اپنے بزرگوں اور استادوں کی قدر اور عزت کیا کرتے تھے۔ دراصل والد صاحب مکرم ڈاکٹر صاحب کے استاد نہیں تھے۔ وہ تو مربی انگلستان رہے اور جامعہ کے استاد تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے والد مکرم چودھری محمد حسین صاحب کے ساتھ چونکہ ان کا بھائی بند کا رشتہ تھا۔ اس لئے وہ اسی ناتے ان کو بھی اپنے باپ کے درجہ پر رکھتے تھے۔ اسی طرح پیار کرتے تھے۔

جناب قاسم محمود صاحب نے جس رنگ میں ڈاکٹر صاحب کی ان کے لئے عقیدت اور احترام کو بت پرستی کرتے ہوئے دکھایا حقیقت میں ویسا نہیں تھا جیسا کہ ان کی نظروں نے دیکھا اور محسوس کیا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ میرے والد صاحب ہمیشہ ربوہ میں نماز جمعہ ادا کیا کرتے تھے۔ ایک جمعہ وہ سائیکل سے گر گئے ان کے کولہے کی ہڈی اس بری طرح ٹوٹ گئی کہ باوجود آپریشن کے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے اور ویل چیئر استعمال کرنے لگے بعد میں سہولت کے پیش نظر اپنے بڑے بیٹے عبدالسبحان کے پاس کورنگی میں منتقل ہو گئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب ان کی بہت خبر گیری فرماتے یہاں تک کہ کراچی کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹر صاحب نے ہی ان کا علاج بھی کروایا اس طرح یہ خدمت کا سلسلہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس عمر میں ان کی یہ حالت تھی کہ پکڑ کر بھی کھڑا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کانوں کی شنوائی بری طرح متاثر تھی۔ کان کے ساتھ

لگ کر ہی بات ہوسکتی تھی۔ وہ بھی مشکل کے ساتھ اُن کی اس کیفیت کو مدنظر رکھیں۔ کیونکہ مَیں اس کواڑ کو پورے طور پر کھول رہا ہوں جس کی بقول قاسم محمود صاحب تھوڑی سی جھری رہ گئی تھی۔

ابا جی ایسی وھیل چیئر پر تھے جو اونچی سطح کی تھی، وہ ہمیشہ سفید پگڑی پہنتے تھے اور سفید داڑھی، سفید ہی شلوار قمیص۔ ڈاکٹر صاحب جو انتہائی مصروفیت کے عالم میں تھے اور کسی اگلی ہی فلائیٹ سے واپس جانے والے تھے۔ ان کی یہ سعادت مندی کی انتہاء تھی کہ انہوں نے اپنے اس مہمان کو پہلے ملنا پسند فرمایا تا کہ چند ساعت ہی سہی وہ ان سے مل سکیں۔ یہ ان کی زندگی میں ڈاکٹر صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ جس کے لئے ڈاکٹر صاحب کو یقیناً مکمل جھکنا پڑا اور کانوں کے قریب تک آنا پڑا تا کہ وہ ان کی خیریت معلوم کرسکیں۔ یہ وہ نظارہ تھا جس کو ایک اجنبی نے ایک چھوٹی سی جھری سے دیکھا اور بقول اُن کے اندر سے کُھل گیا۔

دراصل اپنے بزرگوں کا احترام ڈاکٹر صاحب کی گھٹی میں تھا۔ خاص طور پر اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک اور پیار میں وہ ایک نمونہ تھے۔ اسی کا تذکرہ ذکر خیر کے طور پر حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی وفات پر فرمایا تھا کہ عزت و احترام کے تمام تقاضے ڈاکٹر صاحب اس طرح پورے فرماتے کہ میں حیران رہ جاتا۔

اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔ کروٹ کروٹ ان کی روح کو تسکین نصیب ہو۔ مولیٰ جانے! اس وجود نے جب اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی ہوگی تو وہ کن کن اداؤں سے پیش ہوا ہوگا؟

(روزنامہ الفضل ربوہ 15 جنوری 1997ء)

○○

مکرم سیّد سخاوت شاہ صاحب مرحوم

مکرم سید سخاوت شاہ صاحب بفا ہزارہ کے رہنے والے ایک دیندار گھرانے کے فرد تھے۔ ان کے والد بہت سادہ کھرے اور اللہ لوگ انسان تھے۔ سیّد سخاوت شاہ صاحب کو بچپن سے ہی دینی تعلیم کا شغف تھا۔ احمدیت سے قبل اپنے آبائی گاؤں کی ایک مسجد سے ان کا دل اٹکا ہوا تھا۔ یہ مسجد مولوی غلام غوث ہزاروی کی مسجد کہلاتی تھی۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1953ء میں سید سخاوت شاہ صاحب کو پشاور جانے کا موقع ملا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ سال بہت ہنگامہ خیز تھا۔ یہ وہ ہنگامہ خیز دور تھا، جس میں سید سخاوت شاہ تعلیم اور ملازمت کی خواہش لیکر پشاور نکل آئے۔ کون نہیں جانتا یہ ہنگامے ہمیشہ ہی جماعت کے لئے خیر و برکت کا موجب ہوئے ہیں۔ عوام الناس جن کو پہلے احمدیت کی خبر نہیں ہوتی وہ بھی ان ہنگاموں کے حوالہ سے احمدیت کا نام جان لیتے ہیں۔ اس طرح سنجیدہ طبع لوگوں اور نیک خصائل رکھنے والوں کے لئے احمدیت تک پہنچنے کے لئے ایک پھاٹک کھل جاتا ہے۔

انہی حالات میں سید سخاوت شاہ صاحب کے کان بھی احمدیت سے آشنا ہوئے۔ نیک

طبع تھے، دیندار تھے، مخلص تھے، تعلیم کا شوق تھا۔ اس لئے احمدیت کے بارے میں جستجو کا شوق بڑھا سب سے ضروری بات جس کی طرف ان کی فراست نے رہنمائی کی وہ یہ رجحان تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اصل کتب کو دیکھا جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک کتاب غالباً براہین احمدیہ حاصل کر لی۔

مجھے خوب یاد ہے کہنے لگے کہ جب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب پڑھنے لگا تو جہاں جہاں مجھے فقرات اپنے عقائد اور مزاج سے ہٹ کر نظر آتے، وہاں طبیعت میں ایک جوش اٹھتا تھا، غصہ آتا تھا۔ یہ تھا سید سخاوت شاہ صاحب کے ابتدائی ذوق جستجو کا انداز اور سلیقہ، یہی سلیقہ بالآخر ان پر اپنا جادو کر گیا۔ فسادات کی جس بھٹی سے انگارے نکل رہے تھے، یہ دیکھتے ہوئے بھی اس میں کود گئے اور جب کود ے تو یہ آگ ان کے لئے گلزار ہو گئی۔ اب ادھر اُدھر دیکھا تو خود کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جماعت میں پایا۔

ظاہر ہے جب یہ خبر بفا کی وادی میں پہنچی تو مخالفت کا ایک طوفان اُٹھا کہ ان کے لئے واپس اپنے گاؤں جانا مشکل ہو گیا۔ ان حالات میں تلاش معاش اور نئی زندگی شروع کرنے کے لئے انہوں نے کراچی کا سفر اختیار کیا۔ سید سخاوت شاہ صاحب کی اپنے گھر میں بھی شدت کے ساتھ مخالفت ہوئی جس طرح گاؤں میں ہوئی ۔ سبھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے بلکہ قتل کے در پے ہوئے ۔ مجھے یاد ہے جب ان کی شادی ہوئی تو میں پشاور میں تھا، مجھے خاص طور پر دعوت بھجوائی اس وقت ان کے گھر کے افراد نے کسی حد تک تعاون کیا اور شادی کی تقریب بفا میں ہوئی ۔ میں جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ شادی کی تقریب میں شامل ہونے والے سبھی لوگ حفاظتی انتظامات سے لیس ہو کر آئے ہوئے تھے۔

سید سخاوت شاہ صاحب جب پشاور سے کراچی آئے تو اس شہر میں اجنبی تھے۔ پھر

جماعت میں بھی اجنبی تھے لیکن اس ہونہار نوجوان نے بہت جلد اس اجنبیت کو ختم کر دیا جماعت کے ساتھ تعلق قائم کیا۔ جماعت کے کارکنان کے ساتھ رابطہ ہوا۔ اس رابطہ کے حوالہ سے وہ مجھ سے بھی روشناس ہوئے اور ایسے روشناس ہوئے کہ وہ دل میں بس گئے۔ ساتھ مل کر جماعتی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمیں اخلاص، قربانی، علمیت، نیکی، تقویٰ اور انتظام میں بہت پیچھے چھوڑ گئے۔ اس طرح وہ سیکرٹری اصلاح وارشاد کے طور پر اپنی صلاحیتوں کو سامنے لانے کا موجب ہوئے۔

انہوں نے کراچی کے علمی حلقوں میں جا کر اصلاح وارشاد کے ذرائع تلاش کئے۔ بڑے بڑے اجتماعات کئے۔ سیرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جلسے کئے غرضیکہ ایک کامیاب داعی الی اللہ بن گئے۔ شدید مخالفت کے دور میں احمدیت قبول کرنے والا یہ نوجوان جماعت میں تن من دھن لیکر مدغم ہو گیا۔ مالی قربانی کا معاملہ ہو، اشیاء کی قربانی، وقت کی قربانی، جان کی قربانی غرضیکہ ہر قربانی کے لئے ہمہ تن آمادہ شخصیت تھے۔

شروع شروع میں کراچی میں روزگار کا معاملہ ان کے لئے کافی پریشانی کا موجب بھی رہا، لیکن انہوں نے اپنے وقت کی قدر کی اور تعلیم کو آگے بڑھایا اور قانون کی ڈگری حاصل کر لی اور ایڈووکیٹ کی حیثیت سے میدان میں نکل آئے۔ ابتدائی ایام میں جب کہ ابھی اس پیشہ میں قدم پختہ نہیں ہوئے تھے۔ گزشتہ روزگار کی بچی کھچی پونجی ختم تھی۔

انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ صبح جب گھر سے نکلا تو بچوں نے شام تک کچھ لانے کی یاد دہانی کرادی۔ اس خیال سے اپنے بینک سے معلوم کیا کہ وہاں کچھ باقی بھی ہے یا نہیں، ہزار روپیہ کے اندر اندر کچھ رقم پڑی تھی۔ گھر جانے سے پہلے حسب معمول احمدیہ ہال سے گزرے تو وہاں سیکرٹری مال کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا۔ باتوں باتوں میں وصیت کے چندہ کا حساب

معلوم کر لیا۔ پتہ چلا کہ کم و بیش اتنی ہی رقم واجب الادا ہے جتنی ابھی ابھی بینک سے معلوم کر کے آئے تھے۔ اسی وقت جیب سے چیک بک نکالی اور وصیت کا پورا چندہ ادا کر دیا۔

واپس جب گھر پہنچے تو اپنی بیوی سے ماجرا کہہ دیا۔ وہ بھی صابرہ تھیں خاموش رہیں کہ چلو اچھا ہوا۔ سخاوت شاہ صاحب نے بتایا کہ اگلے روز ہی یا ایک دو روز میں ایک بڑی پارٹی سے ان کا معاہدہ ہو گیا۔ جسکا معاوضہ ہزاروں روپے کا تھا اور ایک کثیر رقم انہوں نے نقد بھی ادا کر دی۔ یہ اللہ تعالیٰ نے انہیں توکل کا پھل عطا کیا۔

سید سخاوت شاہ صاحب کو مطالعہ کا بہت شوق تھا اور اپنے اس شوق کو کتب خرید کر پورا کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس ان کی ذاتی لائبریری تھی جس میں کثیر تعداد میں نایاب کتب موجود تھیں۔ یہی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ اور ان کے شوق کا حصہ تھا۔ سید سخاوت شاہ صاحب کی شخصیت میں دینداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ فراست رکھتے تھے، علم دوست تھے، زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ رکھتے تھے۔ سماجی کاموں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ ساری خوبیاں ایسی تھیں جو انہیں ایک وقت سیاست میں بھی لے گئیں۔ انہوں نے اپنی استعداد کے مطابق مرکزی قیادت کے ساتھ مل کر پاکستان کے عوام کی بھرپور خدمت کی۔ قومی وقار کو مقدم رکھا۔ جماعتی اقدار کی حفاظت کی اپنے اصولوں کو ٹھیس نہ لگنے دی۔ بالآخر جب ہواؤں کے رخ بدلنے لگے تو وہیں سے لوٹ آئے اور دوبارہ مڑ کر بھی نہیں دیکھا، نیکی اور تقویٰ کو ہی اپنا شعار بنایا، کسی کی پرواہ نہ کی، کسی شخصیت سے مرعوب نہ ہوئے، سید سخاوت شاہ صاحب زندگی کے آخری حصہ میں جماعت کراچی کے وصایا کے نظام سے بھی وابستہ تھے۔ اسی طرح وہ جماعتی خدمت پر کمربستہ رہے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد بھی عطا کی۔ تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نیک

صالح بنائے۔سید سخاوت شاہ 20 جنوری 1994ء کو کراچی میں حرکت قلب بند ہوجانے سے وفات پا گئے اور بہشتی مقبرہ ربوہ میں مدفون ہوئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ نے 21 جنوری 1994ء کو نماز جمعہ کے بعد مسجد فضل لندن میں نماز جنازہ غائب پڑھائی۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔آمین۔

(روزنامہ الفضل ربوہ 19 مارچ 1994ء)

○○

محترم ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب

پشاور کے مکرم خواص خان صاحب کے بیٹے ڈاکٹر سعید احمد خان صاحب 1996ء کے آخر میں اس جہاں سے کوچ کر گئے۔ کینسر جیسی موذی مرض کا شکار ہوئے۔ ظاہری حیلے سب جاتے رہے لیکن اللہ تعالیٰ کے رحم کا وسیلہ ان کی زبان پر تا دم حیات جاری رہا۔ ڈاکٹر صاحب بہت نیک دل انسان تھے۔ گفتگو میں دھیما پن تھا۔ دینی تعلیم پر چلنے کے لئے قدم مارنے والے وجود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گھر میں ایک مخلص بی بی سلمہ مبارکہ خان کا ساتھ دے رکھا تھا۔ صائب رائے رکھنے والی خاتون ہیں۔ جماعت برطانیہ کی شوریٰ ہو، یا عالمی شوریٰ دونوں میں میاں بیوی کے نام رائے دہندگان کی فہرست میں ہوتے تھے۔

ڈاکٹر سعید خان صاحب سے میری شناسائی 1954ء سے تھی جب پشاور سے کراچی ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے آئے اور احمدیہ ہال میں ٹھہرے۔ قصہ خوانی سے نکل کر آنے والے نوجوان کے لئے کراچی ہزار داستان سے کم نہ تھی۔ خاکسار اپنے ساتھی عبدالمجید بٹ سمیت ان دنوں احمدیہ ہال میں مقیم تھا اور ہم چھت پر رہا کرتے تھے۔ مقامی جماعت نے اس نئے مہمان کو ہماری مہمان نوازی میں دے دیا۔ لیکن جلد ہی مکرم میاں محمد طاہر صاحب، جو امریکہ میں ڈاکٹر ہیں اور ان دنوں میڈکل کے آخری سال میں تھے، اُن کی کوشش سے ہوسٹل میں جگہ

مل گئی۔ چنانچہ ہم مکرم سعید احمد خان صاحب کو اس ہوسٹل میں چھوڑ آئے۔ جہاں سے جب انسان باہر آتا ہے تو گردوپیش بھول چکا ہوتا ہے۔اس کے پاس فقط امراض کی جان پہچان ہی باقی رہ گئی ہوتی ہے۔ پھر خدا جانے وہ کب ڈاکٹر بنے اور کہاں کہاں گئے۔ ہاں اس مہمان کی خاموش طبعی، سادگی اور دینداری کا تاثر ضرور قائم رہا جس نے ہمارے دل میں پشاوریوں کے لئے بہت خوبصورت جگہ بنالی تھی۔

حسن اتفاق کہ زمانہ ہمیں بھی پشاور لے گیا۔اس دوران ڈاکٹر صاحب کے والد بزرگوار خواص خان صاحب سے جماعتی تعلق سے ملاپ تو رہا لیکن کبھی یہ خیال نہ آیا کہ ان کے صاحبزادہ ایک وقت میں ہمارے ہاں کراچی میں مہمان ہوئے تھے۔ یہ بات اس وقت سامنے آئی جب ڈاکٹر سعید احمد صاحب سے انگلستان میں ملاقات ہوئی۔ پرانی یادیں ابھر کر سامنے آ گئیں۔انہیں بھی یاد تھا۔ بلا شبہ یوں لگا گردش ایام نے پیچھے کی طرف دوڑ کر ہمیں آپس میں ملا دیا ہے۔ذکر خیر کے طور پر یہی کہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب بہت جلد جلد بڑھے۔ جماعت کی بھرپور خدمت کی سعادت پائی۔ انگلستان میں نارتھ کے علاقہ کے امیر رہے۔ بہتوں کو پیغام حق پہنچایا۔اور امام جماعت کی جماعت میں ان کی شمولیت کا واسطہ بنے۔اُن کی اہلیہ بھی اس مہم میں ان کی برابر کی شریک رہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے علاوہ مالی، قولی، عملی غرضکہ سب راستوں سے رفاہ عامہ کے کاموں میں حصہ لیا۔ افریقہ کے ملکوں کے نادار مریضوں کا متعدد بار ان ملکوں میں جا کر علاج کیا اور اپنے وسائل سے ادویات بہم پہنچائیں۔حرف آخر یہی ہے لبوں پر دعائیں سجا کر رکھنے والے نافع وجود تھے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ 23 جنوری 1997ء)

OO

نوبت خانہ کی ریکارڈنگ-ایک تاریخی یادداشت

سال 1953ء جماعت احمدیہ کی تاریخ میں ہنگاموں سے پُر تھا۔ احمدیت کے خلاف کئی طوفان اُٹھائے گئے۔ ان کے بالمقابل ''نئے جوش'' نئے ولولوں کی تہوں میں یقین سے بھرے ہوئے پُرسکون دھارے اپنی ہی رو میں تھے۔ کون تھا جو اُنہیں تھام سکتا؟ ادھر ربوہ کی بستی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس پیش خبری کا منظر پیش کررہی تھی:

''اور دور دور کی زمین سے تیرے پاس لوگ آئیں گے کہ راستے میں گڑھے پڑ جائیں گے۔'' (تذکرہ-صفحہ 57-الہام مارچ1882)

28 دسمبر 1953ء کی سہ پہر تھی اور 42 ہزار مخلصین کا پرشوکت جم غفیر مکمل سکوت میں گم تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی پُرجلال آواز سیر روحانی کے موضوع پر نوبت خانوں کی تھاپ کے ساتھ گونج رہی تھی۔ دینی نعروں کی پرعظمت تکرار جلوے دکھارہی تھی یہ سب صدائیں جلسہ گاہ کے بالمقابل پہاڑ سے ٹکرا کر جب واپس لوٹتی تھیں تو گونج کی صورت میں لوٹ پوٹ ہوجاتیں تھیں۔ آخر خدا کی ''نوبت'' تھی جو آسمانی بادشاہت کے موسیقاروں کے حوالے کی جارہی تھی۔ نوبت پر ضرب پڑتی تھی تو اس کی تال سے کان پھٹتے تھے۔

پہاڑوں کے دل لرزتے تھے۔اس تجربہ سے وہی نفوس محظوظ ہو سکتے تھے۔جو اس وقت جلسہ گاہ میں موجود تھے۔

یہ پر جلال خطاب آج جماعت کے پاس آڈیو کیسٹ پر محفوظ ہے۔یہ ہم تک آڈیو کیسٹ کی صورت میں کیسے پہنچا؟اس حصے کا تاریخی پس منظر اس وقت میرے سامنے ہے جس کو قارئین الفضل تک پہنچانے اور تاریخ میں محفوظ کرنے کے لئے یہ چند لفظ تحریر کر رہا ہوں۔

اس تاریخی جلسہ کے اختتام کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے دفتر والوں سے دریافت فرمایا کہ کیا انہوں نے آپؓ کے اس خطاب کو آڈیو پر محفوظ کیا ہے؟ جواب نفی میں ملا۔ حیرت تھی،تحریک جدید انجمن احمدیہ کے پاس اس وقت ریکارڈ کے لئے دو مشینیں موجود تھیں۔ اس کے باوجود یہ تقریر ریکارڈ نہ ہو سکی۔ایسی صورت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کو کس قدر دکھ اور صدمہ ہوا ہوگا،خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ساری سہولتیں میسر ہونے کے باوجود یہ کوتاہی سرزد ہو چکی تھی۔اسوقت اس کی وجہ یہی بیان ہوئی کہ ریکارڈنگ کے لئے ایک مشین جلسہ گاہ میں موجود تھی،لیکن اس مشین کی خرابی کی وجہ سے ریکارڈنگ نہ ہو سکی اور دوسری مشین جو درست حالت میں تھی اس کو فوری طور پر مہیا نہ کیا جا سکا یا اس کو استعمال میں لانے میں کوئی دشواری پیش آئی۔ہر صورت میں کوتاہی عیاں تھی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے مزید دریافت فرمایا کہ باہر سے کسی دوست نے اس خطاب کو ریکارڈ کیا؟ تو معلوم ہوا کہ بورنیو سے مکرم ڈاکٹر بدرالدین صاحب نے اپنی مشین پر محفوظ کیا تھا اور وہ ربوہ سے کراچی جا چکے ہیں اور ایک دو روز میں ان کا جہاز بورنیو کے لئے روانہ ہونے والا ہے۔حضرت صاحبؓ کے علم میں جب یہ بات آئی تو دفتر کے ایک کارکن کو

(نام راقم کو یاد نہیں) فوری طور پر ریل گاڑی سے کارآمد مشین کے ساتھ کراچی بھجوایا کہ جاؤ اور بحری جہاز کے چھوٹنے سے پہلے پہلے ڈاکٹر بدرالدین صاحب کو پکڑو۔

چنانچہ وہ دوست کراچی تشریف لائے تو مکرم ڈاکٹر بدرالدین صاحب رخت سفر باندھ رہے تھے (اب تو اس دنیا سے رخت سفر باندھے بھی انہیں مدتیں گزر گئیں) مکرم ڈاکٹر صاحب کا بحری جہاز اگلی شام کو بندرگاہ چھوڑ رہا تھا۔جس پر ان کا سفر کرنا ضروری تھا۔ورنہ اگلے جہاز کے لئے 4-3 ماہ کراچی میں انتظار کرنا پڑتا۔بہرحال دفتر کے اس کارکن نے ڈاکٹر بدرالدین صاحب کو آلیا، جبکہ وہ احمدیہ ہال میں مہمان تھے۔ان کے پاس پچھلا پہراور رات ہی باقی تھی۔اس میں انہوں نے احمدیہ ہال کی اوپر کی گیلری میں اپنی مشین کو لگایا۔اس طرح یہ معرکتہ الآراء خطاب دفتر ربوہ کی مشین پر رات بھر میں منتقل ہوا۔یہ عاجز بھی ان دنوں احمدیہ ہال میں مقیم تھا۔اس لئے مکرم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ریکارڈنگ کے دوران موجود رہا اور ضرورت کے مطابق مدد بھی کی۔اسی واسطہ سے یہ عاجز اس واقعہ کا شاہد ہے اگر ایسا نہ ہوسکتا تو آئندہ آنے والی نسلیں اس عظیم الشان ولولہ انگیز خطاب کو اپنے کانوں سے سننے سے محروم رہ جاتیں۔الفضل ربوہ کے توسط سے اس تاریخی حقیقت کو رقم کر رہا ہوں کہ اس خطاب کی اصل (ماسٹر کاپی) مکرم ڈاکٹر بدرالدین صاحب کے پاس تھی۔خدا تعالیٰ کرے کہ ان کے ورثاء کے پاس اب بھی محفوظ ہو۔

(روزنامہ الفضل ربوہ۔11 مارچ 1997ء)

○○

مکرم چودھری حمید احمد صاحب لائل پوری

حمید لائل پوری کسی اعلیٰ مدرسے کا فارغ التحصیل نہ تھا۔ نہ وہ شاعر تھا، نہ ادیب، مگر ایک ایسا شخص تھا جس میں بلا کی گرمی تھی۔ یا یہ کہہ لیجئے وہ کتب سلسلہ کے مطالعہ کے بعد سیروا فی الارض پر عامل تھا۔ اس بل بوتے پر مجلس میں ہر سطح کی گفتگو کو آگے بڑھا سکتا تھا۔ مختلف طبقات کے اہل علم حضرات کی مجالس میں اپنے عقائد سینے پر سجا کر پہنچ جاتا اور جہاں ضرورت محسوس کرتا حق کی بات کہنے سے نہ ہچکچاتا۔ یہ وہ طاقت ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی اُس شخص کو عطا ہوتی ہے جو اپنے عقائد، اپنے اصولوں کو خود بھی عقل وفہم کی کسوٹی پر پرکھنے کا گر جانتا ہو۔

انگلستان میں وہ ساؤتھ آل کے قہوہ خانوں اور ہوٹلوں کی رونق تھا۔ پکوانوں سے بھری میزوں پر مجالس سجانا اس کا معمول تھا۔ من وسلویٰ کی مہک اور گرمی اس کی کمزوری تھی۔ اس کمزوری کو اس نے اس لئے سینے سے لگا رکھا تھا کہ وہ اس طریق سے دینی گفتگو کے لئے اپنی لگن پوری کر سکتا تھا۔ بات چیت کی شروعات کے لئے اسے کسی بہانہ کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی موقع تلاش کیا کرتا تھا، بلکہ موقع تو اسے خود ڈھونڈ لیا کرتا تھا۔ وہ سماع کی مجلسوں میں بھی

گیا۔ خوش گلوؤں کی مجلس میں بھی بیٹھا مگر اسی حد تک جس حد تک ان کا فن اسے مطمئن کردے۔

بہت دل گردے کا انسان تھا۔ چار مرتبہ جراحت قلب کے مراحل سے گزر چکا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے میں اس کا دل زیادہ دیر دھڑکنے کے قابل نہ رہا تھا۔لہٰذا وہ مشورہ دیتے تھے کہ کہیں سے مستعار لیا جائے۔ ایک بار تو ہسپتال سے باقاعدہ پیشکش بھی ہوگئی، اس کے لئے بستر بھی لگ گیا لیکن اس پیشکش کو وہ ٹال گیا کہ اسے کسی اور کا دل نہیں چاہئے تھا۔ وہ اپنے ہی دل سے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ بہت خوددار انسان تھا۔ اس نے بہتوں کو گرتے ہوئے تھاما۔ مگر زندگی میں جب کبھی خود گرا تو اس کی خودی نے بفضلہٖ تعالیٰ اسے کھڑا کیا۔ ٹال مٹول کرنا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔ جو بات کہہ دی وہ کردی۔ جس کو آج کہہ دیا اسے آج ہی سمجھا۔

جہاں تک جماعت کے کاموں کا تعلق ہے۔ اس جگہ بھی وہ ہمیں گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ مکرم عطاء المجیب راشد صاحب انچارج مشن ہاؤس لندن، جب بھی سفر پر جاتے، حمید لائل پوری ان کے ہمراہ ہوتا۔ بہت شوق سے ڈرائیو کرتا۔ ان سفروں میں جہاں قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا۔ وہاں وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے جید عالم کی صحبت سے بھرپور فائدہ اُٹھاتا۔ مختلف مسائل پر کھل کر بات کرتا، استفسار کرتا۔ جلسہ سالانہ کے ایام میں بھی مرکزی علماء کے انتظار میں رہتا اور اُن کو گھمانے پھرانے کی خدمت اپنے لئے مخصوص کروا لیتا۔ بس اُسے ایک شوق تھا، ایک جنون تھا کہ وہ سب سے ملے، کچھ اپنی کہے کچھ اُن کی سُنے۔

ایک مرتبہ جماعتی اخبارات اور رسائل کی خریداری بڑھانے کا کام بھی اس کے سپرد ہوا۔ جس کے لئے اس نے ایک ماہ کا وقفِ عارضی کیا اور تمام جماعتوں میں گھوم پھر کر بہت سے

نئے خریدار فراہم کئے۔

یورپ کے ممالک میں جہاں کہیں بھی اہم تقریبات ہوتیں وہ ہسپتال میں اپنی ضروری حاضریوں کو ملتوی کر کے وہاں پہنچ جاتا۔ قادیان کے جلسہ سالانہ میں شمولیت کا معمول بھی ساتھ ساتھ رکھا۔ جب بھی اس شوق نے انگڑائی لی، سب کام چھوڑ چھاڑ کر رخت سفر باندھ لیا۔ وہ جہاں کہیں بھی گیا اس نے خود کو اپنے آپ میں نہیں رکھا اور نہ ہی ان سفروں کو محض تفریح کا موجب سمجھا بلکہ اپنے پروگرام میں جماعت کے دوستوں سے ملنا ملانا ہی اصل مقصد تھا جو اس کے پیش نظر رہتا۔ وہ ان میں بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتا، ان کے ساتھ کھاتا، ان کے ساتھ گھومتا اور اپنے دل کے زنگ اتارا کرتا۔

ایک اور تاریخی تقریب کا ذکر بھی اس کی زندگی کا حصہ ہے۔ مکرم پروفیسر ڈاکٹر عبد السلام صاحب اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے رکھے، اُن کو جب نوبل انعام ملنے والا تھا، اس سے ایک ہفتہ قبل حمید لائل پوری نے خواب میں دیکھا کہ ٹیلی ویژن پر اعلان ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر عبد السلام صاحب کو نوبل انعام دیا گیا ہے۔ اس نے فی الفور بیگم صاحبہ ڈاکٹر عبد السلام صاحب کو ٹیلیفون پر اطلاع کر دی۔ بعد میں مکرم ڈاکٹر صاحب کو بھی اس کا علم ہوا کہ حمید لائل پوری نے ایسا خواب دیکھا ہے جو پورا بھی ہو گیا ہے تو حمید لائل پوری کی اس خواہش پر کہ وہ بھی انعام پانے والی تقریب میں شامل ہونا چاہتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے اسے مدعو کر لیا۔ اس طرح سویڈن میں جب کہ ڈاکٹر عبد السلام صاحب انعام پانے کی شاہی تقریب میں شامل ہوئے تو اس میں بھی حمید لائل پوری کو شمولیت کا موقع ملا۔ کس شان کے وہ شوق رکھتا تھا، کون سوچ سکتا ہے۔

ربوہ اور قادیان کی بستیوں سے اسے دلی لگاؤ تھا، والہانہ عشق تھا۔ وہاں کے غرباء و

مساکین پر نظر رکھتا، ان کی خبر گیری کرتا، ان کے غم بانٹتا۔ اگر کوئی چھابڑی والا اس کی توجہ کھینچ لیتا تو بلاضرورت اس کا سارا سودا خرید لیتا اور آس پاس بانٹ دیتا۔ منافقت اور غلط روی کے خلاف وہ سینہ تان کر رکھتا۔ صاف صاف چلنے والے کے لئے اس کی جان ہمیشہ ہتھیلی پر رہتی۔ مگر جہاں کوئی چوکا، وہاں دوستی اور تعلق کو ایک طرف رکھ دیا۔

انگلستان، ربوہ، قادیان اور ہندوستان کی دور دیش جماعتوں میں جانا پہچانا چودھری عبدالحمید لائل پوری ابن مکرم چودھری غلام حسین صاحب اوورسیئر مورخہ 19 مارچ 1996ء کو ریڈنگ ہسپتال (انگلینڈ) میں انتقال کر گیا۔ حضرت صاحبؒ ان دنوں انگلستان سے باہر تھے۔ ارشاد موصول ہو چکا تھا کہ جنازہ میں دیر نہیں ہونی چاہئے اس لئے انتظار نہ کیا جائے۔ چنانچہ 21 مارچ کو مولانا عطاء المجیب راشد صاحب امام بیت الفضل لندن نے جنازہ پڑھایا اور بروک وڈ احمدیہ قبرستان میں تدفین کے بعد مکرم ملک محمد اکرم صاحب ریجنل مشنری مانچسٹر نے دعا کروائی۔

دل کے اس جان لیوا حملہ کے بعد جب حمید لائل پوری کو ہسپتال میں لیجایا گیا تو جیسے ہی چند لمحوں کے لئے آنکھ کھلی تو اپنی اہلیہ بشریٰ حمید سے کہا کہ حضرت صاحبؒ کی خدمت میں درخواست کر دینا میرا جنازہ جمعہ کے روز پڑھاویں۔ پھر دوبارہ پوچھا کہ اطلاع کر دی ہے۔ یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ مورخہ 28 مارچ کو اس درخواست کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے جمعہ کے روز جنازہ غائب کی فہرست میں اس کا بھی ذکر فرمایا اور بعد نماز جمعہ وعصر جنازہ غائب پڑھایا۔ اللہ تعالیٰ اسے مغفرت کی چادر میں ڈھانپ لے۔ آمین۔

(روزنامہ الفضل ربوہ۔ 24/اپریل 1996ء)

○○

جلسہ سالانہ کی مختصر تاریخ

برطانیہ سے شائع ہونے والے احمدیہ بلٹن کے جولائی، اگست 1989ء کے شمارے میں مکرم بشیر الدین احمد صاحب سامی نے جلسہ سالانہ کی مختصر تاریخ کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے۔ آغاز میں انہوں نے حضرت مسیح موعودؑ کے الفاظ میں (اردو سے انگریزی میں ترجمہ کر کے) جلسہ سالانہ کے اغراض و مقاصد تحریر کئے ہیں اور ان کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے الفاظ میں جلسہ سالانہ کی غرض بیان کی ہے۔ حضورؒ نے فرمایا ہے کہ اس جلسے کی سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ ایسے اقدام سوچے جائیں اور ایسے کاموں کا آغاز کیا جائے جن سے انسانیت کو اپنے آقا خداوند تعالیٰ سے ایک دلی تعلق پیدا ہو جائے۔

1891ء میں حضرت مسیح موعودؑ نے اپنے پیروکاروں کو دعوت دی کہ وہ قادیان آ کر تین روز مذہبی اجتماع میں شرکت کریں۔ اس موقع پر ۷۵/افراد نے شرکت کی اور یہ پہلا جلسہ سالانہ کہلایا۔ حضرت اقدسؑ نے اس اجتماع سے خود خطاب فرمایا اور اس میں اسلام کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت فرمائی یہ موقع اتنا بابرکت ثابت ہوا کہ آج تک اس موقع کی طرح کے جلسہ سالانہ منعقد ہوتے چلے آرہے ہیں۔ قادیان میں بھی اور پھر ربوہ میں بھی ایسے جلسے دنیا

کے مختلف ممالک میں منعقد کئے جاتے ہیں۔ ربوہ میں جواب تک کا آخری جلسہ منعقد ہوا اس میں شرکت کرنے کے لئے ۳لاکھ سے بھی کسی قدر زیادہ افراد تشریف لائے۔ یہ جلسہ 1983ء کے دسمبر میں منعقد کیا گیا۔اس کے بعد سے تو اب تک پاکستان میں تو پابندی ہے لیکن برطانیہ کے جلسوں کی رونق بڑھ گئی ہے۔

جب حضورؒ برطانیہ تشریف لے گئے تو پہلا جلسہ 25اور 26 اگست 1984ء کو منعقد کیا گیا۔ یہ برطانیہ کی جماعت کا 18 واں سالانہ جلسہ تھااور اس موقع پر احمدیہ جماعت کے تین ہزار افراد شرکت کے لئے تشریف لائے۔ یہ جلسہ Tolworth Recreation Centre Surrey میں منعقد کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس کا پروگرام تو حضورؒ کی برطانیہ میں تشریف آوری سے پہلے ہی مرتب کرلیا گیا تھا لیکن جماعت کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اس جلسے کی اختتامی تقریر فرمائی۔ یہ انگلستان کا اُنیسواں جلسہ سالانہ تھا جو کہ مورخہ 5-6-7اپریل 1985ءکو نئے یورپین سینٹر اسلام آباد سرے میں منعقد کیا گیا۔ یہ جلسہ اس وقت کے تمام جلسوں سے، (جو انگلستان میں منعقد کئے گئے تھے) سب سے بڑا تصور کیا جاتا ہے۔

دراصل حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی موجودگی نے احمدیوں کو دنیا کے تمام حصوں سے شرکت کے لئے وہاں جانے کا جذبہ پیدا کر دیا۔4500افراد نے 48 ممالک سے اس میں شرکت کی۔ باوجود یکہ اس جلسے کے دوران سردی بھی بہت تھی اور بارش بھی ہوتی رہی، تینوں دن جلسے کی حاضری پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ سب لوگ صرف اس بات کے خواہاں تھے وہ جلسہ گاہ میں بیٹھے رہیں اور حضورؒ کے خطاب اور دوسری تقریریں سنتے رہیں۔

اس جلسہ کے دوران حضور انورؒ نے پاکستان حکومت کے احمدیہ جماعت کے متعلق وائٹ پیپر کا مفصل جواب بیان فرمایا۔ جلسے کے بعد عالمی مجلس شوریٰ 8اور 9 / اپریل کو اسلام

آباد میں منعقد کی گئی۔11 / اپریل1985ءکو کیفے رائل،لندن میں ایک کانفرنس کا انتظام کیا گیا جس میں 27 نمائندوں نے شرکت کی۔اس موقع پر پاکستان میں احمدیوں پر جو مظالم روا رکھے جارہے ہیں،ان کا بیان اور اس کے علاوہ ظلم کرنے والوں کی مذمت کی گئی۔

25-26-27 جولائی 1986ءکو جو انگلستان کی جماعت کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا،اس میں5800احمدی احباب نے شرکت کی۔اس جلسے میں حضورؒ کے خطابات دس گھنٹے سے زیادہ وقت کے لئے جاری رہے۔حضورؒ نے فرمایا:

دنیا کے مختلف ممالک سے اتنے افراد کا جلسے کے لئے آنا حضرت مسیح موعودؑ کی سچائی کی ایک دلیل ہے۔خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے جو فرمایا تھا کہ ''میں تیری تبلیغ کو زمین کے کناروں تک پہنچاؤں گا'' وہ ان احباب کے ذریعے صاف طور پر پورا ہوا ہے۔

اس جلسے کے بعد ایک عالمی شوریٰ کا بھی انعقاد کیا گیا۔یہ شوریٰ،28-29جولائی کو منعقد کی گئی۔اس شوریٰ کے علاوہ اس موقع پر بعض اور کانفرنس بھی منعقد کی گئیں جن میں مربیان کی کانفرنس،ڈاکٹر صاحبان کی کانفرنس،آرکیٹیکٹ صاحبان کی کانفرنس اور انجینئر صاحبان کی کانفرنس شامل تھی۔اسی طرح ایک عالمی احمدیہ ایسوسی ایشن برائے حقوق انسانی بھی قائم کی گئی۔اکیسواں جلسہ سالانہ 31 جولائی سے 2اگست 1987ءتک منعقد کیا گیا۔اس موقع پر حضور انورؒ کی تقاریر 11 گھنٹے سے بھی زیادہ عرصے تک جاری رہیں۔اس موقع پر جو روٹی پلانٹ لگایا گیا تھی،وہ نہایت کامیابی کے ساتھ شرکائے جلسہ کو روٹی مہیا کرتا رہا۔

افریقہ اور عرب سے بھی بہت سے نمائندے آئے ہوئے تھے۔نائجیریا سے دو بادشاہ شرکت کے لئے تشریف لائے اور انہیں حضرت مسیح موعودؑ کے کپڑوں کے ٹکڑے عنایت کئے

گئے جس سے یہ بات پوری ہوئی کہ: ''بادشاہ تیرے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے۔''

اس سے پہلے 30 جولائی کو پہلی کانفرنس برائے دعوت الی اللہ منعقد ہوئی۔ دنیا کے مختلف ممالک سے 30 نمائندوں نے اس میں حصہ لیا۔ عالمی شوریٰ جلسے کے بعد 3 اور 4 / اگست کو منعقد کی گئی۔ ان میں عالمی فورم برائے جشن تشکر اور عالمی آڈٹ کانفرنس اور داعیان الی اللہ کی کانفرنس شامل تھی۔ بائیسواں جلسہ سالانہ 22 سے 24 جولائی 1988ء تک منعقد کیا گیا۔ حضورؒ کی چھ تقاریر ہوئیں جن میں جمعے کا خطبہ بھی شامل تھا اور اسی طرح عیدالاضحیٰ کا خطبہ بھی جو تیسرے دن پڑھا گیا۔ اس کے علاوہ جو عالمی کانفرنس ہوئیں، ان میں عالمی مجلس شوریٰ 25 اور 26 جولائی اور اسی طرح جشنِ تشکر کے سلسلے میں اجلاس ہوئے۔

انگلستان کی احمدیہ جماعت کے اراکین مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ان جلسوں کے لئے نہایت محنت اور جانفشانی کے ساتھ کام کیا۔ 1984ء میں مولانا عطاالمجیب صاحب راشد جو اس وقت مربی انچارج اور انگلستان کے امیر تھے اور خواجہ رشید الدین قمر صاحب جو انچارج تھے، انہوں نے سارے جلسے کی نگرانی کی۔ خواجہ رشید الدین قمر صاحب افسر جلسہ سالانہ تھے۔ 1985ء میں محترم چودھری انور احمد صاحب کاہلوں سارے جلسے کے نگران تھے کہ وہی اس وقت وہاں کی جماعت کے امیر تھے۔ محترم چودھری ہدایت اللہ صاحب بنگوی اور محترم مولانا عطاء المجیب صاحب راشد افسر جلسہ سالانہ اور افسر جلسہ گاہ کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ 1986ء 1988ء تک جلسے کے انعقاد کی ذمہ داری محترم آفتاب احمد خان صاحب امیر جماعت برطانیہ کی تھی۔ محترم ہدایت اللہ بنگوی صاحب اور محترم مولانا عطا المجیب صاحب راشد افسر جلسہ سالانہ اور افسر جلسہ گاہ کے طور پر فرائض انجام دیتے رہے۔ یہی ٹیم 1989ء کے (احمدیہ صد سالہ جوبلی کے۔ ناقل) جلسہ سالانہ میں بھی اپنے فرائض

سرانجام دیتی رہی اور اب تو 1989ء کا جلسہ سالانہ خدا کے فضل سے نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ اس موقعہ پر دنیا کے مختلف ممالک سے چودہ ہزار کے قریب اصحاب تشریف لائے۔ ان میں افریقہ کے چیف بھی شامل تھے۔ یورپ اور کینیڈا کے بعض وزراء اور پارلیمنٹ کے ممبر بھی شامل تھے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ 21 ستمبر 1989ء)

OO

مذکورہ بالا مضمون میں جو بھی تواریخ وحقائق تحریر کئے گئے ہیں وہ اصل سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اصل اعداد وشمار مندرذیل ہیں:

''سیدنا طاہر سونیئر'' شائع شدہ جماعت ہائے احمدیہ برطانیہ صفحہ 4 کے مطابق جلسہ سالانہ برطانیہ منعقدہ 1984ء کی حاضری 3000 تھی۔ اس کے بعد منعقد ہونے والے جلسہ سالانہ میں مندرجہ ذیل حاضری رہی:

	سال	حاضری
۞	1985	4500
۞	1986	5800
۞	1987	7000
۞	1988	5119
۞	1989	14000

(بحوالہ: تاریخ احمدیت، شائع شدہ شعبہ تاریخ ربوہ، جلد اوّل صفحہ 447)

جلسہ سالانہ برطانیہ منعقدہ 2019 جماعت ہائے احمدیہ برطانیہ کا 53 واں جلسہ سالانہ ہے۔

مکرم آفتاب احمد خان صاحب

سابق امیر جماعت ھائے احمدیہ برطانیہ

مکرم آفتاب احمد خان احمد صاحب جب انگلستان کے امیر ہو گئے تو برطانیہ کی جماعت میں کسے معلوم تھا کہ وزارت خارجہ حکومت پاکستان کی گرانقدر خدمات بجا لانے والے یہ سفارت کار، جماعت احمدیہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ بَرآ ہوتے وقت اپنی خداداد صلاحیتوں اور حسن انتظام سے تاریخ کا حصہ بن جائیں گے۔ یہ وہی دور تھا جب حضرت محمد ظفر اللہ خان صاحب بھی انگلستان میں مقیم تھے اور ان کا قلم سلطان القلم کی اردو تحریروں کو انگریزی زبان میں ڈھالنے میں شب و روز سرگرم تھا تا کہ یہ انمول جواہر پارے کثرت سے انگریز قوم میں پھیل جائیں جیسا کہ حضرت مسیح موعودؑ نے 1891ء میں اپنی رؤیا میں ایک نظارہ دیکھا تھا کہ:

”میں نے دیکھا کہ میں شہر لنڈن میں ایک منبر پر کھڑا ہوں اور انگریزی زبان میں ایک نہایت مدلل بیان سے اسلام کی صداقت ظاہر کر رہا ہوں ۔ بعد اس کے میں نے بہت سے پرندے پکڑے جو چھوٹے چھوٹے درختوں پر بیٹھے

ہوئے تھے اور ان کے رنگ سفید تھے اور شاید تیتر کے جسم کے موافق ان کا جسم ہوگا۔ سو میں نے اس کی یہ تعبیر کی کہ اگرچہ میں نہیں، مگر میری تحریریں ان لوگوں میں پھلیں گی اور بہت سے راستباز انگریز صداقت کا شکار ہو جائیں گے۔''

(روحانی خزائن جلد ۳ ازالہ اوہام صفحہ ۳۷۷)

اس عظیم مقصد کے لئے حضرت چودھری صاحب کو بہت جلدی تھی۔ ادھر تاریخ اس موڑ پر تھی جسے 1982ء کا سال کہتے ہیں اور آفتاب احمد خان صاحب ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ مگر جسمانی قویٰ کے اعتبار سے ایک تروتازہ نوجوان نظر آتے تھے۔ اسی سال محمود ہال لندن میں جماعت کی ایک تقریب تھی جس میں آفتاب احمد خان صاحب نے فصیح و بلیغ انگریزی زبان میں خطاب فرمایا۔ آپ کی تقریر کا ہر جملہ سامعین کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ بس یہی وہ حادثہ تھا جس نے اس نو وارد کے لئے ایک واردات کا کام کیا اور وہ جماعت احمدیہ برطانیہ سے روشناس ہو گیا۔ لیکن پھر بھی کون جان سکتا تھا کہ اس ڈپلومیٹ دماغ سے جو دھواں اٹھ رہا ہے اس میں عشق وجنون کے شرارے لپٹے ہوئے ہیں۔ اب تک تو جماعت احمدیہ برطانیہ حضرت چودھری سر محمد ظفر اللہ صاحبؓ کے خطابات سے ہی مستفید ہو رہی تھی اور ان کی ذات گرامی سے ہٹ کر دور دور تک کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ اس دور میں ایک ایسا ٹھہراؤ تھا کہ اس ٹھہراؤ کو بکھیرنے کے لئے تیز لہروں کی ضرورت تھی کہ اچانک بےساختہ آفتاب احمد خان ایک تند لہر کی طرح اٹھے جس نے ساری سطح کو مرتعش کر دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ خدمت دین کی دھیمی دھیمی آنچ میں آفتاب صاحب نے پگھلنے کے آداب سیکھنے شروع کئے۔ ابھی قدم قدم ہی چلے تھے کہ چشم جوہر شناس نے امارت کی ذمہ داریوں کے لئے چن لیا۔ اس واردات نے ان کی تمام سفارتی خو بو، طور طریقے، رکھ رکھاؤ،

اور وقعتوں کے تمام انبار ان کے کندھوں سے پھینکے اور ہلکے پھلکے کندھوں پر للہی شوقِ جذب نے جگہ بنالی۔

یوں آفتاب خان صاحب نے اس رسی کو تھام لیا جس کی ڈور کا ایک سرا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے ازخود ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ تھی مختصر سی داستان جس میں اس قائد نے خود ساختہ آسمان سے اتر کر خدمت وایثار کے میدان میں قدم رکھنا پسند کیا جس نے بعد میں اُنہیں وہ رفعتیں عطا کیں کہ جنہیں دیکھنے کے لئے انسان کو گردن اٹھانا پڑتی ہے اور انسان رشک کرتا ہے۔بس یہی تھے آفتاب احمد خان صاحب سابق امیر جماعت احمدیہ اور سابق سفیر پاکستان۔

جب امیر ہوئے تو سب سے پہلے زانوئے ادب حضرت صاحب کی خدمت میں اور پھر جماعت کی خدمت میں تہہ کئے۔ سب طریق کار سب سلیقے نرالے ہو گئے۔ان کے ڈھب بدل گئے۔امیر کے دفتر میں اپنی حاضری کو با قاعدہ کیا۔ جماعت کو حسنِ کارکردگی کے گُر سکھائے۔نظام جماعت کی حرمت کا درس دیا۔ جسے انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی صحبت میں رہ کر سبقاً ،سبقاً سیکھا تھا۔کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے پیش نظر معاملہ کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھتے۔کونوں اور کھدروں تک رسائی حاصل کرتے۔

امر واقعہ ہے جہاں جہاں بھی جس جس امیر نے نظام جماعت کے احترام کو فوقیت دی ہے۔وہاں وہاں جماعتوں کو غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں،شہرتیں ملی ہیں۔صوبہ سرحد میں خان شمس الدین خان صاحب کا وجود انہی خوبیوں سے مزین تھا۔انہوں نے نظام جماعت کی حرمت کو سب معاملات میں ہمیشہ بھاری سمجھا۔یہی وجہ تھی کہ ان کے وقت میں صوبہ سرحد کی جماعتوں میں انتظام کے لحاظ ایک توازن قائم تھا۔ یہی صورت کراچی کی

جماعت کی بھی تھی۔کراچی کو بھی ایسا ہی امیر میسر آیا۔مکرم چودھری عبداللہ خان صاحب انہوں نے بھی امامت اور نظام جماعت کے استحکام میں جس والہانہ عشق اور جذبہ سے کام لیا اور جماعت کی جس رنگ میں تربیت کی یہاں تک کہ ان کی گھٹی میں وہ کچھ ڈال دیا جو نسل در نسل آج کراچی کے مخلصین میں نظر آتا ہے۔عجیب اتفاق ہے۔خان شمس الدین خان صاحب نے دس سال سے زائد صوبہ سرحد میں امارت کی۔مکرم چودھری عبداللہ خان صاحب نے کراچی میں دس سال سے زائد عرصہ گزارا اور اب پھر دس سال سے زائد عرصہ برطانیہ کی جماعت کی خدمت کی سعادت پانے والا امیر آفتاب احمد خان صاحب ابھی ہم سے رخصت ہوا ہے۔یہ تینوں امیر اس عاجز کی نظر میں ایک ہی مرتبہ ایک ہی شان اور ایک ہی معیار کے تھے۔جو امامت جماعت کے شیدائی تھے۔(تحدیث نعمت کہہ لیجئے کہ اس عاجز کو ان تینوں امراء کی انتظامیہ میں ادنیٰ ترین رکن رہنے کی سعادت ملی ہے اور اسی حوالہ سے اُوپر موازنہ کی بات کی ہے)

آفتاب احمد خان صاحب کی دفتر امارت میں مصروفیات کا عالم دیکھنے کے قابل تھا۔ان کے ڈیسک پر تحریر شدہ ڈرافٹ بکھرے رہتے تھے۔پیڈ اور قلم کا ساتھ نہ چھوٹتا تھا۔اس کے باوجود ہر شخص بلا جھجک چلا آتا تھا۔کسی سے معذرت نہیں تھی کہ پھر سہی، پھر آنا۔

کام کی نوعیت کو پوری توجہ سے سنتے اور نپٹاتے۔بسا اوقات حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی تیاری میں ہوتے۔لیکن آنے والے کے کام کو پس پشت نہ ڈالتے۔کوئی بھی سمجھدار ان کو اس کیفیت میں دیکھ کر بغیر کچھ کہے لوٹ سکتا ہے۔لیکن انہوں نے کسی آئے ہوئے کو اس وقت تک آکر جانے نہیں دیا، جب تک اس سے، ضروری استفسار نہ کر لیا ہو۔بڑی ہی سرعت سے کام کو نپٹانے میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔مصروفیت کو انہوں نے کبھی بہانہ نہیں بنایا۔

اپنے رفقاء کار کی بے حد ہمت افزائی فرماتے لیکن اپنے گرد کسی قسم کی چاپلوسی کے حصار نہ اُٹھنے دیتے۔ جہاں مکینیکل طریق ابھرتے نظر آتے وہیں روک دیئے اور اس کی جگہ مثبت طریق کو رواج دیا۔ ان کی شفقت اپنی جگہ تھی، لیکن جانچ پڑتال اپنی جگہ، جب کام کی بات ہوتی تو اسی انداز سے بات ہوتی۔ جہاں گرفت کی ضرورت پڑتی وہاں کڑی گرفت کرتے۔ اصولی باتوں سے انحراف نظر آتا تو برداشت نہ کرتے تھے۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود جب ان کا کوئی رفیق کار ان سے فارغ ہو کر اٹھتا تو وہ روزمرہ کی دلچسپی کی باتوں کے مزے لے کر ہی اُٹھتا اور اسے ذہن نشین رہتا کہ اس نے کام کو اب کس نہج سے آگے بڑھانا ہے۔

آفتاب صاحب ہر کسی کی بات سنتے تھے۔ لیکن تکلفاً بھی ہاں، ہاں کہنے کے عادی نہ تھے۔ ضرورت کے مطابق تنقید کرتے تھے۔ اور مکمل طور پر مطمئن ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ فیصلہ کرنے سے پہلے جماعت کے مفاد، جماعت کے وقار اور جماعت کی معروف روایات کا پاس رکھتے ہوئے ہاں کہتے یا نہ کہتے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے جماعتی فیصلوں میں ذاتی رجحان کا عمل دخل استعمال کیا ہو۔ مگر ایک موقع ان کی زندگی، میں ایسا بھی آیا۔ جو ان کی تاریخ کا حصہ بن گیا۔ وہاں ان کی ایک دبی ہوئی خواہش ابھر کر نظر آنے لگی۔ اس واقعہ کا تعلق جماعت احمدیہ برطانیہ کے لئے نئے مرکز اور نئی مسجد کے لئے جگہ کے حصول سے تھا۔ یہ ضرورت ایک عرصہ سے تھی۔ لیکن لندن کے قرب وجوار میں کوئی ایسی جگہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے معاملہ آگے نہ چلتا تھا۔ بالآخر مورڈن کے علاقہ میں ایک وسیع عمارت اس مقصد کے لئے توجہ کا مرکز بن گئی۔ لیکن وہاں بھی ویسی ہی دشواریاں پیدا ہوئیں۔ اس سے بڑھ کر مقامی مخالفت نے بھی سر اٹھایا۔ لیکن آفتاب احمد خان صاحب نے ہر مشکل کو سر کرنے کی ٹھان لی۔ یہاں تک کہ اس عمارت کو بعض شرائط کے ساتھ خریدنے کی اجازت جماعت کو مل گئی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی خدمت میں آخری فیصلہ کے لئے لے جانے سے قبل مجلس عاملہ کی سفارش کی ضرورت تھی۔ مجلس عاملہ میں جب یہ منصوبہ پیش ہوا تو وسیع اخراجات اور دیگر مشکلات کے پیش نظر ممبران کا رجحان اس طرف جا رہا تھا کہ اس کو نہ خریدا جائے۔ اس پر آفتاب احمد خان صاحب نے توجہ دلائی کہ ایک لمبے عرصہ سے ہم اس تگ و دو میں تھے کہ ایسی جگہ ہمیں ملے جس سے ہماری آئندہ نسلوں کی ضروریات پوری ہوسکیں۔

اتنی جدو جہد کے بعد جب ہم اس موڑ پر آئے ہیں، جہاں اگرچہ محدود مشکلات کا سامنا ہے لیکن وہاں اس کے برعکس جماعت کا مفاد اور جماعت کا وقار اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یہاں پہنچ کر ان کی ایک اُمنگ نے جھلک دکھائی کہ خدا تعالیٰ کرے کہ ایسے منصوبہ کی تکمیل کی ہمیں سعادت حاصل ہو، جو آنے والی نسلوں کے لئے بابرکت ثابت ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مجلس عاملہ نے دعاؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے حضرت صاحب کی خدمت میں اس جگہ کی خرید کے لئے سفارش پیش کردی۔ اس منصوبہ کی ابتداء آفتاب احمد خان صاحب کی امارت کا ایک تاریخی باب ہے۔

انتظامی لحاظ سے ایک کامیاب قائد کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیچھے نئے آنے والوں کی صفیں باندھ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے رفقاء کار کی اسی رنگ میں تربیت کی اور رہنمائی فرمائی کہ کسی ایک وجود کے چلے جانے سے اتنا ہی خلا نظر آئے جتنا تیز دھارے میں لٹھ مارنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر وہ خلاء کے قائل ہی نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے نائبین کو خاص تربیت سے نوازا۔ جب بھی کبھی رخصت پر جاتے تو کسی فرد واحد کو آگے نہ کرتے بلکہ حضرت صاحب کی اجازت سے باری باری امارت کے فرائض مختلف نائبین کو سونپا کرتے۔

مکرم امام عطاء المجیب صاحب راشد مربی انچارج کے علاوہ نائب امیر برطانیہ ہیں۔ انتظامی معاملات میں آفتاب خان صاحب نے ان سے معاملہ کرتے ہوئے کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔لیکن اس کے برعکس بحیثیت مربی سلسلہ ان کا ادب اوراحترام ملحوظ خاطر رکھااور ہمیشہ ان کے مشورے کو معتبر سمجھا۔اسی طرح مجلس عاملہ میں بھی جہاں بعض اوقات متضاد آراء سامنے آجاتیں وہاں مکرم امام صاحب کی رائے کو ہی مقدم کیا اور اسی کی روشنی میں فیصلے صادر فرماتے۔

جماعت برطانیہ کے نقیب اخبار احمدیہ کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔آفتاب خان صاحب کے کچھ اصول تھے۔کچھ سلیقے تھے اور کچھ ذوق تھے جن کو وہ ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔

شعر و ادب میں خاصا شغف تھا، ذوق تھا اور اچھے اشعار پرکھنے کا شعور تھا۔ اردو، انگریزی نثر کو تصنع اور بناوٹ سے پاک رکھنا، الفاظ کی ترتیب میں روانی اور سادگی، بھاری بھرکم اور بھرتی کے الفاظ ان کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔قارئین کے سامنے وہ ایسی تحریر پیش کرنا پسند کرتے تھے جس سے وہ آسانی سے پیغام کو سمجھ سکیں، مطلب کو حاصل کرسکیں۔عنوان بھی باندھیں تو قاری کو پس پردہ جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اخبار احمدیہ کی ترتیب کے مراحل میں تصاویر کا انتخاب بھی خاص انداز سے کرتے تھے۔آخر امیر تھے۔تصاویر میں بھلا کیسے چھپ سکتے تھے۔لیکن پھر بھی حتی المقدور ایسی تصاویر جن سے ان کی شخصیت نمایاں ہوکر سامنے آجائے، اجتناب کرتے تھے اور پرے کر دیتے تھے۔عجیب اتفاق ہے، خدا جانے شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کو پتہ چل جاتا ہے کہ وہ رخت سفر باندھ چکا ہے۔آخری شمارہ جب وہ میرے ساتھ دیکھ رہے تھے تو تصاویر کے انتخاب میں خلاف معمول تمام ان تصاویر کو منتخب کر دیا جن کو کبھی میں پیش کیا کرتا تو وہ ہر

بار پرے کر دیتے تھے۔ کیا خوب، جانے سے قبل اس عاجز کی پسند کا بھی خیال آ ہی گیا ہو۔ ان کی وفات کے بعد جب سفر آخرت کی تصاویر چن رہا ہوں تو دل میں اِک ہوک اُٹھی ممکن ہوتا تو ان سے پوچھتا، کیا یہی پسند تھی آپ کی؟ ہماری تو نہ تھی! لیکن ؎

بھلا خالق کے آگے خلق کی کچھ پیش جاتی ہے؟

(روزنامہ الفضل ربوہ 23 دسمبر 1996ء)

○○

تعزیتی مجالس کے آداب

ہر مجلس کی طرح تعزیت کے بھی کچھ آداب اور لوازمات ہوتے ہیں۔مختلف طبقات میں جدا جدا طریق رائج ہیں ۔ ہر طبقہ نے اس موقع کو بہت سنجیدگی سے لیا ہے اور اپنے طرزِ عمل میں میت کے احترام اور لواحقین سے ہمدردی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔عزیز و اقارب دوست احباب اور پڑوسی سب ہی افسوس والے گھر میں اکٹھے ہوتے ہیں اور مرحوم کی مغفرت کے طالب ہوتے ہیں۔

یہ ساری باتیں مجلس کو سنجیدہ بنائے رکھتی ہیں،لیکن اس کے ساتھ ساتھ قدرتی امر ہے کہ جہاں چار آدمی اکٹھے ہوں وہاں ہر شخص اپنے اپنے انداز سے کچھ نہ کچھ کہے گا ایسی صورت میں ماحول کو سنجیدہ اور تعزیت کے احترام کو ملحوظ رکھنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ عام اخلاق کا بھی تقاضا ہے کہ زیادہ اور بلا وجہ ادھر اُدھر کی باتوں سے اجتناب کیا جائے اور مجلس کو قصہ خوانی میں مبتلا نہ ہونے دیا جائے ، اس سے مجلس طول پکڑتی ہے اور لوگ تعزیت کو بھول کر قصے کہانیاں سننے کے لئے بیٹھے رہتے ہیں ۔بعض اشخاص کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مرنے والے سے اپنے تعلق کا زیادہ سے زیادہ اظہار کریں اور اس تسلسل میں اس کی زندگی کے بعض ایسے

گوشوں کا ذکر لے بیٹھتے ہیں جن میں لطائف اور ظرافت کی چاشنی بھی ہوتی ہے۔ وہ بلا سوچے سمجھے ان باتوں کو بھی تعزیت کا حصہ بنا کر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ وہ تعزیت کے تقاضوں کو مجروح کر رہے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی ایسی باتوں سے مجلس میں ہنسی اور قہقہے تو لگ سکتے ہیں، مگر افسوس کی فضا قائم نہیں رہ سکتی۔ ٹھیک ہے کہ مرنے والے کی زندگی میں ایسے واقعات قہقہے ہی تھے لیکن آج جبکہ اس کے جسد عنصری پر ہم مٹی ڈال کر فارغ ہوئے بیٹھے ہیں یہ قہقہے اور دلچسپی کی باتیں یہاں زیب نہیں دیتیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی تعزیت کی مجلس میں آجاتے ہیں جو اپنے قصے اور واردتیں دہرانے لگتے ہیں۔ اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کی داستانیں لے بیٹھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ وہی اس مجلس پر چھائے رہیں۔ یہ انداز بھی ایسی مجالس میں زیب نہیں دیتے کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اختلافی مسائل کو چھیڑ دینے کے عادی ہوتے ہیں جس کے لئے ماحول ہرگز متحمل نہیں ہوتا۔ بولنے والے کو احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ وہ اس مجلس میں ہر طبقۂ فکر کے احباب موجود ہو سکتے ہیں، ایسا نہ ہو اس اختلافی گفتگو سے کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ پس اس قسم کی فضا کو پیدا کرنے سے قطعی اجتناب کرنا چاہیے۔

دراصل پسماندگان کی تعزیت اور تقویت کے لئے ارشاد الٰہی، انا للہ وانا الیہ راجعون، کی تکرار اور اس آیت مبارکہ کے معانی کا بیان ہی افسوس کے سب کلمات سے ارفع و اعلیٰ اور موثر ہے اور اکابر کا بھی یہی دستور رہے اور اسی پر عمل کرنا چاہیے۔

جہاں تک تعزیت کے بنیادی مقصد کا تعلق ہے کہ آپ اپنے غم کے جذبات کا اظہار لواحقین تک پہنچائیں۔ ان سے ہمدردی اور یگانگت کا اظہار کردیں۔ اس کے لئے بھی ایسی صورت پیدا نہیں ہونی چاہئے جس سے انہیں اذیت محسوس ہو۔ افسوس والے گھر میں بلاوجہ صبح

سے شام اور شام سے صبح کر دینا بھی کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔تعزیت کے لئے آئے ہیں مناسب وقت تک بیٹھیں ۔ اہل خانہ سے ہمدردی اور غم کا اظہار کریں اور اُنہیں صبر کی تلقین کریں اور متوفی کے لئے دعا کرتے ہوئے رخصت کی اجازت لیں اور دوسرے آنے والے دوستوں کے لئے جگہ خالی کر دیں۔

اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ گھر والوں کو بھی تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی سکون اور آرام کی بھی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ ایک تو وہ غم سے نڈھال ہوتے ہیں ، دوسرے لا پرواہ قسم کے تعزیت کرنے والوں کی بلا مقصد موجودگی ان کے لئے پریشانی کا موجب بن رہی ہوتی ہے۔

ٹیلیفون بھی اس زمانے میں تعزیت کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔اس کا استعمال بھی اگر اعتدال سے کیا جائے تو اہل خانہ کا غم بانٹنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ٹیلیفون پر مرنے والے کی عادات واطوار اور وفات تک کی تفصیلات کا بیان پوچھا جا رہا ہوتا ہے۔ جب کہ اس کے لئے کسی اور وقت کا انتظار کرنا چاہئے اور ٹیلیفون پر موقع کے لحاظ سے بہت مختصر بات کرنی چاہئے۔ کیونکہ یہ ایسی سہولت ہے جس کے لئے بہت سے غمخوار انتظار میں ہوتے ہیں۔انہیں بھی موقع ملنا چاہئے۔

پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض افراد میت والے گھر سے ذاتی ٹیلیفون کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ ضروری بات یاد آ گئی تھی۔ اس طرح وہ ہمدردی تو کجا ان پر مالی بوجھ بھی ڈال رہے ہوتے ہیں۔ان کو چاہئے کہ وہ تعزیت پر آنے سے پہلے اپنے ذاتی معاملات نپٹا کر آئیں کہ یہی ہمدردی کا تقاضا ہے۔

تعزیت والے گھر میں تین دن تک کھانا پہنچانا، عزیز و اقارب، ہمسائیوں اور دوستوں کا

فرض ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی سنت ہے۔ایک حدیث میں حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرو کیونکہ ان پر وہ چیز آئی ہے جس سے وہ کھانا نہیں پکا سکیں گے۔(ترمذی۔ابن ماجہ)

الحمدللہ! اسلامی معاشرہ میں اس فریضہ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔یہاں بھی تعزیت کے لئے آنے والوں کو سوچنا چاہیئے کہ کھانے کے اہتمام کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ گھر والوں کے لئے کیا جائے نہ کہ ہر آنے اور جانے والے کے لئے۔اس لئے تعزیت کے لئے آنے والوں کے لئے یہی مناسب ہے کہ کھانے کے وقت سے پہلے جانے کی اجازت طلب کر لیں۔سوائے اس کے کہ بامر مجبوری بہت لمبے سفر سے عین اس وقت پہنچے ہوں اور انہیں کھانے کی حاجت ہو یا جن کو اہل خانہ ازخود کھانے کے لئے روک لیں۔

(اخبار احمدیہ شمارہ مئی جون 1996ء)

○○

مضامین
صفیہ بشیر سامی

میری زندگی کی پہلی تحریر جو بہت مشکل سے میں نے لکھی تھی۔ جس میں میرا درد بھی ہے اور پیار بھی۔ میرے ماموں زاد بھائی جان عبدالباسط شاہد صاحب نے اس تحریر کی نوک پلک سنوار کر مجھے شاباش دی اور میرا حوصلہ بھی بڑھایا۔ اُسے ہی پہلے لکھوں گی۔

(صفیہ سامی)

محترم بشیر الدین سامی صاحب مرحوم

زندگی کے نشیب وفراز میں لپٹی ہوئی سوگوار حقیقتیں بھی اور خوشگوار لمحات بھی اور احسان و مروت سے بھر پور حسین یادیں بھی اور ان یادوں سے درد اور کسک کا احساس بھی ملتا ہے۔ ہر لمحہ کوشش کی کہ سامی صاحب کے بارے میں کچھ لکھوں مگر میرے قلم میں بھلا اِتنی ہمت کہاں کہ میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکوں ہاں سوچ میں کبھی کمی نہیں آئی۔

اُن یادوں اور محبتوں کے سہارے کوشش کرنے لگی ہوں کہ آج میں سامی صاحب کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔ سامی صاحب نے ہمیشہ خدا تعالیٰ کے توکل، بھروسہ اور ہر حال میں خدا تعالیٰ کے آگے جھکتے ہوئے عاجزی اور انکساری سے بہت خوش گوار مطمئن اور کامیاب زندگی گزاری اور ہم سب کو بھی اچھی زندگی گزارنے کے سلیقے سکھائے۔ الحمد للہ۔ اللہ پاک سے ہر وقت اُن کی مغفرت اور بلند درجات کی دُعائیں کرتی رہتی ہوں۔

سامی صاحب کی پیدائش نومبر 1932ء قادیان میں سردار مصباح الدین مرحوم (سابق مشنری انگلستان) کے ہاں ہوئی۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام حاکم بی بی تھا۔ آپ پانچ بھائی اور

دو بہنیں تھیں۔

قادیان کی ہجرت کے بعد سامی صاحب کے والدین نے اپنا ٹھکانا چنیوٹ میں بنایا۔ہجرت کے بعد جماعت کے بعض دفاتر کا عارضی قیام بھی چنیوٹ ہی میں ہوا اور عارضی طور پر تعلیم الاسلام ہائی سکول بھی شروع ہو گیا۔سامی صاحب نے میٹرک کا امتحان بھی تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ سے ہی پاس کیا۔

کالج پڑھائی کے لئے وسائل نہیں تھے اور ابھی عمر بھی کم تھی۔سو سامی صاحب نے ربوہ خیموں میں جو مرکزی دفاتر قائم ہو چکے تھے ان میں وقتی طور پر دفتر حفاظت مرکز میں کام شروع کر دیا جو بعد میں بیت المال میں تبدیل ہو گیا۔تھوڑا ہی عرصہ کام کیا تھا کہ سامی صاحب بیمار ہو گئے اور کام چھوڑنا پڑا۔اس بیماری کے دوران حضرت خلیفۃ المسیح الثانی المصلح موعودؓ نے خاص شفقت اور مہربانی سے دو مرتبہ تین تین سو کی گرانقدر رقم عطا فرمائی اللہ تعالیٰ نے خاص فضل فرمایا اور جلد صحت مند ہو گئے۔الحمد للہ۔حضرت سید محمود اللہ شاہ صاحب مرحوم جو سامی صاحب کے ساتھ بہت پیار کرتے تھے اُنہوں نے کوشش کر کے آپ کو ملازمت کے لئے کراچی بھجوا دیا۔وہاں جا کر نیوی کے ہیڈ کوارٹر میں جو بعد میں ایر ہیڈ کوارٹر میں تبدیل ہو گیا ملازمت شروع کر دی۔

سامی صاحب 1954ء میں کراچی گئے ملازمت کے ساتھ الحمد للہ اُن کو کراچی کی جماعت میں دین کا کام کرنے کی بھی سعادت ملی۔وہ ایک منتظم، معتمد، ناظم مال اور نائب معتمد کی ذمہ داریاں علی الترتیب انجام دیتے رہے۔1954ء میں ہی اُن کو مجلس خدام الاحمدیہ کراچی کا معتمد مقرر کیا گیا۔سامی صاحب کو کراچی میں آٹھ سال دین کی خدمت کا موقع ملا جس میں ''المصلح'' کے زمانہ کا کام بھی آتا ہے۔

چار سال تک متواتر علمِ انعامی بھی آپ کے دور میں ملتا رہا۔ سب سے بڑا کارنامہ اُن کو شعبہ اعتماد میں سرانجام دینے کا ملا۔ سامی صاحب کو کراچی سے الوداع کرتے وقت سپاس نامہ پیش کیا گیا، اس میں سامی صاحب کی بے شمار قابلیتوں، صلاحیتوں کا ذکر ہے اور ایک قائد صاحب کے الفاظ میں:

''سامی صاحب ایک ایسے عہدہ دار ہیں جن کے سپرد کام کر کے آرام کی نیند سویا جاسکتا ہے۔ الحمدللہ۔''

1960ء میں ائر ہیڈ کوارٹر کراچی سے منتقل ہو گیا۔ اس طرح سامی صاحب کا پشاور کی جماعتی ذمہ داریوں کا دور شروع ہو گیا وہاں بھی خدام الاحمدیہ پشاور کے معتمد مقرر ہوئے پشاور کو حلقہ وار منظم کرنے والی ٹیم میں بطور جنرل سیکرٹری کام کرنے کا موقعہ ملا۔ 1969ء میں قائد خدام الاحمدیہ مقرر ہوئے اور جماعت احمدیہ پشاور کے سیکرٹری تحریک جدید بھی رہے۔

جہاں سامی صاحب دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے وہاں ان کی ذاتی زندگی میں مارچ 1964ء کو میری ذمہ داریاں بھی شامل ہو گئیں اور الحمدللہ اُن کو بھی بہت احسن طریقہ سے نبھایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

1970ء کو سامی صاحب نے ایک بار پھر ہجرت کی اور لنڈن آ گئے۔ زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا جو کافی مشکل دور تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ کافی مشکلات پیش آئیں لیکن کبھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ مشکلات کو سجدوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور حل ہونے کے پیش کرتے رہے۔ حضور کی خدمت میں دعاؤں کا بھی لکھتے رہے۔ مالی مشکلات بھی بہت ہوئیں مگر کبھی بے صبری کا لفظ زبان سے نہ نکالتے اور ہمیں بھی یہی تلقین کرتے۔ بے حد قناعت پسند تھے۔ ہمیشہ اللہ کی رضا پر راضی رہتے۔ الحمدللہ۔

جب پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ ہجرت کر کے لنڈن تشریف لائے تو ہم مسجد فضل سے کافی دور رہتے تھے اور یہ دوری ہمیں اچھی نہیں لگتی تھی کیونکہ ان دنوں حضور کی قریباً روزانہ مجلس عرفان اور دیگر خطبات وخطابات میں شمولیت کے لئے جانا بہت ضروری تھا۔ بہت جوش اور ولولہ کے پروگرام ہوتے تھے اور ہمیں مسجد کی طرف بھاگنا ہوتا تھا۔ ہم سب دعاؤں میں لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد فرمائی اور مسجد کے قریب ایک عارضی رہائش کا بندوبست ہو گیا۔ پھر ہم اپنا گھر چھوڑ کر اس عارضی گھر میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح ہم مسجد اور حضور کے قریب آ گئے۔ سب کو جی بھر کے پیارے آقا کے زیر سایہ رہنے اور خدمتِ دین کی توفیق ملی اور حضور سے بے پناہ محبت اور پیار بھی ملا۔ الحمدللہ۔

جب سامی صاحب ریٹائر ہوئے تو مجھے اور بچوں کو بلا کر پاس بٹھایا اور اپنی خواہش کا اظہار کیا اور رائے مانگی کہ میری خواہش ہے کہ اب باقی کی زندگی صرف دین کے لئے وقف کر دوں دنیاوی کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔ اب آپ لوگ بتائیں مَیں کونسی راہ اختیار کروں۔ کیا آپ سب میری پینشن میں گزارا کر سکتے ہیں؟ کیونکہ اگر آج میں نے دین کے حق میں فیصلہ کر لیا تو پھر دنیاوی کام ہرگز نہیں کروں گا۔ بھلا ہماری کیا مجال تھی کہ ہم دین کا راستہ روک کر دنیا کی بات کرتے۔ الحمدللہ ویسا ہی ہوا جیسا سامی صاحب نے چاہا۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ہم کبھی بھی سامی صاحب کی ذمہ واریوں میں حائل نہیں ہوئے۔

1984ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ کی آمد کے بعد لندن کی جماعت میں بہت سے عہدوں پر کام کیا لکھوں تو بہت بڑی لسٹ بن جاتی ہے۔ مختصر ذکر کر دیتی ہوں:

اخبار احمدیہ کے دس سال تک ایڈیٹر رہے، برطانیہ کی جماعتی تقریبات کی رپورٹنگ برائے اخبار الفضل، اخبار احمدیہ، نمائندہ اخبار الفضل ربوہ، اخبار الفضل انٹرنیشنل لندن،

اخبار بدر قادیان، چودہ سال تک امام مسجد لندن مکرم عطاء المجیب صاحب راشد کے ساتھ اعزازی طور پر معاون و مددگار رہے اور امام صاحب کے دفتر میں ان کی معاونت میں بہت سارے شعبوں میں کام کرنے کی توفیق پائی۔ 1985ء سے 1998ء تک جلسہ سالانہ برطانیہ کے جملہ پروگراموں کی تیاری کے لئے ناظم پروگرام واشاعت کام کیا اور اس طرح بہت سے کام کئے۔

سامی صاحب تحدیث نعمت کے طور پر کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے توفیق بخشی کہ میں نے تین امراء کی انتظامیہ میں ادنیٰ ترین رکن رہنے کی سعادت حاصل کی۔ مکرم چودھری عبداللہ خان صاحب کراچی۔ مکرم خان شمس الدین خان صاحب پشاور۔ اور مکرم آفتاب احمد خان صاحب برطانیہ۔

سامی صاحب کی نظر میں کوئی کام چھوٹا یا بڑا نہیں تھا ہر وہ کام جو ان کے ذمہ لگایا جاتا اس کو اپنا فرض سمجھ کر کرتے۔ اپنی ذات کو بھول جاتے اور کام کو اللہ کی دین سمجھتے۔ زندگی کا آخری کام جماعت احمدیہ برطانیہ کا 1902ء سے لیکر 2000ء تک کا ریکارڈ اکٹھا کرنا تھا۔ مَیں نے اُن کو دن رات سر جھکائے بے شمار کتب، اخبارات، رسائل سے مواد تلاش کرتے دیکھا۔ جبکہ ان کو اپنی بیماری کا علم بھی ہو چکا تھا۔ کہتے تھے نہ جانے کب بلاوا آجائے تھوڑے وقت میں زیادہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک کام جس سے وہ بے حد خوش تھے وہ تھا کہ حضور رحمہ اللہ نے اُن کو جامعہ احمدیہ جو لندن میں مولانا لئیق احمد طاہر صاحب پرنسپل کی زیر نگرانی قیام ہونا تھا، سامی صاحب کو سیکرٹری پرنسپل جامعہ احمدیہ کے لئے اعزازی طور پر نامزد کیا تھا۔ لیکن موت نے یہ کام کرنے کی اُن کو مہلت نہ دی۔

سامی صاحب کا ایک شوق سوشل ویلفیئر کا بھی تھا۔ بہت سارے بچوں کے باپ اور

بھائی بنے ہوئے تھے۔ اُن بچیوں کے گھروں میں کوئی جھگڑا ہوتا تو وہ سیدھی ہمارے گھر کا رُخ کرتیں۔ سامی اُن کی صلح کرواتے اور گھر چھوڑ کر آتے۔ سامی صاحب کے ایک دوست سیالکوٹ سے تھے اکیلے رہتے تھے اُن کی فیملی پاکستان میں ہی تھی وہ اپنی فیملی کے لئے بہت اداس رہتے تھے۔ سامی اُن کی مدد کر رہے تھے۔ ان کی بیوی بچوں کو بلانے کے لئے ہوم آفس والوں کے ساتھ کارروائی ہو رہی تھی، جدوجہد کے آخری مراحل تک پہنچنے والے تھے کہ وہ صاحب اچانک بیمار ہو گئے ایک دن سامی صاحب کام پر تھے تو اُن صاحب کا مجھے فون آیا کہ میں آپ کے گھر آ رہا ہوں۔ جب وہ صاحب ہمارے گھر آئے تو وہ شدید بیمار اُن کو سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا، مَیں بہت گھبرائی اُن کو پینے کو پانی دیا، لیکن وہ بہت جلدی میں تھے، مجھے تین سو پونڈ دے کر کہنے لگے یہ میری امانت آپ رکھ لیں اور اُسی طرح وہ جلدی میں چلے گئے۔ جب سامی صاحب شام کو گھر آئے میری ساری بات سن کر اپنے ایک غیر از جماعت دوست کو لے کر اُسی وقت اُنکے گھر گئے، گھر جا کر دیکھا تو اُن کی حالت بہت خراب تھی فوری طور پر ہسپتال لے کر گئے۔ ڈاکٹروں نے اُن کی تشویشناک حالت دیکھ کر سامی صاحب کو کہا اِن کی حالت ٹھیک نہیں ہے اگر آپ اِن سے پوچھ کر اِن کی وصیت لکھنا چاہتے ہیں تو لکھ لیں۔ اگلے دن سامی کچھ اور دوستوں کو ساتھ لے کر گئے کہ اُن کی وصیت لکھ لیتے ہیں۔ لیکن جب یہ لوگ وہاں پہنچے اور دیکھا تو وہ بیچارے تو اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا تھا کہ سب حیران پریشان رہ گئے۔ سامی صاحب نے اُن کے گھر سیالکوٹ فون کر کے اطلاع دی دوسرے جمعہ سب دوستوں نے مل کر چندہ جمع کیا اور اُن کی میت پاکستان اُن کے گھر بھجوائی اور ساتھ میں وہ تین سو پونڈ بھی جو وہ مجھے دے کر گئے تھے۔

سبھی لوگ سامی صاحب کی بہت عزت و احترام کرتے تھے، سامی صاحب اُن سب

کے امین بھی تھے۔عبادت اور دعاؤں پر بہت یقین تھا۔ ہمیشہ پورے روزے رکھتے۔رات کو عبادت کا شوق تھا اکثر صبح اُٹھ کر مجھے جو خواب سناتے اُن کی خوابوں میں کبھی بھی ہم نہیں ہوتے تھے بلکہ ہمیشہ حضرت مصلح موعودؓ ،حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ یا وہ بزرگ جن کا تعلق قادیان سے ہوتا تھا۔سامی صاحب بہت کم گو انسان تھے مگر جب کبھی قادیان کی باتیں شروع ہوجاتیں تو کبھی نہیں تھکتے تھے۔انتہائی سادہ مزاج کے مالک اور نہایت نفیس اور نفاست پسند انسان تھے۔

سامی صاحب کی بیماری بھی اچانک ظاہر ہوئی۔ڈاکٹروں کے پاس جاتے رہے چیک اپ بھی ہوئے مَیں ہمیشہ اُن کے ساتھ ہی ہوتی۔جس دن ڈاکٹروں نے کینسر کی تشخیص کی اُس وقت بھی میں اُن کے ساتھ ہی تھی۔ڈاکٹروں کی بات سُن کر چہرے پر کوئی گھبراہٹ ظاہر نہیں ہوئی۔صرف اتنا کہا کہ میں کوئی آپریشن نہیں کروانا چاہتا۔جتنی بھی زندگی اللہ تعالیٰ نے مجھے دی ہے مَیں دین کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔ڈاکٹروں نے ایک چھوٹا سا کی ہول آپریشن ضروری سمجھا جو صرف ایک دن کا تھا۔ہم نے اپنے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، پیارے آقا سے دعا کی درخواست کی سب نے تسلی دی ہم نے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے پروگرام بنالیا۔جس دن آپریشن کے لئے جانا تھا صبح ہی مجھے خواب سنائی کہ رات بھر ایک ہی شعر میری زبان پر آتا رہا:

اِک نہ اک دن پیش ہوگا تو فنا کے سامنے
چل نہیں سکتی کسی کی کچھ قضا کے سامنے

اور واقعی ہماری کوئی پیش نہیں چل سکی۔چل بھی کیسے سکتی تھی۔اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔آپریشن ہوئے اور ایک نہیں کئی ہوئے۔کوئی شکوہ یا شکایت زبان پر نہیں لائے۔تین ماہ

پندرہ دن کی بیماری بہت تحمل سے گزاری۔ پہلے ہی کم بولتے تھے مگر اب تو بالکل ہی خاموش ہو گئے تھے۔ جب بھی ملنے جاتی پہلا سوال ان کا یہ ہوتا۔ مسجد کی کوئی خبر؟ حضور کا کیا حال ہے؟ سب دوست احباب کا پوچھتے جب میں اُن کو یہ بتاتی کے سب لوگ آپ کے لئے دُعائیں کرتے ہیں تو آبدیدہ ہو جاتے۔

وفات سے دو دن قبل اشارے سے مجھے اور میرے بیٹے عکاشہ کو بلایا ہم دونوں نے کان اُن کے منہ کے قریب کئے تو خواب سنائی کہ ابھی ابھی دیکھا ہے کہ حضرت مصلح موعودؓ اور میرے ابا جی مجھے لینے کے لئے آئے ہیں۔ اب آپ سب نے صبر سے کام لینا ہے۔ آنسوؤں کا آنا قدرتی بات ہے لیکن صبر کا دامن نہیں چھوڑنا۔ پھر ہم نے خدا تعالیٰ کے فضل سے صبر سے ہی کام لیا۔

اور سامی ہم سے جدا ہو گئے۔ سامی نام تھا محبت کا، شفقت کا، رحمدل انسان، فرمانبردار بیٹے۔ پیار کرنے والے بھائی۔ شفیق باپ اور بہترین خاوند اُن کی کون کون سی خوبی بیان کروں۔ اُن کی زندگی کا مقصد دوسروں کے لئے جینا تھا اسی میں اُن کو سکون تھا۔ نانا۔ دادا۔ بن کر بہت خوش تھے۔ اپنے پوتوں نواسے نواسیوں سے بے حد پیار تھا سب بچوں سے بہت احترام سے بات کرتے تھے۔

آج سامی ہم میں موجود نہیں ہیں۔ مگر میں اُن کو اک لمحہ کے لئے بھی نہیں بھول پائی۔ کیسے بھولوں! ہزاروں احسان ہیں مجھ پر۔ سامی اعلیٰ تعلیم یافتہ دین اور دنیا کے لحاظ سے بھی اور میرے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر سچ تو یہ ہے کبھی مجھے کسی بات کا احساس نہیں ہونے دیا۔ پیار سے بن بتائے میری تربیت کرتے رہے۔ ہر معاملہ میں مجھ سے مشورہ کرتے۔ کوئی کام بھی مجھے بنا بتائے نہ کرتے۔ حقیقی معنوں میں میرے تمام حقوق سے زیادہ مجھے دیا۔

بہت یاد آتی ہے اُن کی...زندگی ادھوری سی ہوگئی ہے۔مگر میں ہر پل اُن کی مغفرت کی دُعا کرتی ہوں۔اللہ کی رضا پر راضی ہوں۔اللہ پاک سے دعا گو ہوں کہ وہ مجھے اور میرے سب بچوں کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے اور ہر اُس نیکی کو کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو سامی صاحب کرنا چاہتے تھے۔آمین۔

کیسے بھول سکتی ہوں میں وہ گھڑی جب وفات سے تھوڑی دیر پہلے آپ نے کہا تھا کہ آج میں اللہ کے حضور حاضر ہونے والا ہوں۔وہ لمحہ..اکتیس جولائی 2001ء، وہ منگل کا دن.. آٹھ بج کر پندرہ منٹ۔ہماری جدائی کی شام نہ...بھولنے والی دُکھوں بھری شام...نہیں بھول پاؤں گی...کبھی نہیں..کبھی بھی نہیں۔

آپ کے لئے ہر پل دعا کرتی ہوں۔اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین۔اور میرا بھی انجام بخیر ہو۔آمین ثم آمین۔

سامی صاحب کی خواہش تھی کہ اُن کا جنازہ حضور پڑھائیں، اللہ نے اُن کی یہ آرزو بھی پوری فرمائی۔فالحمدللہ۔

(الفضل انٹرنیشنل 26 نومبر تا دسمبر 2004ء)

○○

اعتکاف کے شب وروز

بچپن کی یادوں میں ایک یاد یہ بھی ہے کہ میری ایک ممانی جان مکرمہ آمنہ صاحبہ (اہلیہ مکرم عبدالرحیم صاحب درویش قادیان) ہمیشہ اعتکاف بیٹھتی تھیں تو ہم سب اُن سے ملنے کے لئے ربوہ کی مسجد مبارک میں جایا کرتے تھے۔ہم اُنہیں سلام کرتے جس کا جواب وہ صرف ایک مسکراہٹ سے ہی دیتیں، بات نہیں کرتی تھیں۔

اُس وقت میری سمجھ سے یہ باہر تھا کے یہ بات کیوں نہیں کرتیں؟ بات کرنے میں کیا حرج ہے؟ میں مانتی ہوں کہ اُس وقت مجھے اعتکاف کے بارے میں کوئی شعور نہیں تھا۔مگر اپنی ممانی کو دیکھ کر سوچتی ضرور تھی کہ کیا میں بھی کبھی ایسے نیکی کے کام یا عبادت کر سکتی ہوں؟ جواب بہت مشکل میں تھا۔

آہستہ آہستہ زندگی بدلتی گئی شادی ہوگئی بچے ہوئے زندگی اتنی مصروف ہوگئی کہ سب کچھ بھول بھال گئی۔ ہر سال رمضان آتا روزے رکھتے ماشاءاللہ پانچ بچے اور دو ہم سات بندوں کے کنبہ میں سحری اور افطاری سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ طاقت کے مطابق عبادت بھی چلتی رہی مگر بچپن کی اُس خوہش کے پورا ہونے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا۔

زندگی کا رُخ پھر بدلنا شروع ہوا۔ بچے بڑے ہو گئے ۔ ماشاءاللہ اُن کے اپنے گھر بس گئے ۔ زندگی کا ساتھی بھی ساتھ چھوڑ کر اپنے رحمٰن اور رحیم مولا کے پاس چلا گیا اور اب میری زندگی کا وہ دور شروع ہو گیا جہاں کوئی غمگسار نہ تھا... بس اللہ تعالیٰ کی یاد تھی۔ سو اللہ تعالیٰ نے میرے نصیب میں اُس وقت کو بھی داخل کر دیا جس کی مجھے بچپن سے خواہش تھی اور میں خدا کے فضل وکرم سے حالیہ رمضان شریف میں تیسری بار اعتکاف کی سعادت حاصل کر چکی ہوں۔ الحمدللہ۔

ہر بار پہلے سے زیادہ مزا آیا۔ بلکہ یہ کہوں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ پوری زندگی جی کر اور اچھا بن کر جینے کی کوشش میں گزار دینے کے بعد بھی مجھے ایسے لگتا ہے کہ اچھا بن کر رہوں، اچھی زندگی جیوں۔ مگر مجھے ایسے لگتا ہے کہ مَیں صرف یہ دس دن کی زندگی ہی جی پائی ہوں کہ ان دنوں میں ہم باہر کی دنیا سے کٹ کر رہ جاتے ہیں، یکسر بھول جاتے ہیں کہ باہر بھی کوئی دنیا ہے اور اس عظیم الشان جماعت کی عظیم الشان مسجد بیت الفتوح میں جو دس دن گزرتے ہیں بس وہی جینا ہے۔ مَیں سمجھتی ہوں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر اُس شخص کے لئے زندگی بھر کا تحفہ ہے جو بھی اعتکاف کرتا ہے۔ ہر معتکف کو سوائے خدا کی ذات کے کوئی ہوش نہیں ہوتا۔ ہر بندہ اپنی التجائیں اور فریادیں اُس کے حضور پیش کر رہا ہوتا ہے۔

کیسے؟ مَیں بتاتی ہوں کیسے؟ سارا دن اُس سفید بُراق چار یا پانچ فٹ چوڑے آٹھ فٹ اُونچے حجرے میں بیٹھ کر عبادت کرنا سوائے اس کے کہ کوئی اپنی ضروری حاجت کے لئے اُٹھے یا تھک جائے تو اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے دل میں تسبیح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی اور رحم کی بھیک مانگتے ہوئے مسجد کے اندر ہی چہل قدمی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے پاس سے گزرنے والوں کو ہلکی سی مسکراہٹ دے کر گزر جائے۔ سارا دن اُن

حجروں میں چھپے ہوئے لوگوں کی تھوڑی دیر کے بعد کہیں نہ کہیں سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں آنا اللہ سے فریاد کرتے دن گزرتا۔ دن بھر دھیمی روشنی میں مکمل خاموشی ہوتی کہ کوئی اُونچا سانس لے تو اُس کی بھی آواز سنائی دیتی نمازوں کے علاوہ حجروں کے اندر ہی عبادت کا مزا آتا افطاری تک دن ہے یا رات فرق نہیں پتہ چلتا تھا۔ با جماعت نمازیں، عصر کی نماز کے بعد درسِ قرآن کریم، افطاری اور اُس کے بعد نماز تراویح۔ اس کے بعد میرا خیال ہے کہ سب تھوڑا آرام کرتے ہوں گے۔ میں تو اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے ضرور آرام کرتی تھی۔

آدھی رات کے بعد سب بہنیں اُٹھنا شروع ہو جاتیں اور پوری رات کا منظر میں کیا بتاؤں کہ رات بھر اللہ کے گھر کے اندر اللہ کے در پر چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں سجدوں میں کسقدر التجائیں فریادیں اور گریہ وزاری کرتیں۔

میرا دل یقین سے کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اُن سب پر رحم کھا کر نیچے اُتر کر سب کی دعائیں قبول کرتا ہوگا، خدا کرے کہ ایسے ہی ہو۔ آمین۔ سحری سے پہلے آدھ پون گھنٹہ آرام کے بعد سحری، نماز، درسِ حدیث سے پھر سب تازہ دم ہو جاتے۔

اِس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جہاں 33 معتکفات ہوں وہاں کوئی بات نہ ہو اور کوئی ایک دوسرے کو جانتا نہ ہو، باتھ روم اور کھانے کے دوران دوستیاں بھی ہوئیں، ایک دوسرے کو جانا بھی گیا، ایک دوسرے کے ساتھ دعاؤں کا تبادلہ بھی ہوا، ہلکے پھلکے دکھ درد بھی بانٹے گئے۔ کچھ بہت پریشان ماؤں کو دعا کے لئے کہتے ہوئے سنا اور ایک دن صبح سویرے سحری کے وقت ایک ننھی پری کو ہاتھ میں پھول پکڑے اپنی دادی کی گود میں دادی کو پیار کرتے دیکھا بہت پیاری بچی تھی سب کو اُس نے سلام کیا اور سب سے پیار اور دعائیں بھی لیں۔

غرض دس دن میں اُس چھوٹی سی دنیا میں خاموش رہ کر عبادت کرتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دکھا دیا۔

دس کے قریب نوجوان بچیاں بھی تھیں جن کی عبادت کو دیکھ کر مجھے حسرت آتی تھی کے کاش نوجوانی کی عمر میں مَیں نے بھی کبھی اتنی دلجمعی سے عبادت کی ہوتی، مَیں نے اُن بچیوں کے لئے بھی بہت دعائیں کیں اللہ تعالیٰ اُنکی ساری دعائیں قبول فرمائے وہ بچیاں اور اُن کے والدین مبارک باد کے مستحق ہیں۔

الحمدللہ! ہمیشہ ہی اعتکاف والوں کے لئے بہت اچھا انتظام ہوتا ہے، بہت محنت کرتے ہیں انتظامیہ والے سب کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ کچن والے سحری اور افطاری کرانے والی ٹیموں کا جتنا بھی شکریہ ادا کریں تھوڑا ہے۔ بہت دعائیں نکلتی ہیں مسجد کا سوچنے والوں اور بنانے والوں اور ہر اُس شخص کے لئے جس نے بھی جس لحاظ سے بھی اس نیک اور ابدی رہ جانے والی عظیم الشان مسجد کے لئے اپنا حصہ ڈالا، اور یہ سب لوگ ہمیشہ دعاؤں کے مستحق رہیں گے انشااللہ تعالیٰ۔ اس مسجد کو دیکھتے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی عظمت کے آگے سر جھک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہماری سب مسجدوں کو رحمتوں برکتوں اور نمازیوں سے بھری رکھے۔ آمین۔

دعائیں کیں پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے لئے جن کے دورِ خلافت میں اس مسجد کی بنیاد رکھی گئی اُن کے ہم پر بہت بہت احسان ہیں۔ دعائیں کیں اپنے پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ کے لئے اور اپنی پوری جماعت کے لئے اللہ تعالیٰ ہماری ساری جماعت کے لوگوں کو اپنی حفاظت میں رکھے اور آج تک جتنے بھی جماعت کے لوگ شہید ہوئے اُن سب کے رشتہ داروں کو صبرِ جمیل عطا کرے اور اسیرانِ راہ مولا خیریت

سے اپنے اپنے گھروں میں واپس آئیں۔آمین۔

آخر میں تمام دنیا کے دُکھی اور مصیبت زدگان کے لئے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کے دُکھ درد دور فرمائے۔آمین ثم آمین۔اللہ تعالیٰ ہماری ساری دعائیں قبول فرمائے اور مزید عبادتوں اور دعاؤں کی توفیق دیتا رہے۔آمین۔

(مطبوعہ اخبار احمدیہ)

○○

مرکزسلسلہ ربوہ میں گزرے دنوں کی حسین یادیں

ایک ویرانہ جواب پھلوں اور پھولوں سے لدا ہوا ہے۔

غالباً1953ء مارچ اپریل کا مہینہ تھا، جب میں اپنی امی جان کے پاس مستقل آئی اس سے پہلے اپنی تائی اماں کے پاس تھی، جن کی کوئی اولادنہیں تھی اور میرا بچپن وہیں گزرا۔ میرے تایا جان افریقہ میں قیام پذیر تھے اوراب میری تائی اماں بھی اُن کے پاس ہی جارہی تھیں اس لئے مجھے میری امی جان کے پاس ربوہ چھوڑ دیا گیا۔ پہلے پہل تو ظاہر ہے میرے لئے بہت مشکل وقت تھا مگر آہستہ آہستہ میرا اپنی بہنوں اور بھائی کے ساتھ دل لگ گیا اور میں نے سکول میں بھی داخلہ لے لیا، میری پڑھائی تو کافی متاثر ہوچکی تھی، میں اپنی عمر کے لحاظ سے کافی پیچھے تھی کلاس میں سب بچے مجھ سے چھوٹے اور ہوشیار تھے جبکہ میں کچھ بھی نہ جانتی تھی پھر بھی میں کوشش کرتی رہی، لیکن پڑھائی سے زیادہ میری توجہ گھر کے کاموں کی طرف ہو گئی۔

جب میں ربوہ آئی تو ہمارا پہلا گھر چھوٹا سا ایک کمرے کا تھا۔ اس کمرہ میں ہم سب سوتے اور وہی ہمارا باورچی خانہ بھی تھا۔تھوڑی سی جگہ پر چاردیواری کر کے چھوٹا سا صحن تھا۔

اُن دنوں سردیوں میں ایک دو مرغیاں بھی ہمارے ساتھ ہی سوتی تھیں۔ ہمارا وہ گھر شاید کالے چیونٹوں کے بسیرے پر آباد تھا کہ وہ سردیاں گرمیاں شام ہوتے ہی فوج درفوج اپنا حق جماتے ہوئے نکل آتے۔ وہ اسقدر زیادہ تعداد میں ہوتے کہ ہم زمین پر پاؤں نہیں رکھ سکتے تھے۔ ہرروز امی جان چار پائیوں کے چاروں پاؤں کے نیچے پیالوں میں پانی بھر بھر کر رکھتی تھیں مگر وہ پھر بھی داؤ لگا کر ہمیں کاٹ جاتے۔ ان کیڑوں سے ہمارے گھر کی زمین کالی ہوجاتی تھی اوراُوپر سے مچھر اپنے خوفناک میوزک کے ساتھ رات بھر تابڑ توڑ حملے کرتے اور کبھی بھی اپناوار خالی نہ جانے دیتے۔ اُس وقت کی اذیت ناک راتیں آج کی خوشگوار اور میٹھی یادیں ہیں۔

ہمارے گھر کے سامنے احاطہ تھا جس میں وہ عورتیں رہتی تھیں جن کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا یعنی بیوائیں یا درویشوں کے خاندان آباد تھے۔ ان میں ہی میری ممانی جان اور اُن کے بچے بھی رہتے تھے۔ ماموں جان قادیان میں درویش تھے۔ اُن کی وجہ سے ہمیں یہ سہولت ملی کہ ہم احاطے سے بالٹیاں بھر بھر پانی لاتے اور نمازوں کے اوقات میں استانی برکت بی بی صاحبہ کی امامت میں باجماعت نمازیں بھی ادا کرتے۔ ہم اس گھر میں بہت تھوڑا عرصہ رہے وہ گھر غالباً ریلوے اسٹیشن کے قریب تھا۔

میری امی جان بہت جفاکش اور محنتی خاتون تھیں۔ ابا جان تو افریقہ میں تھے۔ ہم چار بہنیں اور ایک منا سا بھائی تھا جن کو امی ہر وقت اپنے پروں تلے دبائے ہر سکون پہنچانے کی کوشش میں لگی رہتیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں ہمارے لئے کافی مشکلات تھیں۔ ہمیں یہ تو یقین تھا کہ یہ ہمارا پہلا عارضی پڑاؤ ہے، مستقل منزل تو ابھی تلاش کرنی ہے۔ پھر جانے کیسے ہماری امی جان کو خالہ سائرہ اہلیہ شیخ محمد عبداللہ صاحب مل گئیں جنہوں نے میری امی جان کو

اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے گھر کا آدھا حصہ ہمیں کرایہ پر دینے کے لئے تیار ہیں۔ ہماری امی جان نے اُن کی یہ بات مان لی اوران کے آدھے گھر میں ہم کرایہ دار بن کر وہاں شفٹ ہو گئے۔ کمرہ تو یہاں بھی ایک ہی تھا مگر اس کے ساتھ برآمدہ بھی تھا جو ہمارا باورچی خانہ بن گیا،صحن بھی پہلے سے تھوڑا بڑا تھا۔ یہ گھر پہلے سے کچھ بڑا بھی تھا۔سارا گھر کچی اینٹوں اور مٹی سے ہی بنا ہوا تھا بارشوں کے دنوں میں چھت اتنی ٹپکتی کہ باہر بارش ختم ہو جاتی تھی لیکن ہمارے کمرے میں ہوتی رہتی تھی۔ہم اس بات سے بھی بہت خوش تھے کہ اُن موذی کیڑوں سے بھی جان چھوٹی۔البتہ مرغیوں سے ہمارا ساتھ نہیں چھوٹا۔ یہاں بھی وہ ہمارے ساتھ ہی آئی تھیں۔

اس گھر میں آتے ہی امی جان نے سب سے پہلے گھر میں پانی کا نل لگوایا۔اُن دنوں میں پانی کا نل لگوانا بہت بڑی بات ہوتی تھی اور دیکھنے کے لئے پورا محلہ اکٹھا ہو کر آتا تھا کہ دیکھیں پانی کیسا نکلتا ہے۔ ہماری خوش نصیبی کہ ہمارے گھر میں میٹھے پانی کی سبیل لگ گئی۔ ہماری امی جان نے گھر کے دروازے سب کے لئے کھول دئے جو بھی پانی لینا چاہے جب بھی چاہے لے سکتا ہے۔کئی بار تو ماشکی بھی پانی ہمارے گھر سے لیکر جاتے تھے۔اکثر محلے کی بچیاں رات کو پانی لینے آتی تھیں۔جب بھی جس کا جی چاہتا وہ پانی لینے آجاتا اس طرح ہمارے گھر میں رونق بھی رہتی۔الحمدللہ۔اس طرح ہماری امی جان کو اپنے محلے میں میٹھا پانی پلانے کا اعزاز حاصل ہوا۔

یہ گھر بھی ہماری منزل نہیں تھا۔خالہ جی سائرہ اوران کے بچوں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ان کے اور ہمارے گھر کے درمیان ایک بہت چھوٹی سی دیوار تھی جیسے گھر کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے ایسے ہی یہ دیوار بھی کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی جو بہت جلد بارشوں

کی نظر ہو جاتی تھی۔ خالو جی شیخ محمد عبداللہ صاحب کا لکڑیوں کا ٹال ہمارے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، وہ ہمارا اور ہمارے گھر کا بہت خیال رکھتے تھے،۔اُن دنوں زیادہ تر پلچھی (ایک قسم کا جنگلی پودا) جلائی جاتی تھی۔ بیچنے والے اُونٹوں پر پلچھی لیکر آتے اور ہماری امی جتنے بھی اونٹ ہوتے سارے ہی خرید لیتیں تھیں۔امی جان کی عادت تھی کہ وہ جو بھی چیز ہوتی ہمیشہ اکٹھی ہی خرید لیتیں، ربوہ کے آس پاس کے گاؤں سے دودھ، گھی، گندم بھی لوگ لے کر آتے تھے۔گندم چاول گھی تو آنوں کے حساب سے ہوتے تھے، گندم اور چاول سال بھر کے لئے خرید لیتیں۔

ایک دن میری امی جان کو خالہ سائرہ نے کہا دارالبرکات میں ہم زمین لینے لگے ہیں کیوں نہ ہم مل کر ایک کنال لے لیں۔ایک کنال میں دس مرلے ہم اور دس مرلے آپ لے لیں۔میری امی جان کو یہ بات بہت پسند آئی۔زمین انہوں نے پسند کی تو امی جان اور ہم بچوں کو بھی ساتھ لے کر گئیں۔اپنی امی جان کے مشیر ہم پانچوں بچے ہی تھے۔وہ جگہ دیکھنے گئے۔کلر، بیابان، پانی بھی نمکین، دور دور کوئی گھر نہیں تھا۔جو زمین ہم لے رہے تھے اس کے ساتھ پہلے سے ایک گھر بنا ہوا تھا جن کے اہل خانہ کو امی جان لائل پور (فیصل آباد) سے جانتی تھیں۔امی وہاں ان کے گھر چندہ لینے جایا کرتی تھیں۔میری امی جان نے زمین کے لئے حامی بھر لی اور خرید بھی لی۔اب زمین کے بعد مکان بنانے کی باری آئی تھی۔میرے ابا جان تو یہاں تھے نہیں۔میری امی جان نے سر دھڑ کی بازی لگا دی، دن رات مزدوروں کی نگرانی کی۔ گھر بن جانے پر ہم اپنا سامان ریڑھے پر لاد کر اپنے نئے اور مستقل گھر میں آ گئے۔وہ دن ہماری خوشیوں کا دن تھا کہ اب ہم بھی اپنے گھر اور پکے گھر والے ہو گئے تھے۔امی جان نے سب سے پہلے گھر میں پانی کا نل لگوایا۔پانی بے شک نمکین تھا مگر پانی کی ضرورت تو تھی۔ پینے

کے لئے ماشکی سے میٹھا پانی لیتے تھے۔اُس زمانے میں دور دور تک درخت کا نام ونشان نہیں تھا۔ایک دن میرے چھوٹے بہن بھائی باہر کہیں سے ایک کیکر کا چھوٹا سا پودا لے کرآئے۔وہ ہمارے گھر کا پہلا پودا تھا جس کو ہم صبح شام اپنے وضو اور منہ ہاتھ دھونے والے پانی سے سیراب کرتے تھے۔ہماری ساری فیملی اس پودے کے گرد گھومتی رہتی اور دیکھتی کہ کوئی نیا پتہ نکلا کہ نہیں..غرض وہ پودا بھی ہمارے ہاتھوں ہی جوان ہوا۔

اب ہم سب بھی بڑے ہو رہے تھے۔میں تو شروع دن سے ہی پڑھائی میں نکمی تھی اس لئے اپنی امی جان کے ساتھ گھر میں ان کا سہارا بن گئی۔میری بڑی بہن بھی گھر پر ہی ہوتی تھیں لیکن چھوٹے تینوں ایک بھائی اور دو بہنیں پڑھنے والے بچے نکلے۔گھر کے اندر باہر کے کاموں میں بھی وہ مجاہدوں کی طرح ہی ساتھ دیتے تھے۔ان دنوں ٹیلیویژن وغیرہ تو ہوتا نہیں تھا۔شکر ہے ہمارے گھر میں ایک چھوٹا سا بیٹری والا ریڈیو تھا جس سے ہم خبریں سنتے اور دنیا جہاں سے باخبر رہتے۔الفضل اور مصباح کے علاوہ دنیا بھر کے اخبار اور رسالے بھی ہمارے گھر آتے تھے۔

نیا گھر نئی جگہ اور اس زمانے کے لحاظ سے بڑے گھر کا بہت بڑا صحن۔کونے میں ٹائلٹ جہاں اکیلے جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔امی ہمیشہ سب کے ساتھ باری باری جاتیں اور باہر کھڑی ہو جاتیں۔سانپ اور بچھوؤں کا ڈر، کالی پیلی آندھیوں کا ڈر اور پھر جو سب سے بڑا ڈر ہمیں لگتا تھا وہ تھا چوروں کا ڈر۔روزانہ چوروں کے بارے میں قصے کہانیاں سنتے رہتے تھے۔گرمیوں میں مَیں اپنی چار پائی سب سے آخر پر بچھاتی اور دوسرے سرے پر امی جان کی ہوتی، درمیان میں باقی سب ہوتے۔ویسے ہم سب دو دو ہی سوتے تھے، چوروں کا زیادہ ڈر بھی گرمیوں میں ہی لگتا تھا۔ساری رات باہر کی دیواروں کی طرف دیکھتے گزرتی۔دل کو

بہلانے کے لئے چاندنی راتوں اور ستاروں سے باتیں ہوتیں ہم بہن بھائی ایک دوسرے کو بتاتے کہ بھئی میرا کون سا ستارہ ہے۔ ہر کوئی جو زیادہ چمکتا ستارہ ہوتا وہی اس کا مالک بن جاتا اور ہر روز رات کو وہ اپنا ستارہ ڈھونڈ تا، اس طرح سوتے جاگتے ہماری راتیں گزرتیں کوئی مہمان ہمارے گھر آجاتا تو ہماری کوشش ہوتی وہ واپس نہ جائے تاکہ ہمارے گھر میں رونق رہے۔

ہاں مَیں اپنے اس ریگستان کو کیسے بھول سکتی ہوں جہاں ہم گرمیوں کی ہر شام میں اندھیرا ہونے کا انتظار کرتے اور چاند کی چاندنی میں ہم سب لڑکیاں اپنے محافظوں کے ساتھ سیر کے لئے نکل آتیں۔عمروں کے لحاظ سے ٹولیاں بن جاتیں۔محافظوں میں ہماری امیاں ہوتیں اور لڑکیوں میں سید سردار حسین صاحب مرحوم کی بیٹیاں بھی ہماری ہمجولیاں ہوتیں۔ وہاں ان چاندنی راتوں میں میری بہنوں نے سائیکل چلانا سیکھا۔ یہ ہماری جامعہ احمدیہ کی گراؤنڈ تھی جو چٹیل میدان تھا۔ مجھے اچھی طرح تو یاد نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ صرف چند کمروں کی بلڈنگ ہی پورا جامعہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہمسائے بھی بہت اچھے دیئے ۔ ایک طرف تو وہی خالہ جی سائرہ...ان کی بھی چار بیٹیاں تھیں ۔ہم چار بہنیں اور ایک بھائی صرف فرق یہ تھا کہ ہمارا سب سے چھوٹا بھائی تھا، ان کا بڑا بھائی تھا وہ اپنے والدین کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔

ہم سب کا آپس میں بہت میل جول تھا۔درمیان میں ایک چھوٹی سی تو دیوار تھی اور وہ بھی اکثر آندھیوں اور بارشوں سے گری رہتی۔خالہ جی کے گھر ہمیشہ گائے بھینس ضرور ہوتی جس سے ہمیں دودھ وغیرہ میں بہت سہولت ہوتی۔ ویسے بھی یہ لوگ زمیندار تھے اس لئے مونجی اور گیہوں بھی ہماری اکٹھی ہی آجاتی تھی اور جب کبھی چور چور کا شور مچانا ہوتا تو ہم سب مل کر شور

بھی اکثر اکٹھے ہی مچا لیتے تھے۔ دو گھر لگتے ہی نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے کئی بار خالہ جی نے بھینس کا تازہ دودھ دوہتے ہوئے گلاس میں ڈال کر دینا کہ ''اے لوکڑیو تازہ دودھ پیو'' اور ہم نہ نہ کرتے ہوئے شوق سے یہ مزے دار دودھ پی بھی جاتے تھے۔ کئی بار ہم سب مل کر دریائے چناب پر بھی گئے اور کشتیوں کی سیر بھی کی۔

دوسری طرف کے بھی ہمسائے بہت اچھے تھے۔ ہمارے اس گھر میں آنے سے کچھ دیر ہی پہلے ان کی جوان بیٹی وفات پا گئی کیونکہ چودھری غلام حسین صاحب اور ان کی بیگم کے چھ بیٹے اور صرف ایک ہی بیٹی تھی۔ بیٹی کی بھی وفات ہوگئی تو ہم بہنوں کو وہ اپنی بیٹیوں کی طرح ہی پیار کرتے تھے۔ خاص طور پر میری چھوٹی بہن بشریٰ کو تو وہ ہاتھ پکڑ کر گھر لے جاتے۔ سب گھر والے اس کو بہت پیار کرتے تھے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ ہماری خالہ جی جن کا نام مہر النساء تھا، جو ایک بہت ہی صابر شاکر اور طبیعت کی حلیم بہت ہی پیار کرنے والی خاتون تھیں۔ وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ ان کا اس وقت سب سے چھوٹا بچہ چار سال کا تھا۔ غرض ان کے گھر کا شیرازہ ہی بکھر گیا اور پھر کچھ عرصہ کے بعد خالو جی غلام حسین صاحب کی بھی وفات ہو گئی۔ اب اس گھر میں کوئی ماں یا باپ نہ کوئی بہن ہی رہی۔ صرف چھوٹے بڑے مرد ہی رہ گئے تھے۔ ان حالات میں ہماری امی جان نے ان بچوں کا بہت ساتھ دیا۔ ہمیں بھی وہ سب بھائیوں ہی کی طرح تھے بلکہ ان سب کو ہم نے ہمیشہ بھائی ہی مانا۔ آج بھی بھائیوں کی ہی طرح دل میں قدر ہے۔ جب ہمیں چوروں سے ڈر لگتا تو ان بھائیوں کو ہی آواز دیتے تھے جو ہمیشہ ہمارے کام آتے۔ میرے بھائی خالد سے بھی ہمیشہ بھائیوں کی طرح ہی سلوک کیا۔

پنجابی کی مثل مشہور ہے کہ ہمسائے ماں پیو جائے۔ یہ مثل ہمارے گھروں پر پوری طرح

لاگوتھی کیاپکایا کیا کھایااور کیا کرنا ہے سب ایک دوسرے کوعلم ہوتا۔

ہم سب جوان ہو گئے ،شادیاں شروع ہوگئیں۔میری بہن کی شادی ہوگئی ہمارے ہمسائے بھائیوں کی بھی شادیاں ہوگئیں میری امی جان نے اور ہم سب نے بھر پور حصہ بھی لیا۔پھر ہم بہنیں بھی چڑیاں داچنبا ہوگئیں۔

ربوہ میں ہمیں کلر سے گھبراہٹ تھی چوروں اور آندھیوں سے ڈرتے تھے۔اکثر سوچتے تھے کیا کبھی ہم بھی اپنے ابا جان کے پاس افریقہ جاسکتے ہیں؟ وہ سچ ہو گیا اور آج مجھے ربوہ سے نکلے 42 سال ہو گئے ہیں ربوہ سے ایسے نکلے کہ باہر کے ہی ہو کر رہ گئے۔مَیں ربوہ میں صرف دس سال رہی ہوں باقی ساری زندگی ربوہ سے باہر ہی گزری ہے مگر سب کوفخر یہ بتاتی ہوں کہ ہم ربوہ سے ہیں۔جس جامعہ احمدیہ کے گراؤنڈ کو ریگستان کہتی تھی وہاں آج اتنی بڑی پھلوں اور پھولوں کی نرسری ہے جو سارے ربوہ کوگل وگلزار بنا رہی ہے اور ساتھ اتنی بڑی جامعہ کی بلڈنگ ہے جس سے گوہر پارے تیار ہوکر ساری دنیا میں روشنیاں بن کر چمک رہے ہیں۔

مَیں کئی مرتبہ ربوہ جا چکی ہوں۔پرانے والے ربوہ اور آج کے ربوہ میں زمین آسمان کا فرق ہے لہلہاتے درخت پھول سبزہ رونقیں...دل کرتا کہ میں پھر اپنے اسی ربوہ کے گھر میں واپس آجاؤں جو ہمارا گھر ہے میرے ماں باپ کا گھر میری بہنوں اور بھائی کا گھر ہے جس کی مجھے بہت یاد آتی ہے جہاں رات بھر چاندنی راتوں کا نور دیکھتے ستاروں کو گنتے چوروں سے ڈرتے دن نکل جاتا تھا۔ان بیتے دنوں کی یادیں آج مجھے بہت ستاتی ہیں۔

مَیں جانتی ہوں کہ آج بھی خدا کے فضل سے ربوہ کے آسمان پر وہی چاند اور ستارے چمک رہے ہونگے جن کو میں اپنا کہتی تھی۔خدا کرے کہ یہ چاند اور روشن ستارے میرے تمام

ربوہ کے باسیوں کو سکھ اور سکون پہنچاتے رہیں۔ ہمیں اپنے مرکز سے خوشی کی خبریں ملتی رہیں۔

جن ہمسائیوں کا میں نے ذکر کیا ان میں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ جو سلامت ہیں ان سب کی سلامتی کی ہمیشہ دعا مانگتی ہوں۔ میری امی، ابا جان اور ایک بہن ربوہ میں مدفون ہیں اور میرے شوہر نے لندن بروک وڈ قبرستان میں اپنا گھر بنا لیا۔ الحمدللہ آج مجھے یہاں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے مگر دل چاہتا ہے اور بہت چاہتا ہے کہ پھر واپس ربوہ لوٹ جاؤں۔ بس ربوہ کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

ربوہ رہے کعبہ کی بڑائی کا دعا گو
ربوہ کو پہنچتی رہیں کعبہ کی دعائیں

(الفضل 16 اکتوبر 2006ء)

○○

خلافت جوبلی کا بابرکت سال مَیں نے کیسا گزارا..!

پروگرام کے مطابق مجھے کینیڈا جانا ہی تھا۔ گو کہ مَیں یہ بھی جانتی تھی کہ ہمارے ہاں لندن والوں کے لئے 27 مئی 2008ء کو خلافت احمدیہ کی صد سالہ جوبلی کا بہت بڑا جلسہ لندن میں ایکسل سنٹر میں ہونے والا تھا، مگر میری مجبوری ایسی تھی کہ مجھے جانا ہی تھا اور میں چلی گئی۔ لیکن میری اس مجبوری نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا۔

ساری دنیا میں ہی یہ بابرکت سال دعاؤں سے اور جوش وخروش سے منایا جارہا تھا، اسی طرح کینیڈا میں بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ وہاں بھی اُتنا ہی جوش وخروش تھا جتنا کہ کہیں اور ہوتا۔ چھبیس کی رات اور ستائیس کی صبح شدید قسم کی سردی اور برف سے زیادہ جمی تیز ہوائیں ہمارے احمدیوں کے جذبہ جنون کو کہاں کم کرسکتی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی خواہش تھی کہ رات تہجد کے لئے پہنچ جائیں۔ زیادہ تر دور کے مرد اور قریب کی بے شمار عورتیں بھی بیت الاسلام میں جمع ہونے شروع ہوگئے جن کے رشتہ دار یا جاننے والے پیس ویلج میں رہتے تھے وہ سب بھی پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔

برف سے بھری سرد ہواؤں کی اس رات کے آخری پہر میں جب سردی کی وجہ سے

سڑکوں پر سناٹا ہوتا ہے ہر احمدی کا رُخ بیت الاسلام کی طرف تھا اور بیت الاسلام کی طرف آنے والی ہر سڑک احمدیوں کی گاڑیوں سے بھری پڑی تھی۔ بیت الاسلام اور پورے پیس ویلیج کو دلہن کی طرح سجایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے خیمے لگے ہوئے تھے اور اُن میں سردی کے بچاؤ کے لئے بڑے بڑے ہیٹر بھی لگے ہوئے تھے۔ ہم بھی سب علی الصبح بیت الاسلام پہنچ گئے جہاں ہم سے پہلے ہی خیموں میں بھی جگہ نہیں تھی۔ لوکل لوگ تو لحاف اور کمبل لیکر بیٹھے ہوئے تھے اور مَیں جو لندن سے جاتے ہوئے گرم کپڑے بھی چھوڑ کر سارے گرمیوں کے لحاظ سے گئی تھی، اُس ٹھنڈی اور برف سے بھری ہواؤں کا مقابلہ نہ کر سکی اور مجھے جلدی گھر آنا پڑا۔ ظاہر ہے میری وجہ سے سب بچوں کو بھی آنا پڑا۔ افسوس ہو رہا تھا کہ شائد ہم نے سب کچھ Miss کر دیا ہے۔ لیکن جب گھر آ کر ایم ٹی اے لگایا تو خوشی کی انتہا نہ رہی کہ لندن میں کوئی بجلی کی دشواری کی وجہ سے حضور کا پروگرام شروع نہیں ہو سکا تھا جو کہ اب تھوڑی دیر تک شروع ہونے والا تھا۔

الحمدللہ... خدا کے فضل و کرم کے ساتھ دُعاؤں اور روحانیت کے ماحول میں تمام دُنیا میں بسنے والے احمدیوں کے ساتھ 27 مئی 2008ء کو خلافت احمدیہ کی صد سالہ جوبلی کا جلسہ جو میں نے لندن کے ایکسل سنٹر میں بیٹھ کر دیکھنا تھا، مَیں نے بھی اس مبارک تقریب کو باقی دُنیا کے ساتھ شامل ہو کر ایم ٹی اے کے ذریعہ ہی دیکھا۔

حضور انور کا ارشاد سُنا... یقین نہیں آ رہا تھا کہ خدا تعالیٰ نے جس پودے کو خود اپنے ہاتھ سے لگایا تھا اُس شجر کو ہم آج اپنی آنکھوں سے پھل سے بھرا سایہ دار درخت دیکھ رہے ہیں اور اس کی جڑیں دنیا کے کناروں تک پھیل چکی ہیں۔ خدا کرے کہ احمدیت کی تاریخ کا ہر دن تاریخی بنا رہے اور سنہری باب رقم کرتا رہے۔ آمین ثم آمین۔

ہم سب نے اور بچوں نے بھی پروگرام کو بہت دل لگا کر سُنا اور دیکھا اور اُس حصہ کو خاص طور پر جہاں حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ نے تجدید عہد لیا۔ ہم سب گھر کے چھوٹے بڑوں نے کھڑے ہو کر آنسوؤں سے عہد بیعت کو دہرایا۔

اُس وقت دلوں کی ایک عجیب روحانی کیفیت تھی جس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ اِس روحانی کیفیت کا احساس صرف اور صرف ہم احمدی دل والے ہی لگا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہماری نسلوں کو یہ توفیق بخشے کہ ہم پہلے سے بھی بڑھ کر اپنے عہدِ بیعت کو نبھانے والے بنیں۔ آمین ثم آمین۔

آج کے اس مبارک دن کے لئے میرا اپنے بچوں سے وعدہ تھا کہ آج کی شام کھانے کی دعوت میری طرف سے ہوگی۔ سو اُس رات ڈنر ہم نے بہت اچھے ہوٹل میں کیا۔ الحمدللہ۔ اس طرح سے آج کا محبت بھرا شکر گزاری کے جذبات سے لبریز تاریخی دن اختتام پذیر ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد بچوں نے مجھے نیا گرا فال دکھانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ چلنے سے پہلے میں نے وعدہ لیا تھا کہ میں زیادہ لمبا نہیں چل پاؤں گی۔ اُنہوں نے کہا آج ہم صرف آپ کو ایک خاص جگہ لیکر جائیں گے۔ وہاں پہنچتے ہی پہلے تو بھوک کے ماروں نے ہوٹل میں کھانا کھایا، پھر اُس کے بعد مجھے لیکر چل پڑے اور وہاں جا کر رُکے جہاں خاص پروگرام بنایا ہوا تھا، جس کو دیکھ کر پہلے تو میری جان نکل گئی لیکن بچوں کے اصرار نے اور اُن کے پیار نے مجھے وہ کرنے پر مجبور کر دیا جو وہ چاہتے تھے یعنی Skylon Tower پر چڑھنا جسکی بلندی 160m ہے جسکی بناوٹ بالکل CN Tower جیسی ہے مگر اُس سے کافی چھوٹا ہے، اُس کی لفٹ بھی باہر کی طرف Bumble Bee کی شکل میں ہے۔ مجھے تو دیکھ کر ہی ڈر لگ رہا تھا پر اب مجھے جانا تھا اور میں گئی بھی مگر اُوپر جا کر مجھے افسوس نہیں ہوا کیونکہ جتنی مرتبہ بھی میں پہلے گئی

ہوں اتنا اچھا نظارہ نہ دیکھ سکی تھی جتنا کہ اس Skylon Tower پر جا کر دیکھا یعنی امریکہ اور کینیڈا دونوں طرف کا بھر پور نظارہ کر سکتے ہیں۔اس بات کے لئے میں نے اپنے پوتوں کا شکریہ ادا کیا۔اُس کے بعد شاہ زیب اور جہاں زیب دونوں (میرے پوتے) نے کہا دادی جان اب ہم کہیں اچھی سی جگہ بیٹھ کر آرام کرتے ہیں۔رش تو وہاں بہت ہوتا ہے ہمیں ایک خالی بینچ نظر آیا اور ہم وہاں جا کر بیٹھ گئے۔

جب بھی کینیڈا جاتی ہوں ہمیشہ یہ خواہش ہوتی کہ امریکہ بھی جاؤں گی کہ وہاں میرے بہت رشتہ دار ہیں۔خاص طور پر اپنے ماموں اور خالہ جی کو ضرور ملنا چاہتی تھی اور اس مرتبہ امریکہ کے جلسہ میں پہلی بار پیارے آقا کی آمد بھی تھی اور فیملی میں دو شادیاں تھیں اس لئے خالہ جی کا بہت صرار تھا۔بہت دعا میں لگی رہی کہ اللہ تعالیٰ کوئی سبب بنادے۔

دُعائیں تو اللہ تعالیٰ سُن لیتا ہے،میری بھی سُن لی۔19 جون کو کار کا سفر میں نے امریکہ کی خوبصورت وادیوں میں سے گزرتے ہوئے 9 گھنٹے میں طے کیا۔سارا سفر رات کا تھا۔ 20 جون جمعہ کو علی الصبح ہم فلاڈلفیا گھر پہنچے۔اُسی دن تھوڑا آرام کرنے کہ بعد سب گھر کے افراد جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے جو وہاں ہمارے گھر سے تقریباً تین چار گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ہوٹل بُک کروائے ہوئے تھے جو جلسہ گاہ Harrisburg کے بالکل قریب تھے۔ Harrisburg واشنگٹن ڈی سی سے 125 میل کے فاصلہ پر ہے۔یہ جلسہ کا پہلا دن تھا۔ ہماری چار پانچ گاڑیوں کا قافلہ راستہ میں رُکتے ہوئے جلسہ گاہ کی طرف گامزن تھا۔راستہ میں سُپر پاور کی Highway پر جماعت احمدیہ کے جلسہ سالانہ کی طرف راہنمائی کرتا ہوا سائن بورڈ دیکھ کر احمدی ہونے پر فخر محسوس ہوا اور الحمدللہ بھی بے اختیار منہ سے نکلا۔

جلسہ سالانہ کا انتظام ایک وسیع وعریض عمارت میں کیا گیا تھا۔جس کا بہت بڑا پارک

جس میں ہزاروں گاڑیاں پارک ہوسکتی ہیں اور بہت بڑے بڑے ہال جن میں بچوں اور بزرگوں کے لئے خاص طور پر موٹے موٹے کارپٹ ڈالے ہوئے تھے، جلسہ گاہ کو بہت خوبصورت رنگ برنگے بینرز سے جن پر حضرت مسیح موعودؑ کے پاک کلمات سے سجایا گیا تھا۔ ڈائنگ ہال میں کھانے کے انتظام کے تو کیا کہنے بہت ورائٹی تھی بہت اچھا انتظام تھا۔

یہاں کی صدر لجنہ اماءاللہ محترمہ ڈاکٹر شہناز بٹ صاحبہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتی ہوں جن کا اپنی لجنہ پر بھرپور کنٹرول اور لجنہ کا اپنی قیادت کے ساتھ پوراپورا تعاون دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خاص طور پر جس دن عورتوں میں حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ کی تقریر تھی، عورتوں کا ڈسپلن قابل تعریف تھا۔ جیسے جیسے صدر صاحبہ نے نصیحت فرمائی ویسے ویسے عورتوں نے عمل کیا یہاں تک کے حضور انور نے آتے ہی عورتوں کے ڈسپلن کی تعریف فرمائی۔ اللہ کرے کہ یہ جذبۂ محبت ہمیشہ قائم دائم رہے۔ آمین۔

کچھ دن امریکہ میں گزار کر واپسی بھی اُسی طرح جیسے کار سے گئے تھے، اُن کے ساتھ ہی کار میں واپس آئے۔ اور اب اگلے دن 27 جون 2008ء کینیڈا کا صد سالہ خلافت احمدیہ جوبلی کا تاریخی جلسہ اپنی تمام تر اعلیٰ دینی روایات کے ساتھ شروع ہونا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر بجالاؤں کم ہے۔ یہاں بھی پورے جوش خروش کے ساتھ ان بابرکت ایام میں حضور انور نے روح پرور اور ایمان افروز خطابات سے نوازا ہمیں سننے کی توفیق ملی ۔ یہاں بھی بڑے بڑے ایئر کنڈیشن ہال تھے اور پارکنگ کی تو کوئی مشکل ہی نہیں ہوتی ۔ ہماری جماعت کی ساری گاڑیاں پارک ہوکر بھی اتنی ہی جگہ ابھی باقی ہوتی ہے۔ الحمدللہ۔ ہماری جماعت پر اللہ تعالیٰ کے بڑے فضل ہیں ۔ دعا گو ہوں کہ اللہ پاک یہ رحمتوں کی بارشیں ہمیشہ برساتا رہے۔ آمین ثم آمین۔

مجھے یقین ہے کہ تمام احمدیہ جماعتوں میں ایسے ہی ہوتا ہوگا۔مگر میں لندن کے بارہ میں ضرور جانتی ہوں کہ جیسے ہی جلسہ اختتام پذیر ہوتا ہے اُسی دن سے اگلے سال کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔جلسوں کی کامیابی کا راز بھی اسی میں ہے، میں چونکہ دو بڑے بڑے ملکوں کے بہت ہی کامیاب جلسے دیکھ کر آ رہی ہوں اور بے حد متاثر بھی ہوں وہاں ایک چھت کے نیچے پورے کا پورا جلسہ دیکھا ہے۔یہاں یو.کے میں جتنی بھی کوشش کی جائے ایک چھت کے نیچے یہ سارے انتظام ممکن نہیں ہیں ۔الحمد للہ ہماری جماعت کو بہت اچھی جگہ حدیقۃ المہدی کی شکل میں مل گئی ہے جس کا حدود اربعہ بہت وسیع ہے اور انٹرنیشنل جلسہ کے لئے بہت کھلی جگہ ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میری اُمی اور ابا جان قادیان کے جلسوں کو بہت یاد کیا کرتے تھے اکثر وہاں کے قصے خاص طور پر بارش میں حضرت مصلح موعودؓ کی تقریریں جو لوگ چھ چھ گھنٹے بارش اور شدید سردی میں بھی ہلے بغیر سنتے تھے اُن مبارک دنوں کی یاد ہمیشہ وہ دہراتے رہتے تھے۔سچ ہے اُن مبارک ہستیوں کے جذبہ کو کون بھول سکتا ہے۔

پھر ربوہ کے جلسوں کو میں کیسے بھول سکتی ہوں ۔اُمی جان چھ ماہ پہلے چاول، گیہوں اور اسی قسم کا سوکھا دانہ دُنکا اکٹھا کرنا شروع کر دیتی تھیں ۔لحاف تکیے، گدے غرض ہر قسم کے بستر جو زمین پر بچھائے جا سکیں اور مہمانوں کو ہر طرح کا آرام میسر ہو سکے۔جلسہ کے قریبی دنوں میں انڈے، چلغوزے، مونگ پھلی، ریوڑیاں غرض بہت سارا ڈرائی فروٹ اور بے شمار مہمان نوازی کا سامان خریدا جاتا۔زمین پر بچھانے کے لئے کسیر (پرالی) آتی تھی۔صحن میں قنات لگتی اور ہماری ڈیوٹیاں گھر میں بھی اور گھر سے باہر بھی ہوتیں۔ماشاء اللہ مہمانوں سے گھر بھر جاتے، کون کہاں سویا کچھ خبر نہ ہوتی۔ربوہ کے جلسوں کے بارہ میں تو جتنا بھی لکھوں کم ہے۔

یہ جلسے ہماری روحانی بہتری اور تربیت کا ذریعہ بنتے۔غیر از جماعت لوگ بھی ہمارے جلسوں کی تعریف کرتے اور کہتے کہ جماعت کا ڈسپلن ، اطاعت اور آپس کی محبت بہت اعلیٰ مثال ہے۔

اب کافی حد تک ہم لندن میں بھی ان ہی باتوں کے عادی ہو چکے ہیں کہ یہاں بھی زیادہ تر مہمان گھروں میں ہی ٹھہرتے ہیں باوجود اس کے کہ باقی ملکوں کی نسبت یہاں کے گھر چھوٹے سڑکیں تنگ، بارشیں زیادہ، پارکنگ کی مشکلات، اگر گرمی ہو تو وہ بھی برداشت سے باہر مگر پھر بھی لندن کا انٹرنیشنل جلسہ اپنے تمام مہمانوں کا کھلے بازوؤں سے استقبال کرتا ہے اور مہمان بھی خندہ پیشانی سے اِن دنوں کی برکتوں کو سمیٹے، بغیر کسی شکوہ کے اگلے سال دوبارہ آنے کی حسرت لے کر جاتے ہیں ۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل ،حضرت مسیح موعودؑ کی دعاؤں اور خلافت کی برکتوں کا ہی نتیجہ ہے ۔ یو کے میں بعض مشکلات کے باوجود خلیفہ وقت کی موجودگی اور اُنکی نگرانی میں یہاں کا جلسہ ہمیشہ کامیاب ہوا۔اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ تمام وہ لوگ جہاں جہاں بھی وہ مشکلات اور نامساعد حالات کے باوجود ڈیوٹیاں دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کو جزائے خیر سے نوازے۔آمین ثم آمین۔

میں بھی نہ جانے خیالات کی رو میں بہہ کر کہاں سے کہاں نکل جاتی ہوں ۔اصل میں تو مَیں یہ بتا رہی تھی کہ مَیں نے جو بلی کا سال کیسے گزارا۔ مَیں اپنی دوست کے فلیٹ میں وقتی طور پر اکیلی ٹھہری ہوئی تھی ،جلسہ کے لئے مَیں خود سے نہیں جا سکتی تھی سو میں اپنی بڑی بیٹی لبنیٰ کے گھر چلی گئی ۔اُسکی ڈیوٹی چونکہ چوبیس گھنٹے جلسہ سالانہ کے دفتر میں ہوتی تھی اس لئے مجھے جلسہ پر جانے کی سہولت ہوگئی۔الحمدللہ۔

مَیں نے جوبلی جلسہ سالانہ کے تینوں بابرکت ایام میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الخامس

ایدہ اللہ تعالیٰ کے روح پرور ایمان افروز خطابات کو سنا۔ جلسہ کے بعد میں اپنے فلیٹ میں واپس آ گئی۔ رات کو میرا بیٹا میرے پاس ہوتا مگر دن کو مجھے اکیلے میں بہت گھبراہٹ ہوتی تھی ہمارا گھر مکمل ہونے میں ابھی بھی وقت درکار تھا۔

کینیڈا آنے سے پہلے بچوں نے مجھے سمجھانے کی کافی کوشش کی تھی کہ آپ اکیلے نہیں رہ سکتے، مت جانے کی کوشش کریں مگر مَیں نہ مانی مجھے یقین تھا کہ بہت لوگ اکیلے رہتے ہیں مَیں بھی رہ سکتی ہوں۔ کیونکہ مَیں کسی صورت میں بھی لنڈن کا جوبلی کا جلسہ اور رمضان شریف یو.کے سے باہر نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ جلسہ تو میں نے الحمد للہ بہت اچھی طرح گزار لیا مگر رمضان شریف میں میرے لئے اکیلے رہنا مشکل ہو گیا۔ میرا بیٹا بلال جو برسلز (بیلجیم) میں رہتا ہے وہ آ کر مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ عید کے بعد کافی حد تک ہمارا گھر مکمل ہو چکا تھا اور میں اپنے گھر واپس آ گئی۔

اب قادیان کے صد سالہ خلافت جوبلی کی شدت سے انتظار تھی۔ حضور انور اور بہت سے لوگ تو جا بھی چکے تھے کہ اچانک حالات نے پلٹا کھایا اور سارے پروگرام بدلنے پڑے۔ ہم احمدی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی اور خوش رہنے والے لوگ ہیں یہی حضرت مسیح موعودؑ اور ہمارے خلفائے احمدیت ہمیں سبق دیتے ہیں۔ انشااللہ آئندہ اس سے بھی بڑھ کر ہمارے جلسے ہونگے اور بہترین شان شوکت سے ہونگے۔

الحمد للہ..! ہماری جماعت کا تو یہ حال ہے کہ اگر ہمارا ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو سو کھل جاتے ہیں۔ یہ سب خلافت کی برکتیں ہیں۔ ہمیں دُعائیں کرنی چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حضور خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کو صحت والی لمبی زندگی عطا کرے اور ہم سب خلافت کی برکتوں سے فیضیاب ہوتے رہیں اور اُنکی قیادت میں دن دگنی اور رات چوگنی

ترقیاں دیکھیں۔آمین ثم آمین۔

آخر میں امۃ الباری ناصر کے دو اشعار لکھتی ہوں:

صد شکر کہ ہم اس گلشن میں آرام وسکوں سے رہتے ہیں
صد شکر کہ ہم ان میں سے نہیں جو دشتِ خار میں رہتے ہیں
بچوں کو وصیت ہے میری، وابستہ خلافت سے رہنا
جو رشتہ شجر سے رکھتے ہیں، وہ پھیلتے، پھولتے، پھلتے ہیں

(ماہنامہ مصباح اکتوبر 2010ء)

○○

چیف گیسٹ

آج میں ایک بہت پرانا واقعہ لکھنے لگی ہوں۔ لکھنے سے پہلے اُن سب لوگوں سے پیشگی معذرت خواوہ ہوں جن کے بارہ میں لکھنے لگی ہوں۔ کیونکہ بہت پرانی یادیں ہیں ہوسکتا ہے کچھ بھول گئی ہوں اور بات آگے پیچھے یا غلط ہوجائے۔ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتی ہوں تو لبوں پہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔ کسی کی دل آزاری کرنا مقصد نہیں صرف آپ سب کو بھی ان مسکراہٹوں میں شامل کرنا چاہتی ہوں۔

جلینگھم میں میرے کزن کے بیٹے کی شادی میں شمولیت کا دعوت نامہ ملا تھا۔ صبح کو جا کر شام کو واپس آنا تھا۔ بڑی سخت سردیوں کے چھوٹے چھوٹے دن تھے۔ سامی صاحب مرحوم ویسے ہی لمبی ڈرائیو سے گھبراتے تھے اس لئے جلینگھم ڈرائیو کر کے جانا تو اُن کے لئے بہت بڑی بات تھی، سو ہم نے ٹرین پر جانے کا پروگرام بنالیا اور سچ بات تو یہ بھی تھی کہ ہمیں جانا اور آنا بالکل فری تھا کیونکہ سامی صاحب ریلوے ہی کے تو ملازم تھے اور ریلوے اسٹیشن بھی ہمارے گھر کے قریب تھا۔

ہمارے ساتھ ہماری چھوٹی بیٹی سارہ بھی تھی۔ جانے سے پہلے جہاں ہم نے جانا تھا

وہاں کی ساری معلومات لے لیں اور جن کے گھر جانا تھا اُن کو یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کوئی ہمیں اسٹیشن پر لینے آجائے تو اچھا ہے ورنہ ہم ٹیکسی لے کر خود ہی وہاں پہنچ جائیں گے۔ جب ہم ٹرین میں بیٹھے تو اچانک سامی صاحب نے دیکھا کہ ایک احمدی لڑکا بھی ہمارے قریب ہی بیٹھا ہوا ہے، سامی نے اُس کو پوچھا ''تم کہاں جارہے ہو؟ اُس کا جواب تھا جلینگھم۔

اب اس وقت مجھے یہ تو یاد نہیں رہا کہ وہ بھی شادی پر جارہا تھا یا کسی کو ملنے۔ لیکن ہاں وہ جا پہلی بار ہی رہا تھا، یعنی ہماری طرح تھوڑا گھبرایا ہوا سا۔ جلینگھم کونسا دور ہے، جیسے ہی ہماری ٹرین اسٹیشن پر رُکی تو سامنے ہی ہم نے ایک سوٹیڈ بوٹڈ صاحب کو کھڑے دیکھا۔ ہمارے نیچے اُترتے ہی سوال کیا کہ آپ لندن سے آرہے ہیں؟ ہم نے جواب دیا جی ہاں، ہم شادی پر آئے ہیں، تو وہ ایکدم بولے کہ میں آپ کو ہی لینے آیا ہوں اور یہ کہ ہم سب بھی شادی پر جائیں گے اور ساتھ ہی سامی صاحب کے ہاتھ میں جو بیگ تھا اُنہوں نے اِن کے ہاتھ سے لینا چاہا جو سامی اُن کو نہیں دینا چاہ رہے تھے کہ وہ خود ہی اُٹھا لیں گے مگر اُن صاحب نے زبردستی بیگ لے لیا اور کہا'' آپ ہمارے مہمان ہیں''

وہ صاحب بھی سامی صاحب کی عمر کے ہی ہونگے۔ وہ کہنے لگے کہ آپ پہلے ہمارے گھر چلیں۔ کھانا کھا کر پھر وہاں چلتے ہیں ویسے ہم نے بھی شادی پر تو جانا ہی ہے۔

مَیں دل میں اپنی بھابی کو بہت دعائیں دے رہی تھی کہ اتنی مصروفیت کے باوجود اُنہوں نے ہمارا اتنا خیال رکھا کہ اسٹیشن پر کسی کو بھیج دیا۔ پر میں نے دل میں سوچا اگر کسی کو بھیجنا ہی تھا تو کسی بچے کو بھیج دیتیں بھلا ان کو کیوں؟ اور پھر وہ صاحب ہمیں اپنے گھر جانے کے لئے بھی اتنا اصرار کررہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ کھانا تو ہم وہاں جا کر ہی کھائیں گے مگر ہاں واپسی پہ ہم آپ کے گھر ضرور ہو کر جائیں گے۔ شادی ہال میں جب ہم پہنچے تو ظاہر ہے وہاں میرے

رشتہ دار اور جماعت کے کافی لوگ تھے جن سے میں مل رہی تھی مگر سب سے زیادہ جو آؤ بھگت کرنے والی فیملی تھی وہ اُن صاحب کی ہی تھی جو ہمیں اسٹیشن سے لیکر آئے تھے۔ ہمیں سپیشل ٹریٹمنٹ مل رہی تھی۔ میں اور میری بیٹی بہت حیران ہو رہے تھے کہ بات کیا ہے مگر ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

اُنہوں نے ہمارے ساتھ ایسٹ لندن کی باتیں شروع کر دیں، ہم وہاں تقریباً آٹھ دس سال رہ کر ابھی ابھی Move ہوئے تھے سو اُن کی ہر بات کا جواب ہمارے پاس موجود تھا۔ یہ بات بھی میری سمجھ سے باہر تھی کہ اس وقت یہ ایسٹ لندن کی اتنی معلومات کیوں لے رہی ہیں؟ اُدھر وہ ماں بیٹی بھی بہت حیران تھیں کہ آپ یہاں ان سب کو جانتی ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ سب میرے رشتہ دار ہیں، مگر ہماری طرح اُن بیچاروں کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ ہے کیا؟ تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد ہماری خاطر داری میں جو گرم جوشی تھی وہ کم ہو گئی۔ دونوں ماں بیٹی میں سے ایک غائب تھیں۔ کھانا کھا کر لوگ ایک دوسرے کو مل رہے تھے۔

پھر سامی صاحب ہمارے پاس آئے تو کہتے ہیں بھئی آج تو حد ہی ہو گئی میری تو اس قدر خاطر مدارت ہوئی ہے، کہنے لگے سمجھ نہیں آئی جو صاحب ہمیں لیکر آئے تھے وہ میرا سب کے ساتھ تعارف کروا رہے تھے، کھانے میں بھی مجھے ہی سپیشل ٹریٹمنٹ مل رہا تھا جب کہ صرف میں ان صاحب کو ہی نہیں جانتا تھا، باقی سب میرے جاننے والے ہیں اور تقریباً زیادہ تر لوگ لندن سے ہی ہیں بھلا میرا تعارف کیوں!

سامی کہتے ہیں مگر ابھی تھوڑی دیر ہوئی اُنکو کوئی بلا کر لے گیا ہے نظر نہیں آئے۔ مَیں پوچھنے آیا ہوں کہ کب جانا ہے؟ مَیں نے کہا میں بھابی سے پوچھتی ہوں اور اُن کو بتا کر چلتے

ہیں۔ مَیں نے اپنی بھابی سے رخصت چاہی کہ رات ہو جائے گی اس لئے ہمیں اب چلنا چاہئے۔ اُس نے کہا فکر نہ کرو آپ کو کوئی اسٹیشن تک چھوڑ آئے گا، مَیں نے کہا نہیں جن صاحب کو آپ نے صبح ہمیں لینے کے لئے بھیجا تھا وہی چھوڑ دیں گے، وہ حیران ہوکر بولیں ''ہائیں'' میں نے تو کسی کو نہیں بھیجا کوئی فارغ ہی نہیں تھا۔ پوچھنے لگیں آپ کو کون لیکر آیا تھا؟ میں نے کہا میں تو نہیں جانتی کہ وہ کون ہیں۔ پھر میں نے ساری بات اُن کو بتائی وہ حیران تو بہت ہوئیں مگر بہت مصروف تھیں اتنی دیر میں اُن ماں بیٹی کی بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ کوئی گڑ بڑ ہے ضرور۔ اُن کی بیٹی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ ہمارے گھر کوئی مہمان آئے ہیں ہم لوگ گھر جا رہے ہیں مگر اسٹیشن پر میں ہی چھوڑ وں گی میں تھوڑی دیر تک آتی ہوں۔ ہم نے کہا کوئی بات نہیں ہم انتظار کریں گے۔ چونکہ ہم مروت میں تھے کہ صبح سے ان لوگوں نے ہمارے لئے اتنی بھاگ دوڑ کی ہے، اگر ہم تھوڑے لیٹ بھی ہو گئے تو کوئی بات نہیں مگر اب ہم ان کے گھر ضرور ہوکر ہی جائیں گے۔

واپسی پر اُنکی بیٹی ہمیں لینے آئی تو راز کھلا کہ ماجرا ہے کیا؟ ایسٹ لندن سے کسی فیملی نے اُن کے گھر آنا تھا۔ ایک دو بچے بھی اُن کے ساتھ تھے اور آنا بھی ٹرین پر ہی تھا۔ بدقسمتی سے اُن کی ٹرین لیٹ ہوگئی اور ہماری ٹرین پہلے آ گئی اور اس طرح ہم انجانے میں چیف گیسٹ بن گئے۔ اور وہ مہمان بچارے دو ڈھائی گھنٹے اسٹیشن پر بیٹھے رہے کہ گھر والے تو ہماری خاطر مدارات میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی گھر ہوتا تو اُن کا فون سنتا۔ وہ بچارے تھک ہار کر واپس جانے والے تھے کہ نہ جانے کیسے اِن کے ساتھ رابطہ ہوا اور اُن کو گھر لیکر آئے۔ واپس جانے کے لئے پھر اُن کی بیٹی ہمارے پاس آئی اسٹیشن پر اُس نے ہی چھوڑنا تھا کہ یہی پروگرام تھا، جاتے ہوئے حسبِ وعدہ وہ ہمیں اپنے گھر بھی لیکر گئیں، گرم جوشی بالکل کم ہو چکی تھی۔ اُن کے

مہمان تھکے ہارے کھانا کھا رہے تھے، ہم بھی دل میں تھوڑے شرمندہ شرمندہ سے تھے اور وہ بھی چُپ چُپ سے تھے۔ مگر ہمارے لئے اتنا ضرور ہوا کہ ہمارا ایک اچھی فیملی سے ملنا ہو گیا۔

اس واقعہ کو بہت عرصہ گزر چکا ہے۔ سامی صاحب اور وہ ہمارے مہربان میزبان بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن دونوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ جب بھی کبھی جلسہ یا اور کوئی بھی جماعتی تقریب ہوتی تھی تو ہم بہت گرم جوشی اور محبت سے ہلکی سی مسکراہٹ سے ملتے تھے۔

سچ یاد آیا اسٹیشن سے اُترنے کے بعد اس خوشی میں کہ ہمیں کوئی لینے آ گیا ہے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ وہ بیچارہ لڑکا کہاں گیا جس کو تھوڑی دیر پہلے دل میں ہم اپنا سہارا بنائے بیٹھے تھے۔ مَیں نے جو یہ سب لکھا ہے محض ایک دلچسپی کے لئے ہے۔ شاید کہ آپ سب کے لبوں پر تھوڑی سی مسکراہٹ لاسکوں۔ یہ یاد مجھے بہت عزیز بھی ہے اور بہت میٹھی بھی کہ ہم بھی مفت میں چیف گیسٹ بن گئے۔

(مطبوعہ اخبار احمدیہ)

○○

شہادت

اسلام کی پوری تاریخ شہادتوں اور قربانیوں پر مشتمل ہے اور تا قیامت یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ کیونکہ سچ اور جھوٹ کا مقابلہ ہمیشہ ہوتا رہا اور ہمیشہ سچ ہی کی فتح ہوئی۔ مگر اس فتح کے لئے بھی ہزاروں جانوں کا نذانہ پیش کرنا پڑتا ہے چاہے وہ جان کا ہو یا سچی گواہی کا ہو۔ سچی گواہی بھی کئی مرتبہ جانوں کا نذرانہ مانگتی ہے اور یہ سچ ہی ہے جو انسانوں کو بہادر بنا کر شہادت کا رُتبہ عطا کرتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام قومیں شہادت کو زندگی اور حرکت وحرارت کو طاقت کا سر چشمہ مانتی ہیں ۔کسی بھی مقصد کے لئے جان کی قربانی دینا ہزاروں سال کی زندگی سے بہتر ہے آزمائش کے وقت جان کی قربانی عین ایمان ہے۔

سچائی ہمیشہ غالب رہی حضرت ابراہیمؑ ہوں یا حضرت موسیٰ ؑ ،دشمنوں نے پوری کوشش کی کہ اسلام کے نورانی راستہ کو روک سکیں اور ہمارے پیارے آقا رسول کریم ﷺ کو ہمیشہ فتح نصیب ہوئی ۔ چاہے جنگ بدر ہو یا جنگ اُحد تمام صحابی ہمیشہ نبی کریم ﷺ کے شانہ بشانہ لڑتے اور کوئی بھی اپنی جان کی پرواہ نہ کرتا شہادت کو اپنے لئے عین سعادت سمجھتے۔

یہ ایک مشہور واقعہ ہے اس کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں، جب ایک جنگ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو ایک صحابیہ روتے ہوئے جنگ کے میدان کی طرف بھاگیں اور روتے ہوئے لوگوں سے پوچھتی جاتیں کہ لوگو بتاؤ میرے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ تو ایک صحابی نے کہا کہ تیرا خاوند شہید ہو گیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھ رہی ہوں؟ اُنہوں نے پھر جواب دیا کہ تمہارا بیٹا شہید ہو گیا ہے۔ اُس نے روتے ہوئے پوچھا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پوچھ رہی ہوں؟ اُس نے کہا کہ تمہارا دوسرا بیٹا بھی شہید ہو گیا ہے، مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے ہیں مگر ٹھیک ہیں، تو اُن صحابیہ نے سُکھ کا سانس لیکر کہا ہزار بیٹے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان اگر وہ ٹھیک ہیں تو سب ٹھیک ہے۔

خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ، شہید ہوئے، حضرت عثمانؓ شہید ہوئے اور حضرت علیؓ شہید ہوئے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ:

''عمرؓ جو ایک وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے نکلے تھے وہ دوسرے وقت میں اسلام کے لئے خود شہید ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں یہ توفیق عطا فرمائی کہ بقیہ زندگی اسلام کی خدمت میں صرف کر کے شہادت کے رتبہ پر فائز ہوئے۔''

اور پھر حضرت حسینؓ کی شہادت جب تک یہ دنیا آباد ہے اُن کا سوگ منایا جاتا رہے گا۔ حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں:

''میری جان و دل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال پر فدا ہیں اور میری خاک آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کوچہ پر قربان۔'' (ترجمہ از فارسی منظوم کلام)

(مجموعہ اشتہارات جلد اوّل ص 97)

پھر حضور علیہ السلام فرماتے ہیں:

''حضرت امام حسین سید المظلومین تھے۔''

(ترجمہ عربی عبارت سر الخلافہ۔روحانی خزائن جلد 8 ص353)

یہ تو وہ شہادتیں ہیں جو ہمارے نبی ﷺ کے زمانہ یا اُن کے پیاروں کی شہادتیں ہیں وہاں یہ زمانہ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ یہ تو نہ ختم ہونے والا ایسا سلسلہ ہے جو آج بھی اپنی اُسی آن بان اور شان سے زندہ ہے۔لوگ سچ بولنے سے نہیں ڈرتے، اپنی جان کی قربانی سے نہیں گھبراتے۔اپنے ایمان کے مضبوط اور دین کے پکے لوگ آج بھی اُنہیں روایات کے پابند ہیں اور جان کی بازی لگانے کے لئے تیار رہتے ہیں جیسے چودہ سو سال پہلے تھے۔چودہ سو سال کے بعد اُونگھتے ہوئے اسلام کو دوبارہ زندگی دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے مامور کو مبعوث فرمایا اور حضرت مسیح موعودؑ کی نبوت نے زندگیوں میں دین کی نئی روح پھونکی اور پھر ایک بار وہی دین کے سپاہی اور جان نثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

جماعت احمدیہ کے شہیدوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔افغانستان سے لیکر سندھ تک اور کوئٹہ سے لیکر فیصل آباد، گوجرانوالہ سے لیکر اسلام آباد اور بنگلہ دیش سے سری لنکا تک بیش بہا جانوں کے نذرانے پیش کئے جا چکے ہیں۔

حضرت مسیح موعودؑ کے الہام کے ایک سال بعد 1901ء میں پہلے شہید صحابی حضرت مولوی عبدالرحمٰن خان صاحبؓ اور 1903ء میں حضرت صاحبزادہ سید عبد اللطیف صاحبؓ کی شہادت کو ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔وہ دین کے شیر جس طرح شہید کئے گئے، اُس ظلم کی مثال ملنی مشکل ہے۔حضرت صاحبزادہ سید عبد اللطیف صاحبؓ کو سنگسار کرنا اور اُن کا ہر پتھر لگنے کے بعد اپنے ایمان کی تصدیق کرنا، ایمان کامل ہونے کا ثبوت ہے۔بہت

زور لگایا ظالموں نے کہ اب بھی احمدیت سے انکار کر دو مگر اُن اللہ کے شیروں کی کلمہ توحید پڑھتے ہوئے سانسیں بند ہوگئیں، مگر زبان سے اُف نہیں نکلا۔ آج تک افغانستان اُن کے گرے ہوئے خون کا بدلہ چکا رہا ہے۔ سندھ کی زمین بھی احمدیوں کے خون سے لال ہے۔ چک مونگ رسول کی مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے شہید ہونے والے بچوں بوڑھوں اور نوجوانوں کا خون کبھی نہیں سوکھ سکتا۔

شہادت کے اعزاز سے حضرت مسیح موعودؑ کے خاندان کو بھی اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے۔ ربوہ کی سرزمین کو ناز ہے کہ اُس نے مرزا غلام قادر صاحب شہید پیدا کیا جس نے شہادت کا رتبہ حاصل کر کے پوری جماعت احمدیہ کا سرفخر سے بلند کر دیا۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

اور جو بھی اللہ کی اور اِس کے رسول کی اطاعت کرے تو یہی وہ لوگ ہیں جو اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ (یعنی) نبیوں میں صدیقوں میں شہیدوں میں سے اور صالحین میں سے۔ اور یہ بہت ہی اچھے ساتھی ہیں۔ (النساء:70)

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ پیارے حضور خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے اپنے خطبہ میں فرمایا تھا وہ لوگ جو دین کی خدمت کرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہوتے ہیں وہ سب بھی شہادت کا ہی رُتبہ پاتے ہیں۔ ایسے ہمارے سلسلہ کے بہت سے مبلغین ہیں جنہوں نے وطن سے دور اپنے پیاروں کے بغیر دین کی راہ میں اپنی جان نثار کی۔

یہ سچے اور کھرے لوگ جنہوں نے تقدّس وطہارت کا راستہ اپنایا تو خدا تعالیٰ نے بھی اُن کو قبولیت کا شرف بخشا۔ یہ جھوٹ سے نفرت کرنے والے ہمیشہ سچی گواہی دینے والے اور اپنی جان پر کھیل کر شہادت کا رُتبہ پانے والے ہمیشہ اس دُنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے۔

انشاءاللہ۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دُنیا پر حق واضح کیا اور حق کی سربلندی کے لئے ایسی لازوال قربانیاں پیش کیں جو ہمیشہ حق کو سربلند کرتی رہیں گی اور رہتی دُنیا تک نور پھیلاتی رہیں گی اور روشنی کے یہ چراغ ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ انشاءاللہ۔

(مضمون شہادت۔مطبوعہ اخبار احمدیہ۔اپریل،مئی،2008ء)

○○

اللہ کے گھر اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قدموں میں

دسمبر 2007 میں ہمارا آٹھ احمدیوں پر مشتمل گروپ جن میں تین مرد اور پانچ عورتیں شامل تھیں چارٹرڈ ائیر لائن سے مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے۔ تقریباً چھ یا سات گھنٹے کی فلائٹ کے بعد ہم مدینہ ائیر پورٹ پر اُترے۔ کوئی خاص رش نہیں تھا، ہماری فلائٹ کے ہی مسافر تھے۔ جلدی فارغ ہو کر ہم اپنا اپنا سامان لیکر باہر آ گئے۔ بتاتی چلوں کہ ہمارے معلم ہمارے ساتھ ہی سفر کر رہے تھے جو ہر بات میں ہمیں گائیڈ کرتے تھے۔ ہم کوچ میں بیٹھ گئے اور دیارِ نبی کی طرف روانگی شروع ہوگئی، دل کا حال میں کیا بتاؤں، اُس بستی اور اُس دھرتی پر پاؤں رکھے تھے جو میرے آقا حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سرزمین تھی اور میرا رُخ مسجد نبوی کی طرف تھا، دل میں خوش تو بہت تھی مگر دل ودماغ میں ایک خوف بھی طاری تھا، سوچ رہی تھی کہ کیا میں وہ سب کر سکوں گی جو حج کے فرائض ہیں؟ اپنے آپ پر یقین نہیں تھا۔ انہیں سوچوں میں تھی کہ سامنے مسجد نبوی کے وہ روشن مینار نظر آنے شروع ہو گئے۔ جن کے نور کی روشنی سے ساری دنیا میں اُجالا ہے۔ اتنی خوبصورت روشنی کیوں نہ ہو اُس سبز گنبد کا مکیں نوروں کا بادشاہ نور مدفون ہے جس سے ساری دنیا منور ہو چکی ہے۔ الحمد للہ ہم اُس ہوٹل میں پہنچ گئے

جہاں ہمارے رہنے کا انتظام تھا، چونکہ میں اپنے حاجیوں کے گروپ میں آخر میں شامل ہوئی تھی ،لہٰذا میری رہائش کی جگہ بھی اپنوں سے علیحدہ تھی ، مجھے وہاں اجنبی عورتوں کے ساتھ رہنے میں بہت گھبراہٹ تھی اور میری محسن بہنوں نے مجھے اکیلے نہیں رہنے دیا گو کہ چار بیڈروم میں ہم پانچ کو رہنا تھا مگر باقی میری بہنوں نے تکلیف اُٹھا کر مجھے سہولت دی اور مجھے اپنے ساتھ ہی رکھا۔

الحمدللہ ہمیں بہت اچھے ہوٹل میں جگہ ملی ۔سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی مسجد نبویؐ کا صحن تھا۔جس سے ہمیں یہ سہولت ہوگئی کہ جب مرضی ہم مسجد نبوی میں جا سکتے تھے اور اکیلے جانے میں بھی کوئی دشواری نہیں تھی ۔ ہرکوئی آزادی سے اپنی مرضی کے مطابق عبادات کے لئے جا سکتا تھا۔لیکن ہم سب اکثر اکٹھے ہی جاتے تھے ۔اگلے دن ہم نے روضۂ مبارک کی زیارت کرنی تھی ۔عورتوں اور مردوں کیلئے زیارت کے وقت مقرر ہیں ۔ یہاں بہت ہجوم رہتا ہے اور خاص طور پر حج کے دنوں میں تو بے تحاشا ہجوم ہوتا ہے ۔ یہ وقت صرف عورتوں کے لئے ہی مخصوص ہے ۔ہم بھی دیدار کے پیاسوں میں کھڑے ہو گئے ، چونکہ بشریٰ عشرت صاحبہ اس سے قبل کافی مرتبہ زیارت روضہ کر چکی تھیں وہ جانتی تھیں کہ کیسے اندر جانا ہے، اس لئے وہ یہاں بھی ہماری رہبر بنیں ۔اُنہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس طرح میرے بعد میری باقی بہنوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ لیا اور اُس گیٹ کے کھلنے کی انتظار میں دعائیں کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے جس کے دیدار کے لئے آنکھیں ترستی ہیں ۔ جیسے ہی گیٹ کھلا لوگ دیوانوں کی طرح اُس آقا کے روضہ ءمبارک کی طرف بھاگے جس کا نام حضرت محمد ﷺ ہے اور جو اللہ کا سب سے پیارا محبوب ہے ۔

یوں تو پوری مسجد نبویؐ ہی خیر و برکت کا خزانہ ہے مگر ریاض الجنہ اس خزانہ کا انمول حصہ

ہے۔اس پر سبز قالین کا فرش رہتا ہے،نوافل پڑھنے والوں کا یہاں پر ہجوم رہتا ہے۔ یہ قطعہ جنت کا ٹکڑا بھی کہلاتا ہے۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ وہاں سجدہ شکر ادا کر سکے اُن میں ہم بھی شامل تھے۔

ہمیں بھی سبز قالین والے حصہ میں آٹھ سفید ستونوں میں سے ایک بابرکت ستون کے ساتھ جگہ مل گئی۔ پہنچ کر شکرانہ کے دو نفل ادا کئے دعائیں کیں سامنے میرے آقا مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روضۂ مبارک تھا جن کے لئے یہ دو جہاں وجود میں آئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرا پورے کا پورا جسم پگھل گیا ہے۔ جو بھی دل سے اور زبان سے بے ساختہ دعائیں نکلیں مانگتی گئی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ایک ہی جذبہ تھا کہ مَیں اللہ تعالیٰ کے گھر میں اُس کے محبوب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے حضور سر جھکائے کھڑی ہوں۔اللہ تعالیٰ ہماری یہ زاریاں قبول فرمائے۔آمین۔

اگلے دن ہم نے مدینہ منورہ کی وہ خاک دیکھی جن پر میرے پیارے آقا ومولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک قدم پڑے ہوں گے،مبارک مساجد کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی خاص طور پر مسجد جمعہ، مسجد قبلتین میں اور مسجد قباء میں دو دو نفل ادا کرنے کی توفیق نصیب ہوئی۔الحمد للہ۔اُس کے بعد ہم نے زیارت شہداء احد پر حاضری دی۔جبل رُماۃ دیکھی اور حضرت حمزہؓ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ کے مزار پر حاضری دی اور دعائیں کیں۔ پھر ہم سب نے احرام باندھے اور دیارِ نبی سے بستیوں کی ماں مکّہ مکرمہ بیت الحرام کی طرف روانگی شروع ہوئی ہمارے حج کی ابتدا شروع ہوگئی۔ ایمیگریشن اور وہاں کے قانونی مراحل سے گزرے۔ مسجد ذوالحلیفہ میں نفل ادا کئے اور تلبیہ کا ورد شروع ہوگیا، رات کا وقت تھا ہر قوم و نسل کی بے شمار خلقت تھی۔یقین نہیں آرہا تھا کہ مَیں یہاں ہوں۔ ہمارے معلم تلبیہ پڑھتے

جاتے تھے اور ہم اُونچی آواز میں دہراتے جا رہے تھے۔ یہاں بھی ہم سب نے ایک دوسرے کو پکڑا ہوا تھا۔ ہمارے معلم صاحب کی بھی ہمیں یہی تاکید تھی کہ اپنے گروپ کے ساتھ رہیں۔ ہمارا یہ سفر تقریباً پندرہ گھنٹے میں ختم ہوا۔ مکہ ہوٹل میں پہنچتے ہی ہمارے معلم صاحب نے ہمیں تاکید کر دی کہ ہم جانتے ہیں کہ سب تھکے ہوئے ہیں مگر آپ سب تازہ دم ہو کر فوری طور پر تیار ہو جائیں مسجد حرام میں عمرہ کے لئے جانا ہے۔

جی ہاں ڈر اور خوف سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا اور درد سے دعائیں کر رہی تھی کہ یا اللہ یہ سب کیا ہے؟ کہاں میں اور میری اوقات؟ اور یہ اتنے بڑے فضل مجھ ناچیز پر۔

انہیں دعاؤں اور عاجزی کے ساتھ ہم مسجد حرام میں پہنچ گئے دو نفل ادا کئے اور خانہ کعبہ پر نظر پڑی مَیں ساکت ہو گئی، بہت دیر تک تو میری زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ مَیں کیا دیکھ رہی ہوں، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، سوکھی آنکھوں اور خشک زبان سے خانہ کعبہ کو تکتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آئی تو پھر آنکھوں نے، دل و دماغ نے اپنا کام شروع کیا، اللہ پاک کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی یہ دن دکھایا۔ خانہ کعبہ میں ہر رنگ و نسل کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ اللہ کے گھر میں کوئی بڑا اور چھوٹا نہیں تھا۔ تمام اللہ کے بندے اور محمد ﷺ کے پروانے اپنی اپنی دُھن میں مگن اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر تھے۔ بلا مبالغہ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر زبان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مشغول تھی۔

یہاں بشریٰ نے پھر ہم سب کو ہدایات دیں کہ ہجوم بہت ہے اس لئے تقسیم ہو جائیں۔ ایوب ندیم صاحب اپنی بیگم نرگس اور اُن کی بہن نصرت خان کے ساتھ ہو جائیں اور داؤد ندیم صاحب اپنی بیگم قمر صاحبہ کے ساتھ۔ عشرت صاحب اور بشریٰ نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا۔

عشرت صاحب اور بشریٰ کے علاوہ ہم سب پہلی بار گئے تھے اس لئے سب کو تھوڑی بہت گھبراہٹ تھی کہ کہیں گم نہ ہو جائیں۔اس قدر دنیا تھی کہ ملنا مشکل تھا۔ پہلے تو یہ ہی ڈر تھا کہ جانے طواف کیسے کریں گے بہت ہجوم ہے۔لیکن جب شروع کیا تو الحمدللہ کوئی دشواری نہیں ہوئی، دل بھر کے دعائیں کیں، رورو کر التجائیں کیں، طواف کرتے ہوئے چلتے جارہے تھے مگر سر سجدے میں تھے۔اپنی اپنی بساط کے مطابق ہر کوئی اپنے رب کے آگے جھکے بخشش کی بھیک مانگ رہا تھا۔

بیت الحرام کی تین منزلیں ہیں پہلی تو وہ جہاں خانہ کعبہ ہے وہاں تو چلنا بھی مشکل تھا اس لئے ہم نے دوسری منزل پر طواف کیا۔طواف کے دو یا تین چکر لگانے کے بعد تھوڑا ڈر کم ہو گیا اتنے ہجوم کے باوجود چلنے میں زیادہ دشواری نہیں تھی ،طواف کے بعد صفا مروہ میں سعی کرنے کی توفیق ملی۔وہاں بھی اللہ کے بندوں محمد ﷺ کے پروانوں کا جمِ غفیر تھا۔

6ذوالحج کو پھر سے احرام باندھے، دو نفل ادا کئے اور منیٰ کی طرف ہماری روانگی شروع ہو گئی۔ یہ پانچ دن بھی بہت بابرکت تھے۔جدھر نظر پڑتی تھی خیموں کی دنیا آباد تھی۔زمین پر قالین بچھے ہوئے تھے سونے کے لئے ہمارے پاس سلیپنگ بیگ موجود تھے۔سخت گرمی تھی ائیر کنڈیشن ہر وقت چلتا تھا۔شدید گرمی کے باوجود ہم کافی آرام سے تھے۔منیٰ کے دن بھی یادگار دن رہیں گے بہت دعاؤں کا موقع ملا زیادہ تر ہمارا وقت تلاوت اور درود شریف پڑھنے میں ہی گزرتا تھا۔سچ پوچھیں تو منیٰ میں وقت بہت اچھا گزرا۔ بہت سارے مختلف لوگوں سے تعارف بھی ہوا۔اب اگلا مقام عرفات کے لئے ہماری روانگی تھی۔کوچ میں بھی اور ویسے بھی ہر وقت تلبیہ پڑھا جاتا تھا۔ یہاں بھی چاروں طرف خیموں کا ایک شہر آباد تھا۔جدھر بھی نظر جاتی دُنیا ہی دُنیا تھی اور ہر آنکھ میں آنسو اور لبوں پر دعائیں تھیں۔ بلکہ یہ کہوں تو زیادہ سچ ہے

کہ آہوں اور سسکیوں سے رب کے حضور التجائیں تھیں۔ یہاں پر جو نمازیں ادا کی گئیں وہ بھی بہت رقت انگیز تھیں۔ یہاں بھی انسانوں کا ایک سمندر نظر آتا ہے۔ یہ سب اللہ کے بندے ہیں جن کو اللہ نے خود بلایا ہے، یہ سب اللہ کے مہمان ہیں۔جبل رحمت دیکھا، پاس تو نہیں جا سکے مگر دور سے ہی زیارت کی اور بہت رو رو کر دعائیں کیں، درود شریف اور کلمہ چہارم کا خوب خوب ورد کیا۔

اُسی دن شام کو مزدلفہ کو روانگی تھی۔ چونکہ ہمارے حصہ میں ایک ہی کوچ تھی جس نے باری باری سب کو لیکر جانا تھا اس لئے کافی انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ہماری باری جلدی آ گئی۔

مزدلفہ کی رات کیا بتاؤں..! یہ رات بھی عجیب رات تھی کھلے آسمان کے نیچے تین ملین لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر جمع ہو گئے۔ کہیں سے اَذان کی آواز آ رہی ہے تو کہیں باجماعت نماز ہو رہی ہے تو کہیں لوگ زمین سے کنکریاں ڈھونڈ رہے ہیں۔ پھر رات کا وقت بہت خوبصورت سماں تھا۔سفید احرام پہنے ہوئے کچھ لوگ پہاڑوں پر چڑھ کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔پھر جس کو جہاں جگہ ملتی ہے، وہیں سجدوں میں پڑے نظر آتے ہیں۔

یہاں میں خاص طور پر ایک ایسی لڑکی کا ذکر کروں گی جو چھوٹے سے ٹیلے کے اُوپر چاندی کی طرح سفید احرام پہنے ہوئے دعا مانگتی ہوئی ایسے لگ رہی تھی جیسے کوئی فرشتہ ہو۔نظر نہیں رُکتی تھی اُس کو دیکھنے سے۔ اُس رات کی خوبصورتی کو شاید میں اپنے الفاظ میں اچھی طرح بیان نہ کر سکوں لیکن محسوس کر سکتی ہوں۔

مزدلفہ سے فجر کی نماز سے پہلے ہی ہماری روانگی شروع ہو گئی کیونکہ لوگ بہت تھے اور کوچ صرف ایک تھی اس لئے ہر ایک کی خواہش تھی کہ ہمیں کوچ میں جگہ مل جائے۔ بہت سارے لوگ تو پیدل ہی چل پڑے۔منیٰ کی طرف جاتے ہوئے ہمارا ڈرائیور راستہ بھول گیا

جس سے ہم بیس منٹ کا سفر تقریباً تین یا چار گھنٹوں میں طے کر پائے۔ یہ دن ہمارا بڑے شیطان کو سات کنکریاں مارنے کا دن تھا اور آج کا دن شدید گرمی کا دن تھا۔ ہم حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی یاد تازہ کرتے ہوئے لوگوں کے ایک سمندر کی طرح بہتے ہوئے جمرہ عقبہ کی طرف کنکریاں مارنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ جدھر بھی نظر اُٹھی تیز قدموں سے چلتے ہوئے لوگ دعاؤں میں مگن اپنے اپنے گروپ کے ساتھ رہتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ سب کو اپنے گروپ سے بچھڑنے کا خوف بھی تھا۔ اتنے ہجوم میں اگر کوئی گم ہو جائے تو ملنا بہت مشکل تھا۔ باوجود اس کے کہ ہم سب ہاتھ میں ہاتھ لئے ایک دوسرے کا سہارا بنے رہے پھر بھی یہ کوشش تھی کہ ہم سب اپنے چھتری تانے معلم کے ساتھ ساتھ رہیں۔ الحمد للہ ہم خیریت سے واپس منیٰ پہنچ گئے۔

یہ دن قربانی کا بھی تھا۔ تقریباً تین یا چار بجے تک ہمیں یہ خوشخبری ملی کہ اُس قربانی کی یاد میں جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کے لئے دی تھی آج ہماری طرف سے وہ فریضہ بھی ادا ہو گیا۔ مردوں نے سر منڈوائے اور ہم عورتوں نے بھی ایک انگلی کے پور کے برابر بال کٹوائے۔

(فقہ احمدیہ۔ صفحہ 334)

12 ذوالحج کو منیٰ میں ہمارا آخری دن تھا۔ آج رات کو ہم نے واپس مکہ مکرمہ کی طرف جانا تھا۔ ابھی ہم نے تینوں شیطانوں کو دو دو مرتبہ کنکریاں مارنی تھیں۔ ہجوم سے بچنے کے لئے ہمارے معلم صاحبان نے ہمیں ہدایات دیں کہ رات کو دو بجے ہم منیٰ سے رخصت ہو جائیں گے، لہٰذا سب لوگ وقت پر تیار ہو جائیں۔ نیند بھلا کس کو آتی ہے ہم سب عین وقت پر باہر اپنے گروپ کے پاس آ گئے اور ایک مرتبہ پھر انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دُعاؤں میں مصروف توبہ استغفار کرتے ہوئے رَمی کے لئے بڑھا۔ رات کے دو بجے یہ انسانوں کا بہتا ہوا

سمندر ایک عجیب نظارہ پیش کر رہا تھا۔ اُس مقام پر پہنچے جہاں کنکریاں مارنی تھیں۔ کیونکہ ہم نے آج تینوں شیطانوں کو دو دفعہ کنکریاں مارنی تھیں اِس لئے پہلے تینوں شیطانوں کو ایک دفعہ مار کر دوسرے دن کا انتظار کرنا تھا۔ سو ہم نے وہاں چٹائیاں بچھائیں اور اذان کی انتظار کے لئے بیٹھ گئے اور اُس خوبصورتی کا نظارہ کرتے رہے کہ کس قدر دنیا ہے اور سب ایک مقصد کے لئے اکٹھے ہیں۔

بہت خوبصورت ٹھنڈی رات تھی کھلے آسمان کے نیچے یہ ہماری دوسری رات تھی (اس روحانی رات کو بھی میں شاید اپنے الفاظ میں بیان نہ کر سکوں)۔ اذان کے بعد نماز ہوئی اور باقی کے شیطانوں کو کنکریاں ماریں۔ اللہ کرے کہ ہم وہ تمام حج کرنے والے جو اِن بے جان شیطانوں کو کنکریاں مارتے ہیں اپنے دل کے شیطانوں کو بھی کنکریاں ماریں تاکہ خدا کی محبت دل میں پیدا ہو۔ آمین ثم آمین۔

اُس کے بعد ہمارے گروپ والے اپنے اپنے راستہ کو نکل گئے اور ہم آٹھوں احمدی چھوٹے سے گروپ کے ساتھ واپس مکہ کی طرف روانہ ہوئے، منٰی سے مکہ تک یہ سفر پیدل ہی تھا۔ چلتے چلتے تھکے ہارے ہم اپنے ہوٹل پہنچے۔ نہائے دھوئے آرام کیا اور یہ سوچ کر کہ آخری رکن زیارت کعبہ رات کو کریں گے، شاید رش کم ہو۔ ہم رات کے بارہ بجے ہوٹل سے نکلے۔ ہوٹل سے خانہ کعبہ تقریباً پندرہ یا بیس منٹ کے فاصلہ پر ہوگا مگر ہجوم کی وجہ سے ہماری ٹیکسی رات کے چار بجے خانہ کعبہ پہنچی۔ وہاں حاجیوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ہمیں پھر بھی کوئی دشواری نہیں ہوئی، بڑے سکون سے دعائیں اور التجائیں کرتے ہوئے، اللہ کے حضور جھکتے ہوئے گریہ وزاری کرتے ہوئے بیت اللہ کے دیدار سے اپنی آنکھوں کو اس نور سے منور کرتے ہوئے طواف مکمل کیا۔ اُس کے بعد صفا مروہ پر جا کر سعی کی حضرت ہاجرہؑ اور حضرت

اسماعیلؑ کی یاد تازہ کر کے دعائیں کرتے ہوئے اس رکن کو بھی ادا کر لیا۔

الحمدللہ ہمارا حج مکمل ہو گیا شکرانے کے نفل ادا کئے۔ اپنے حاجیوں کو مبارک باد پیش کی اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد ہمارے پاس ایک اور ہفتہ مکہ مکرمہ میں قیام کا تھا جو ہم نے اپنی مرضی سے گزارنا تھا۔ وہ بھی عمرہ کرتے ہوئے اور زیارتوں میں گزرا ۔ مَیں اب اُن باتوں کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جن کی وجہ سے ہمارا یہ روحانی سفر آسانی سے گزرا۔

ہمارے معلم صاحبان نے مدینہ میں ہمارے کھانے کا اور سہولت کا بہترین انتظام کیا ہوا تھا۔ ہمیں کبھی بھی کہیں بھی اپنا سامان نہیں اُٹھانا پڑا۔ مکہ میں ہمارے پیکیج میں کھانا شامل نہیں تھا، مگر وہاں بھی وہ ہمیں کھانا دیتے رہے۔ یہاں تک کہ واپسی میں ائیر پورٹ پر جہاں اور کوئی سہولت نہیں تھی وہاں بھی بہترین چکن پلاؤ اور سوفٹ ڈرنک سے ہماری مہمان داری کی گئی۔ چونکہ ہمارے علم میں یہی تھا کہ مکہ میں ہم نے اپنا کھانا وغیرہ خود سے بنانا ہے، ہم نے اپنا انتظام کیا ہوا تھا۔ ہوٹل میں ہمیں باورچی خانہ کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ نرگس، قمر اور بشریٰ نے بہت اچھی طرح سے باورچی خانہ کو سنبھالا اور عشرت صاحب، ایوب صاحب اور داؤد صاحب نے پوری طرح کچن میں بھی ساتھ دیا۔ میرے اور نصرت کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا اس لئے ہم دونوں کی کمپنی بہت اچھی رہی، حج کے بعد میں چیسٹ انفیکشن کی وجہ سے بیمار ہوئی تو میری دیکھ بھال بھی اُس نے بہت کی۔ فجزاھم اللہ۔

سچ پوچھیں حج کی تو ہر ہر بات ہی قابل توجہ اور قابل ذکر ہے مگر ایک واقعہ ایسا بھی ہے جو میرے ہی نہیں بلکہ ہمارے گروپ کے ہر شخص کے دل کے اندر گیا۔ یہ واقعہ ایک نوجوان بیٹے کا ہے جس کی والدہ 83 برس کے قریب تھیں اور وہ ویل چیئر پر تھیں ایک قدم بھی چل نہیں سکتی تھیں۔ مگر اُس ایرانی بیٹے نے اپنی والدہ کو اس قدر پیار سے سنبھالا ہوا تھا کہ ہر شخص

حیران تھا۔ پورا سفر اُنہوں نے ہمارے ساتھ کیا، کوچ سے اُترتے وقت اور بیٹھتے ہوئے ہمیشہ گود میں ہی اُٹھاتا۔ ایک مرتبہ چڑھتے ہوئے اُس کی ماں کا ہاتھ میں نے پکڑنے کی کوشش کی تو بڑے پیار سے کہا آپ کا بہت شکریہ.. مگر مجھے اچھا لگتا ہے کہ ہر کام میں اپنی ماں کا خود سے کروں۔ گود میں اُٹھا کر ٹائلٹ لیکر جانا پھر وہاں کسی نہ کسی عورت کی مدد لینی ہوتی تھی۔ اتنی دیر دروازے کے باہر انتظار کرنا۔ ایک بار ہم نے پندرہ گھنٹے کوچ کا سفر کیا اُس بیٹے نے کیسے اپنی ماں کو سنبھالا یہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، ہاں میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں اور مَیں نے اُس کو کہا بھی کہ تمہارا حج تمہیں دیکھ کر ہی لگتا ہے قبول ہو گیا ہے۔ اُس کا اپنی ماں کو پیار کرنا اور کھانا کھلانا پلانا غرض ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کا اُس نے خیال کیا۔

حج کے بعد اکثر لوگ وہاں بیمار ہو جاتے ہیں۔ حج کے بعد اس سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اُس کا اور اُسکی والدہ کا حال پوچھا۔ کہنے لگا میری طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا آپکی والدہ حج کر کے خوش ہیں۔ کہنے لگا جی بہت خوش ہیں۔ پھر بتانے لگا کہ حج اور زیارت ختم کر کے ماں کو پوچھا ماں حج کر کے خوش ہو تو کہنے لگی ہاں خوش تو بہت ہوں مگر تمہارے والد کی بہت خواہش تھی کہ وہ بھی حج کریں۔ مگر وہ تو نہیں کر سکے، اب تم اُن کے حصہ کے بھی سات چکر لگاؤ۔ لہٰذا میں اب دونوں کی طرف سے طواف کر کے آ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کا حج قبول فرمائے۔ آمین۔

آخر میں مَیں پھر اپنے تمام ساتھیوں اور حاجیوں کے لئے دعا کرتی ہوں کہ اللہ پاک سب کے حج قبول فرمائے۔ مَیں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ جیسی گنہگار کو نواز دیا۔ مجھے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا کہ کیا واقعی میں نے حج کیا ہے اللہ سے دعا کرتی ہوں اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے خاص فضلوں اور انعام اکرام سے نوازے۔ اپنی پوری

فرمانبرداری اور اطاعت کی توفیق بخشے۔ ہمارے اندر وہ تمام پسندیدہ صفات پیدا کرے جو ہماری سیرت کردار اور اخلاقی ترقیوں کی راہیں ہموار کرنے کا موجب ہوں۔ ہمارے نفس کا تزکیہ ہو، تقویٰ کی روح بیدار ہو، اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو اور اللہ کی محبت ہر خواہش پر غالب آجائے۔

مَیں اُس ذات پاک کا جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہے کہ اُس نے مجھے توفیق بخشی اور میں نے اتنا بڑا انعام پایا۔ اللہ میری تمام کمزوریوں کی پردہ پوشی فرمائے اور مجھے اپنی رضا کی راہوں پر چلنے کی توفیق بخشے اور میرے اندر حج کی روح ہمیشہ قائم رہے۔ آمین ثم آمین۔

(الفضل ربوہ 11 دسمبر 2008ء)

○○

اخبار احمدیہ

جس دن صبح کی ڈاک میں اخبار احمدیہ ہمارے گھر آتا ہے سب کام چھوڑ کر سب سے پہلے اسے ہی دیکھتی ہوں۔ جہاں تک ہو سکے تو اسی وقت پڑھ بھی لیتی ہوں۔ بہت خوبصورت ہے اور ماشاللہ بہت ترقی پذیر بھی۔ اخبار احمدیہ کے ساتھ میری بہت پرانی یادیں وابستہ ہیں۔ کم وبیش یہ شناسائی بیس پچیس سال سے چلی آرہی ہے۔

سب سے پہلے تو میرے والد مکرم محترم شیخ محمد حسن صاحب مرحوم مسجد جا کر اخبار احمدیہ کی پرنٹنگ میں طاہر سفیر صاحب کی مدد کرتے رہے۔ پھر مظفر کھوکھر صاحب کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ اُس وقت اخبار احمدیہ محمود ہال میں تیار ہوتا تھا۔ پہلے الگ الگ صفحات کو اکٹھا کر کے staple کیا جاتا۔ پھر ہر اخبار کو فولڈ کرتے اور کاغذ میں لپیٹ کر پوسٹ کر دیا جاتا تھا۔ پلاسٹک کے لفافوں کا استعمال اس وقت دور کی بات تھی، یہ سارا کام اُن دنوں محترم چودھری رشید صاحب کی نگرانی میں ہوا کرتا تھا۔ جماعت کے چھوٹے چھوٹے بچے اس کار خیر میں بہت مددگار ومعاون تھے جو آج اللہ کے فضل سے بڑی بڑی ذمہ واریوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں۔

پھر ایک ایسا وقت آیا کہ میرے بھائی محمد اسلم خالد کو اخبار احمدیہ کا مینیجر بنا دیا گیا۔جس پر یہ کام مسجد کی بجائے گھر سے ہونے لگا۔اس طرح گھر کے تمام افراد خانہ کو اس کام میں شامل ہونے کی سعادت ملنے لگی۔امی اور ابا جان اُن دنوں انیسویں منزل پر رہتے تھے۔اخبار کی تیاری میں پرنٹ ہونے پر اسے گھر لے کر آنا اور پھر تیار کر کے پوسٹ آفس تک پہنچانے کے تمام مراحل سے گزرنا شامل تھا۔کبھی لفٹ ٹھیک اور کبھی خراب لیکن کام ہر حالت میں جاری رہتا۔جن مشکل یا آسان مراحل سے یہ اخبار گزرتا رہا،ان یادوں کے ساتھ اپنے مرحوم ماں باپ کی یادیں وابستہ ہیں کہ کیسے کیسے حالات میں اپنے سب بچوں کو ساتھ لیکر چلتے رہے۔

وقت نے پھر ایک کروٹ لی جب میرے شوہر بشیر الدین سامی صاحب مرحوم کو اردو حصہ کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔الحمد للہ۔سامی صاحب کو اس کام کی سعادت چودہ سال تک ملتی رہی۔اس طرح ہم بفضلہ تعالیٰ ایک کے بعد ایک اخبار احمدیہ کا حصہ بنتے چلے گئے۔ماضی کے جھروکوں سے دیکھوں تو سامی صاحب اخبار کی تیاری میں مصروف کمپیوٹر پر بیٹھے ہیں۔کمپیوٹر میں سامی صاحب کی مددگار سارہ ہماری بیٹی تھی۔رات دیر تک کاغذات کی جانچ پڑتال جاری ہے۔پھر اخبار کی فائنل Approval کے لئے محترم امام صاحب یا محترم امیر صاحب مرحوم کے پاس لے جا رہے ہیں۔

ترسیل کا کام امی اور ابا جان کی ذمہ داری تھی اور مینیجر میرا بھائی خالد تھا۔اس طرح اخبار احمدیہ ترسیل تک ہمارے گھر میں ہی تیار ہوتا تھا۔اس لئے امی ابا جان سامی صاحب سے بار بار پوچھ رہے ہوتے کہ بتائیں اخبار کی کیا پوزیشن ہے کب تک چھپ کر آئے گا۔

پھر جب اخبار تیار ہو کر امی ابا جان کے گھر پہنچ جاتا تو سب بچے یعنی لبنیٰ،منیر،بلال، سارہ اور عکاشہ،پھر خالد کے چھوٹے چھوٹے بچے طاہرہ،صبا سب امی ابا جان کے ساتھ مل کر

پوسٹ کی تیاری میں لگ جاتے ۔ جہاں امی جان بچوں کو مزے مزے کے کھانے اور سویٹ سے خوش رکھتیں اور بور ہونے سے بچاتیں وہیں ابا جان اپنی زندگی کے خوشگوار قصے اور سبق آموز کہانیاں سنا کر مصروف رکھتے۔ سب بچے اُن گزرے دنوں کی بہت ہی پیاری یادوں کو اکثر دہراتے رہتے ہیں۔ اب جب بھی اخبار احمدیہ گھر آتا ہے تو اپنے پیاروں کی بہت یادیں ساتھ لاتا ہے۔

اب بھی ماشاءاللہ بہت اچھی ٹیم ہے۔ ہمارے اخبار احمدیہ نے بہت ترقی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کام کرنے والوں کو جزائے خیر دے اور جماعت احمدیہ کے ہر کام میں دن دگنی اور رات چوگنی ترقیاں ہوتی رہیں۔ آمین ثم آمین۔

(’میری پونجی‘۔ صفحہ 263 سے 264)

○○

بیت الاسلام-کینیڈا میں دس دن

جب حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ نے 17 اکتوبر 1992ء میں بیت الاسلام مسجد کا افتتاح فرمایا تو ہم سب ٹی وی کے سامنے ایسے جم کر بیٹھے جیسے کسی گاؤں میں پہلی بار ٹی وی آئے تو بیٹھ جاتے ہیں۔ہم وہ دیکھ رہے تھے جو ہمیں ٹی وی پر براہِ راست کیمرہ کی آنکھ دکھا رہی تھی۔ہم نے زندگی میں پہلے ایسے مناظر نہیں دیکھے تھے۔مثال کے طور پر واش روم میں پانی کے Sensor لگے Tap اور وضو کے لئے پاؤں دھونے کی الگ سے جگہ پھر نرسری روم جو بچوں کے لئے علیحدہ سے بنایا گیا تاکہ بچوں کی وجہ سے شور نہ ہو، دو رنگوں میں ڈالا ہوا کارپٹ بے حد خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔لگتا بھی کیوں نہ جب کہ واقعی یہ سب کچھ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، دکھانے والوں نے بھی کمال کر دیا کہ آہستہ آہستہ ہمیں سارے کینیڈا کی ہی سیر کروادی۔

ہم بہت خوش تھے کہ ہماری کینیڈا کی جماعت کے پاس اتنی خوبصورت، دودھوں نہائی سفید ماربل کی بنی سر بلند مینار اور چمکتے گنبدوں کے ساتھ دعوت دیتی ہوئی ایسی شاندار مسجد ہے جو شاید ہی کینیڈا میں کہیں اور ہو۔

کچھ عرصہ بعد میرے بیٹے کو اپنے کام کے سلسلہ میں امریکہ جانا پڑا اور اس نے امریکہ کی ریاست Connecticut میں رہائش اختیار کر لی۔ مَیں اور میری بیٹی سارہ پہلی بار 1993ء میں جب اُس کو ملنے گئے تو اُس نے مجھے کہا:

''امی کیا آپ نے کینیڈا کی مسجد دیکھنی ہے؟''

میں بہت خوش ہوئی اور کہا بچے نیکی کرو گے مَیں ضرور دیکھوں گی جس کو ہم نے صرف ٹی وی پر ہی دیکھا تھا۔ میرے ساتھ میرا بیٹا، بیٹی اور میری ایک ممانی جان (اہلیہ چودھری عبدالحمید صاحب امریکہ) ہم بذریعہ کار کینیڈا کے لئے چل پڑے۔ چلنے سے پہلے میں نے کینیڈا میں اپنے چچا جان (شیخ منظور الحسن صاحب) کو بھی اطلاع کر دی کہ ہم آپ کے گھر آ رہے ہیں۔ اُن کو بھی میں نے کافی مدت کے بعد ہی ملنا تھا اُن کو ملنے کی بھی دل میں خوشی تھی۔ راستے میں ہم نے نیاگرافال کی سیر کی اور بھی راستہ میں سیر کرتے ہوئے ہم آدھی رات کو اُن کے گھر پہنچے۔ اگلے دن آرام کرنے کے بعد میرے چچا زاد بھائی ہمیں سیر کے لئے باہر لے گئے، سی این ٹاور اور کینیڈا کی مزید مشہور جگہیں دیکھیں اور اب ہمارا رُخ اُس طرف تھا جس کے لئے ہم نے یہ مسافت طے کی تھی۔

دل خوشی سے بے چین و بے قرار تھا کہ واقعی میں اتنی خوش قسمت ہوں کہ جو ٹی وی پر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی تھی اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گی۔ گاڑی کا رُخ مسجد کی طرف تھا۔ مسجد کے چاروں طرف بالکل سنسان جنگل بیابان دیکھ کر میرے منہ سے ایکدم نکلا:

''ہائے یہ اتنی جگہ خالی پڑی ہے... یہاں تو پورا ربوہ سما سکتا ہے۔''

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے سب نے ایک بہت بڑا قہقہہ لگایا کہ اُمی کو اتنی سیر کروائی ہے تو کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اتنی کھلی جگہ دیکھ کر سارا ربوہ اُٹھا کر لے آئی ہیں۔ اُس وقت میں بھی

تھوڑی شرمندہ سی ہوگئی مگر میرے اللہ تعالیٰ نے ضرور مسکرا کر دیکھا ہوگا اور کہا ہوگا کہ تمہاری یہ بات ضرور ایک دن پوری ہوگی مگر اُس وقت میں نہیں جانتی تھی۔ ہم سب نے مسجد دیکھی واقعی بہت خوبصورت مسجد تھی ہم سب نے شکرانے کے نفل ادا کئے اور اگلے دن ہم واپس امریکہ آ گئے۔

قریباً تین سال امریکہ رہنے کے بعد میرا بیٹا واپس لندن آ گیا۔ یہاں چار پانچ سال رہا اور پھر مستقل کینیڈا میں ہی اپنا گھر بنا لیا اور جب حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ نے پہلی بار کینیڈا جلسہ سالانہ پر تشریف لے جانے کا پروگرام بنایا تو میرے بیٹے نے مجھے بھی بلا لیا کہ امی آپ بھی آئیں اور یہاں کی رونق دیکھیں اور میں چلی گئی۔ میں پیس ویلیج گئی۔ کیا بتاؤں کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عاشق حضرت مسیح موعودؑ پر کامل ایمان اور خلافت پر یقین رکھنے والی خلافت احمدیہ کی رہنمائی میں اُس جنگل میں جہاں میری بات پر اللہ تعالیٰ مسکرایا تھا اُس نے میری معصومیت میں کی ہوئی خواہش پوری کر دی تھی۔ الحمد للہ۔

ویسے میں نے تو کھلی زمین دیکھ کر چلتے چلتے بات کر دی تھی نہیں جانتی تھی کہ اللہ میاں اتنے قریب سے سُن رہا تھا۔ پیس ویلیج واقعی ربوہ سے زیادہ جگمگا رہا تھا ہر گھر روشن چمکتا ہوا اور اپنے پیارے امام کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ میں اب ہر سال کینیڈا جاتی ہوں۔ ابوڈ آف پیس احمدیہ بلڈنگ اور باقی بے شمار بلڈنگ اور پیس ویلیج ماشاء اللہ احمدیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ کینیڈا کی گورنمنٹ کو بھی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

اس سال میں نے اپنے بیٹے کو بتا دیا تھا کہ جلسہ پر نہیں آؤں گی بلکہ رمضان شریف اُس کے پاس گزاروں گی اور اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا کہ میں اعتکاف بھی بیت الاسلام مسجد میں ہی بیٹھوں گی۔ چونکہ میں متواتر بیت الفتوح میں تین سال سے اعتکاف بیٹھ رہی تھی۔ میں نہیں

چاہتی تھی کہ اس سال نہ بیٹھ سکوں۔ الحمدللہ کینیڈا کے امیر صاحب نے مجھے اجازت دی اور اللہ نے مجھے توفیق بخشی کہ میں اُس مسجد میں اعتکاف بیٹھ سکی جو مسجد اب ہم سب کے لئے ماڈل بن چکی ہے۔ کینیڈا کے بعد لنڈن کی بیت الفتوح بالکل اُسی طرح دودھوں نہائی سفید ماربل کی روشن گنبدوں کے ساتھ فخریہ سر بلند کئے دعوت دین دے رہی ہے اور اب یو کے کے باقی شہروں میں بھی (Mini) بیت الفتوح بن گئی ہیں، انشااللہ مزید اور بنتی رہیں گی۔

بیت الاسلام میں اعتکاف بیٹھنے کی اجازت تو مل گئی مگر تھوڑی گھبراہٹ ضرور تھی کہ میرا وہاں کوئی جاننے والا نہیں تھا میں اپنے گھر اور شہر سے بہت دور تھی لیکن دل میں خوش تھی کہ اب عبادت میں زیادہ مزا آئے گا کہ وہاں کوئی جاننے والا نہیں ہوگا۔ مگر بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے ہماری خدائی جماعت خدا کے فضل سے ایسی ہے کہ ایک سے بات کرو تو دس رشتے داریاں نکل آتی ہیں میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا آدھے سے زیادہ ربوہ سے جاننے والے کچھ لندن کے ملنے والے اور کچھ میرے اپنے رشتے دار تھے۔

میرے دس دن کیسے بیت گئے مجھے کچھ علم ہی نہیں ہوا۔ سب سے پہلے تو میں حافظ صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ اتنے دھیمے اور نرم لہجے میں تراویح پڑھائیں کہ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، مَیں نے اُن کو دیکھا تو نہیں اور نام بھی نہیں جانتی مگر آواز سے اندازہ لگا سکی ہوں کہ بہت کم عمر بچہ تھے جو اتنے مشکل کام کو بہت آسانی سے نبھا رہے تھے۔ بہت بہت مبارک ہو۔ پھر صبح کی نماز کے بعد امیر صاحب کا حدیث کا درس دینا...!

ایک دن موضوع 'صبر' تھا۔ میرے جیسے بے صبروں کے لئے جن کو صبر بہت مشکل سے آتا ہے بہت نصیحت آموز تھا۔ اُنہی دنوں میں مرزا احسن صاحب ابن مکرم میاں انور احمد صاحب جو کہ حضرت صاحبزادہ مرزا محمود احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے فرزند ارجمند ہیں،

اعتکاف میں حضرت المصلح موعودؓ کی متبرک جائے نماز لے آئے تھے، جس سے تمام معتکفین اور معتکفات نے استفادہ کیا۔ الحمدللہ تین مرتبہ مجھے اُس جائے نماز پر نفل ادا کرنے اور سب کے لئے دعا کرنے کا موقعہ بھی ملا۔

اُن دس دنوں میں ایک افسوسناک واقعہ بھی پیش آیا یعنی ایک بچے کی وفات۔ مگر وہ کوئی عام بچہ نہیں تھا وہ پورے پیس ویلیج والوں کا پرنس تھا جس کی وفات پر میں نے پورے پیس ویلیج والوں کو انتہائی غم میں ڈوبے ہوئے دیکھا۔ میں اُس کے والدین کو تو نہیں جانتی تھی مگر وہ ہر گھر کا بچہ تھا اُس کے جنازہ پر لوگ بہت سوگوار تھے۔ اُس بچے کا نام تھا آدم اور ہر بار آدم کا نام لیتے ہوئے امیر صاحب گلوگیر ہو جاتے تھے اور کہنے لگے وہ میرا ہی بیٹا تھا، یقیناً وہ سب کا لاڈلا تھا۔ اللہ تعالیٰ سے اُس کے والدین اور سب پیار کرنے والوں کے لئے دعا گو ہوں اللہ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور اُس کے والدین کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

یہاں میں سب لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ کچن والوں کا کھانا کھلانے والیوں کا جو سخت سردی میں صبح سویرے اُٹھ کر ہمارے لئے آتی تھیں۔ تمام انتظامیہ کا جو یہ سارے پروگرام بناتے ہیں اور اُن پر عمل کرواتے ہیں اور ایک شکریہ میں اُس اجنبی بہن کا بھی ادا کرنا چاہتی ہوں جس نے مجھے مہمان سمجھ کر پھولوں کا تحفہ دیا۔ شکریہ تو میں اُن تمام بہنوں کا بھی کرنا چاہتی ہوں جن کے ساتھ میں نے دس مبارک دن گزارے اور سب نے مجھے بہت پیار دیا خاص طور پر اپنی کزن امتہ الشکور چودھری صاحبہ، انیسہ دانیال صاحبہ اور عمرانہ ملک صاحبہ کا جنہوں نے محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں گھر سے دور ہوں۔

اور بہت بہت شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں مکرم و محترم امیر صاحب جماعت ہائے احمدیہ کینیڈا کا جنہوں نے مجھے اعتکاف اپنے مرکز میں بیٹھنے کی اجازت مرحمت فرمائی، دُعائیں

دیں اور ساتھ ہی دعاؤں کا خزانہ بھی دیا یعنی خزینۃ الدعا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت والی لمبی زندگی عطا فرمائے اور جس ہمت اور بہادری سے آپ جماعت کی خدمت کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اُنہیں مزید ترقیاں اور برکتیں عطا کرے۔ آمین۔

ویسے تو مسجد میں سارا دن ہی بہت رونق رہتی تھی مگر پانچوں نمازوں کے وقت لگتا نہیں تھا کہ میں پاکستان سے باہر کسی ملک میں ہوں کہ ہر نماز کے وقت عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہوتی اور ہر عورت مسجد میں پاؤں رکھتے ہی اتنی اُونچی آواز میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ کی صدا دیتیں کہ وعلیکم کی مہلت نہ ملتی کہ دوسرا اسلام پہنچ جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ سب بہنوں کو سلامتی عطا فرمائے جنہوں نے کینیڈا کی مسجد کو چوبیس گھنٹوں کے لئے آباد کیا ہوا ہے۔ الحمدللہ۔

امیر صاحب کی زبانی اُن کے بڑے بڑے منصوبوں کی بات بھی سُنی۔ اللہ پاک سے دعا کرتی ہوں کہ ہماری جماعت کے جہاں جہاں بھی دین کی ترقی کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں، اللہ پاک اُن تمام منصوبوں کو کامیاب و کامران کرے۔ آمین اور اللہ تعالیٰ خلافت کے جھنڈے تلے ہماری جماعت کو دن دُگنی رات چوگنی ترقیاں نصیب کرے۔ آمین ثم آمین۔

○○

پیار، محبت اور دلوں کی صفائی کا جہاد

ایک روز میرا نواسہ مجھے ملنے آیا۔ حال احوال کے بعد میں نے پوچھا کیا کر رہے ہو؟ تو کہنے لگا:

'' نانو کوئی خاص تو نہیں۔ کل حضور کے ساتھ وقفِ نو کی کلاس ہے اور موضوع ہے جہاد۔ آپ کچھ بتائیں؟''

میرا جواب تھا: '' آپ اپنے ماموں سے پوچھ لو۔''

لیکن یہ بات اُس کی میرے دل و دماغ پر چھائی رہی کہ جہاد کیا ہے؟ کیا واقعی جہاد گولہ بارود، تلوار اور بندوق سے ہی ہوسکتا ہے یا جیسا حضرت مسیح موعودؑ نے فرمایا ہے کہ جہاد دین کی خدمت کا نام ہے۔ دین کو پیار اور محبت کی ضرورت ہے، قلم کی ضرورت ہے۔ دین کے لئے کسی بھی بھاری اسلحہ کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں ہم عورتیں بھی جہاد کر سکتی ہیں اور گھر بیٹھ کر کر سکتی ہیں۔ کیوں نہ ہم تمام احمدی عورتیں اپنے گھر سے ہی جہاد شروع کر دیں۔

بعض گھروں میں یہ روز کی کہانی ہے، یعنی عورت ہی عورت کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ کہیں ساس بن کر اور کہیں بہو بن کے۔ بہن بھائی سے ناراض ہے اور نند بھاوج سے۔ بہت حد تک

ان معاملات میں مرد حضرات شامل نہیں ہوتے بلکہ اُن کو بے وجہ شامل کیا جاتا ہے اور لڑائی کو بڑھایا جاتا ہے۔ معمولی باتیں بڑے بڑے جھگڑوں کا باعث بن جاتی ہیں اور صرف عورتوں کی کھینچا تانی سے ہی انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔

چھوٹی چھوٹی باتیں انا کا مسئلہ بن جاتیں ہیں۔ باتوں کا بتنگڑ بنا کر لوگ معمولی باتوں سے ناراض ہو جاتے ہیں اور سالہا سال تک ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ کوئی چاہنے والا اس دنیا سے چلا جائے تو اُس کی تعریفوں اور رونے کا کام باقی رہ جاتا ہے جانے والا تو واپس نہیں آتا مگر خود ساری زندگی افسوس میں ہی گزرتی ہے۔ کیوں نہ ہم اُس وقت سے پہلے دل صاف کر کے مومن بن جائیں۔ شاید یہ ہم عورتوں کی کمزوری ہے کہ ہمیشہ ہماری یہ سوچ ہوتی ہے کہ جو بات ہم نے کی وہی سچ ہے باقی سب غلط ہیں اور یہاں سے ہی مشکلات شروع ہو جاتی ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی ہم جھکنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں اور خاندانوں میں نفرتیں بڑھا دیتی ہیں۔ مَیں سوچتی ہوں کیا ہمارے پاس اتنی ہمت ہے کہ ہم ان باتوں کے خلاف جہاد کر سکیں؟

کیا ہم سب احمدی بہنیں یہ جہاد نہیں کرسکتیں کہ آج کے بعد ہم کسی سے بے وجہ ناراض نہیں ہونگی اور جو ناراض ہیں ہمت کر کے اُن کو پہلے فون کر لیں گی اور معافی مانگ لیں گی یا معاف کر دیں گی؟ نیکی میں پہل کرنے والوں کو نہ کوئی کمتر سمجھتا ہے نہ ہی مطلبی بلکہ اُس کو اللہ تعالیٰ سے بہت اجر ملتا ہے۔ زندگی بہت تھوڑی ہے، محبتیں بانٹنے کے لئے وقت بھی کم ہے، نفرتوں اور دکھوں کی زندگی کیوں جئیں؟ کیوں نہ دلوں کے داغ دھبے دھولیں اور اپنے روٹھوں کو منالیں کہ یہی ہمارا جہاد ہوگا۔ ہم کیوں اُن باہر کے جہادوں کو سوچیں جو ہمارے لئے مشکل ہیں۔ یہ پیار کا جہاد مسکراہٹوں کا جہاد، صلح اور دلوں کی صفائی کا جہاد کیوں نہ کر لیں؟

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ اچھی بات کہنا اور معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے ایسے صدقہ سے کہ کوئی آزار اُس کے پیچھے آ رہا ہو اور اللہ بے نیاز ہے اور بردبار ہے۔

(سورۃ البقرہ۔آیت 264)

حدیثیں گواہ ہیں صلح میں پہل کرنے والوں کو اللہ پسند فرماتا ہے۔ ہمارے حضور خطبات میں ہمیں نصیحتیں کرتے رہتے ہیں۔ کیوں نہ ہم سچ کا جہاد کریں کہ رشتہ ناطہ کرتے وقت غلط بیانی نہیں کریں گے۔ ہر ماں اپنی بچی کی ایسی تربیت کرے کہ وہ ساس کو ماں کا درجہ دے کر اُس کی عزت اور وقار کا خیال رکھے۔ ساسیں بھی آنے والی بہو کو خوشی سے نئے گھر میں نئی زندگی گزارنے دیں اور اس مقصد کو دونوں ساس بہو جہاد کا درجہ دیں۔ نند بھاوج بھی جہاد کریں۔ اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی زندگی اجیرن نہ بنائیں کہ وہ ان رشتوں کے درمیان پس کر رہ جاتے ہیں، بیوی کا ساتھ دیں؟ ماں یا بہن کا؟ کیوں نہ ہم سب مل کر اپنے مردوں کو اس مشکل سے نکال کر وہ حقوق ادا کرنے دیں جو اُن کی ذمہ داری ہے۔ یہ بھی جہاد ہی ہوگا۔

جانتی ہوں یہ جو مَیں سب لکھ رہی ہوں کوئی آسان کام نہیں ہے مگر سب جانتے ہیں جہاد کیا ہے۔ جہاد جنگ یا دوسرے معنوں میں جدوجہد کو کہتے ہیں ہم نے جنگ کرنی ہے نفرت اور ضد کے خلاف (انشاءاللہ) جہاد آسان نہیں ہوتا اور پھر اپنے نفس کے خلاف جہاد تو سب سے مشکل ہے۔ یہاں تو جہاد ہم نے اپنے ساتھ ہی کرنا ہے، روٹھوں کو منانا ہے، بچھڑوں کو ملانا ہے، ملن کی تڑپ کو بڑھانا ہے، اپنے خدا اور رسول کی فرمابرداری کرنی ہے اور اپنے خلیفۂ وقت کو یہ تحفہ دینا ہے کہ ہم عورتوں نے جہاد کیا ہے۔ اگر ہماری پوری جماعت کی عورتیں اس جہاد میں شامل ہو جائیں تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ہم تمام دنیا کی عورتوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے والی ہوں گی۔

خدا کرے کہ کوئی بیوہ اور کوئی یتیم اور کوئی بے سہارا عورت ایسی نہ ہو جن کو ہم خوشی نہ دے سکیں۔ ہمارے اس جہاد سے ہماری پوری جماعت خوشیوں سے مالا مال ہو جائے گی۔ ویسے بھی ہماری جماعت کا تو قول ہے کہ:

''محبت سب کے لئے نفرت کسی سے نہیں۔''

تو کیوں نہ ہم سب مل کر دنیا میں مسکراہٹیں اور خوشیاں بانٹیں۔ آج ہی ہمت کریں اور روٹھوں کو منائیں، گھروں میں سکون اور خوشیوں کی بوچھاڑ کر دیں اور یہ سب کچھ جہاد سمجھ کر کریں۔ ہم احمدی عورتیں ہیں خدا کے فضل سے جب کچھ کرنے کا سوچ لیتی ہیں یا اپنے خدا اور خلیفہء وقت کو خوش کرنے کا بہانہ مل جائے تو کبھی کوئی بھی جہاد کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتیں اور آج سے ہم سب کو وعدہ اپنے آپ سے کرنا ہوگا کہ ہم یہ جہاد اپنے گھروں کی خوشیوں کے لئے کریں گی۔ اپنے مردوں کی لمبی عمروں کے لئے کریں گی اپنے خدا کو راضی کرنے کے لئے اور خلیفہ وقت کو خوشی اور سکون دینے کے لئے کریں گی۔

جب حضور ہم سے کسی چندے کی تحریک کرتے ہیں تو ہم خدا کے فضل سے اپنا پورا زیور اُتار کے دے دیتی ہیں، مگر اب تو یہ سب نہیں دینا صرف اُن کو گھروں کی خوشیوں کی خبریں ہی دینی ہیں۔ اللہ کرے کہ پیارے حضور کو کبھی کوئی ایسا خط نہ ملے جس میں عورت کے عورت پر ظلم کی داستان ہو۔ ہم نے یہ جہاد کرنا ہے کہ ہمارے پیارے حضور کو خوشیوں سے بھرپور خطوط ملیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

مَیں اپنی کمزوریوں کو بھی بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ مجھے بھی اس جہاد کی بہت ضرورت ہے خدا کرے کہ میں بھی اس جہاد میں کامیاب ہوسکوں مَیں نے دعا سے اس جہاد میں قدم رکھ دیا ہے۔ اللہ پاک ہم سب بہنوں کو توفیق دے کہ ہم سب جہاد کرسکیں۔ اپنی انا

اور خودی کے خلاف، خود ساختہ حدوں کو خود پار کر سکیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ وقت گزر جائے۔ خود میں ہمت پیدا کریں۔ اللہ کرے کہ ہم سب اللہ کی رضا کی راہوں پہ چلنے والیاں بنیں، دنیا جہان میں محبتیں، آسانیاں اور مسکراہٹیں بانٹنے کی اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا کرے۔ آمین۔

آئیں..! ہم سب مل کر نئے سال کو نئی سوچ اور نئی اُمنگ سے شروع کریں۔ نیا سال ہم سب کے لئے خوشیاں اور محبتیں لے کر آئے۔ آمین۔ خدا کرے کہ ہم جلد کسی دن حضور کا یہ خطبہ بھی سُنیں کہ ہماری جماعت میں خاندانی جھگڑے بہت کم ہو گئے ہیں اور یہ ہمارے جہاد کی وجہ سے ہو۔ اور ہمیں بھی اپنے پیارے حضور کی طرف سے یہ تحفہ ملے۔ آمین ۔

بڑا جہاد ہے گر نفس رام ہو جائے

(الفضل 17 فروری 2007ء)

○○

جلسہ سالانہ یو کے 2009ء
کے پہلے دن کا آنکھوں دیکھا حال

جیسے ہی جلسہ سالانہ گزرتا ہے اگلے جلسے کی تیاری اور انتظام شروع ہو جاتا ہے اور اگر جلسہ یو کے کا ہو تو اس کی بات ہی الگ ہے۔ مَیں یہ اس لئے بھی اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ لندن کے ان تمام جلسوں کے ساتھ میرے سب گھر والوں کی کسی نہ کسی طرح سے وابستگی رہی ہے۔

ہر جلسہ کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ ڈیوٹیاں، ذمہ داریاں اور یہ رونقیں جلسہ کے جذبہ کو بڑھاتی رہتی ہیں اور مَیں نے بدلتے زمانے کے ساتھ ہر سال ان جذبوں اور ذمہ داریوں کو بہتر سے بہتر ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ زمانہ بے شک بدل گیا ہے مگر جلسہ کی تیاریاں اور گرمجوشیاں کئی گنا بڑھ گئی ہیں۔

اب میں اپنے بچوں کو دیکھتی ہوں تو خوشی ہوتی ہے وہی جذبہ وہی شوق بلکہ یہ کہوں تو زیادہ اچھا ہے کہ پہلے سے بہتر اور ماڈرن طریق سے کام ہو رہے ہیں۔ اپنے بچوں کی مصروفیات کو دیکھ کر میں پریشان تھی کہ میں جلسہ پر کیسے جاؤں گی؟ میں نے سوچا اور عکاشہ

اپنے بیٹے کی تسلی کے لئے کہہ بھی دیا کہ آپ میری فکر نہ کریں۔آپ اپنی ڈیوٹی آرام سے دیں۔میں گھر بیٹھ کر آرام سے دیکھوں گی۔

مگر دل میں بے چینی تھی کہ میرے ملک میں ہی جلسہ ہے اور مَیں نہ جاؤں یہ کیسے ہوسکتا ہے جب کہ دنیا کے کناروں سے لوگ آچکے ہیں۔ان ہی سوچوں میں تھی کہ ایک دم خیال آیا کہ ہماری جماعت کی طرف سے ٹرینوں پر جانے کا انتظام بھی تو کیا گیا ہے، کیوں نہ میں ٹرین پر جانے کی کوشش کروں؟ صبح اُٹھ کر جب جانے کی تیاری شروع کی تو میری بہواور بیٹی نے کہا موسم خراب ہے بارش بھی بہت ہے نہ جائیں مگر اب چونکہ مَیں نے پروگرام بنالیا تھا اللہ کا نام لیااور گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔تسلی کے لئے موبائل فون بھی میرے پاس تھا۔

سربیٹن اسٹیشن میرے گھر سے قریب ترین ہے۔فری پاس بھی میرے پاس ہے تو پھر کیا مشکل۔چھتری ساتھ لے لی۔اسٹیشن پر مجھ سے بھی پہلے لوگ پہنچ چکے تھے بلکہ پورے اسٹیشن پر ہمارے ہی لوگ تھے۔ ہر ٹرین ہمارے ہی لوگوں سے بھر بھر کر جارہی تھی سب مجھے اپنے ہی بہن بھائی رشتہ دار لگ رہے تھے، مَیں بھی ایک ٹرین میں سوار ہوگئی۔کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر میں بیٹھ گئی۔ پوری ٹرین میں ہم ہی ہم تھے، جو چند انگریز تھے وہ حیران پریشان ہوکر دیکھ رہے تھے کہ یہ آج کیا ہوگیا ہے۔ جیسے ہی ٹرین چلی مَیں بھول گئی کہ مَیں لندن میں ہوں۔مَیں نے اپنی آنکھیں بند کیں تو مَیں بہت پرانی دنیا میں پہنچ گئی۔ایسے لگا کہ فیصل آباد(لائلپور) سے اپنی اُمی ایک بڑی بہن اور تین چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہوئی ہوں جہاں احمدیوں سے گاڑی کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔سیٹوں پر جگہ نہ ہونے کی وجہ سے مَیں اور میرے تینوں چھوٹے بہن بھائی رسیوں سے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھے ہیں۔گاڑی چلتے ہی نعرۂ تکبیر سے گونج اُٹھی سارے راستے ہی نعرے لگتے رہے مگر جیسے ہی

ربوہ کا اسٹیشن آیا تو ایک عجیب نظارہ تھا۔ اُس وقت ربوہ کا اسٹیشن تو تھا مگر پلیٹ فارم نہیں تھا گاڑی سے ایک دوسرے کا سہارا لیکر اُترنا ہوتا تھا۔ یہ ربوہ میں پہلا یا دوسرا جلسہ تھا اُس جلسہ کی یاد مجھے ہمیشہ آتی ہے۔ اُس کے بعد تو پھر ہم مستقل ربوہ میں ہی آباد ہو گئے اور یہ جلسے ہماری زندگی کا حصہ بن گئے۔ ربوہ میں ہمارا گھر دارالبرکات میں جامعہ احمدیہ کے سامنے تھا اُس وقت ربوہ ایک صحرا کی طرح تھا ہمارے گھر کے سامنے کوئی درخت یا آبادی نہیں تھی دور دور تک ہر چیز نظر آتی تھی یہاں تک کہ جب بس سے لوگ اُترتے تو ہمیں نظر آتے تھے۔ ٹرینیں گزرتیں تو چار پائی دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے ہم ضرور دیکھتے، جلسے کے دنوں میں خاص طور پر سپیشل ٹرینیں چلتیں اور نعرۂ تکبیر کی آوازوں سے فضا گونج اُٹھتی۔ کبھی کبھی تو ہم اسٹیشن تک یہ رونق دیکھنے جاتے۔ میرے جیسے جن لوگوں نے ربوہ کی یہ رونقیں دیکھی ہیں وہ اُن سہانی خوابوں سے نہیں نکل سکتے۔

ایک جھٹکے سے گاڑی رُکی۔ مَیں نے آنکھیں کھولیں تو میری منزل یعنی Alton اسٹیشن آچکا تھا۔ وہی ماحول تھا مَیں رسیوں میں باندھے بستر پر نہیں بلکہ بہت ہی آرام دہ سیٹ پر بیٹھی تھی، صرف اُن نعرہ ہائے تکبیر کی کمی تھی جو ربوہ اسٹیشن پر ہوا کرتے تھے۔

ٹرین سے اُتر کر بس میں سوار ہونے تک ہمارے خدام بہت خندہ پیشانی سے ہمیں بسوں میں سوار کروانے کی ڈیوٹی ادا کر رہے تھے۔ ہم سب بارش کے پانی سے شرابور ہو چکے تھے۔ چھتریوں نے بالکل ساتھ نہیں دیا۔ ہم کچھ لوگ بس کے اُوپر والے حصہ میں تھے وہ بھی ٹپک رہی تھی، جب ہم حدیقہ المہدی پہنچے تو بھی وہی تیز بارش، مرد لوگ سوٹ بوٹ میں بھیگے ہوئے ہم تمام عورتیں کوٹ اور برقعوں میں اور بچے بیچارے اپنے جلسے کے خوبصورت کپڑوں میں پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ دل میں ڈر تھا کہ اب فلو یا بیمار ہونا ہی ہونا ہے جیسے

ہی مارکی کے اندر جانے کے لئے پاؤں رکھا ہومیو پیتھک نے استقبال کیا، الحمد للہ کہ بیمار ہونے سے محفوظ رہے۔

بہت اچھا دن گزرا۔ مارکی میں جا کر دل خوش ہو گیا۔ بہت اچھا انتظام تھا۔ بڑی سکرین جس میں مقرر کا چہرہ اور جلسے کے مختلف دلآویز نظارے دیکھنے کا بہت اچھا انتظام تھا۔ اور سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ ساؤنڈ سسٹم اتنا زبردست تھا کہ جلسے کی کاروائی صاف سنائی دیتی تھی۔ سمعی بصری اور MTA والوں کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ ننھے منے بچوں کو مسکرا کر پانی پلاتے دیکھا۔

سب سے زیادہ مشکل ڈیوٹی ٹائلٹ کی ہوتی ہے جہاں ہمیشہ صفائی کی شکایت رہتی تھی۔ مگر اس مرتبہ لجنہ نے بہت محنت کی، صفائی کا بہت اعلیٰ نمونہ تھا۔ دونوں طرف کے سٹیج بہت خوبصورت سجائے گئے تھے، یہاں تک کہ مردانہ سٹیج کے سامنے جو بڑے بڑے بیریر لگے تھے وہ بھی ٹی وی پر بہت خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ تمام کی تمام مارکیز بہت خوبصورت ڈیزائن سے لگائی گئی تھیں۔ جو ٹریک بچھائے گئے اُن پر چلنے کی بے حد آسانی ہوئی۔ عورتوں کو اپنی اپنی پُش چیئر اور ڈس ایبل (Disable) چیئر کو آسانی سے چلاتے دیکھا۔

سوکھے گیلے دن گزار کر جلسے کے بعد بھی میں نے چونکہ ٹرین پر ہی آنا تھا اس لئے کارروائی ختم ہوتے ہی مَیں چل پڑی۔ جلسہ گاہ سے نکلتے بھی ہمارے چاک و چوبند خدام سے واسطہ پڑا جو ہر جگہ اپنی ڈیوٹی نبھا رہے تھے اور بہت گرما گرم پیک کیا ہوا قیمہ کا پلاؤ دے رہے تھے۔ جس کا جتنا جی چاہے لے سکتا تھا۔ سردی میں بسوں میں بیٹھے ہوئے گرما گرم پلاؤ کھاتے اور دعائیں دیتے بھی سنا۔ بسوں میں، ٹرین میں اسٹیشن پر ہر جگہ خدام کو دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا اور دل سے اُن سب کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں۔

پھر باقی دو دن الحمدللہ سواری کا انتظام ہو گیا۔ سچی بات یہ ہے کہ کس کس بات کی تعریف کروں یہ جو ہر سال زیرو سے شروع کر کے پورے حدیقۃ المہدی کو ایک پورے شہر کی طرح سجایا جاتا ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور حضرت مسیح موعودؑ کے جان نثاروں اور خلافت کے پرستاروں کی جماعت ہی کی دن رات کی محنت اور لگن سے یہ شہر بستا ہے اور کیا خوب بستا ہے۔ اتنی ہی محنت جلسہ کے بعد بھی کرنی ہوتی ہے۔ اللہ کرے کہ آئندہ اس سے بھی خوب سے خوب تر کرنے کی توفیق ملے۔

اللہ ہمارے تمام خدام، انصار، لجنہ اور اطفال کو جزائے خیر سے نوازے جو ہماری سہولتوں کے لئے اور آنے والے حضرت مسیح موعودؑ کے مہمانوں کے آرام کے لئے اپنا آرام قربان کر کے دن رات یہ انتظام کرتے ہیں۔

حضور انور کے ایمان افروز تمام خطبات اور ہمارے علماء دین کی تقاریر ہمارے ایمان کو جلا بخشتی ہیں۔ یہ جلسے جہاں ہمارے ایمان کو تازہ کرتے ہیں وہیں ہمیں اپنے دور و نزدیک کے رشتہ داروں دوست احباب سے ملاقات کا باعث بھی بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم ہمیشہ اُن تمام باتوں پر عمل کر سکیں جو جلسہ میں بیان کی جاتی ہیں۔ آمین۔

(الفضل 17/اپریل 2010ء)

○○

تاثیرِ دُعا

میرے بھائی محمد اسلم خالد نے یہ واقعہ یوں بیان فرمایا:

مکرم سردار مصباح الدین صاحب (سابق مشنری انگلینڈ) کا ہمارے گھر ربوہ میں بہت بے تکلفی سے آنا جانا تھا۔ باجی عزیز اور باجی بشریٰ سے چائے بنوا کر ضرور پیتے اور جلدی جلدی چسکیاں لے کر پیا کرتے۔ اُن کی عادت تھی کہ جمعہ کی نماز کے بعد بیماروں کی عیادت کرنا اور جہاں مبارک باد دینی ہوتی وہاں جانا۔ اِس کام کے لئے وہ میرے ساتھ سائیکل پر بیٹھ کر مختلف جگہوں پر جانے کا کہا کرتے۔ اکثر وہ سائیکل کے پیچھے بیٹھ جاتے، میرے لئے سائیکل کا توازن برقرار رکھنا اگرچہ مشکل ہوتا لیکن ہم منزل پر پہنچ جاتے۔

میری عمر اُس وقت تقریباً پندرہ یا سولہ سال کے قریب ہوگی۔ مجھے وہ بہت پیار بھی کرتے اور دعائیں بھی بہت دیتے۔ یہ کام مَیں اُن کے ساتھ شدید سردی میں بھی کرتا اور شدید گرمی میں بھی انجام دیتا تھا۔

ایک بار ایسے ہوا کہ میں بیمار ہوگیا اور مجھے بخار ہونے لگا اور یہ علالت طویل ہوگئی۔ آپ نے بھی میرے لئے بہت دعائیں کیں۔ ایک دن آئے تو کہا اب تم انشاء اللہ جلد ٹھیک

ہوجاؤ گے۔ ساتھ ہی بتانے لگے کہ مَیں نے حضرت خلیفۃ المسیح الاوّلؓ کو خواب میں دیکھا ہے کہ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ خالد نہیں آیا۔ کہتے ہیں حضور انورؓ چونکہ حکیم تھے اس لئے مجھے یقین ہے اب تم جلد ٹھیک ہوجاؤ گے۔ الحمدللہ، اُس کے بعد میری بیماری جاتی رہی۔

سردار صاحب نمازوں کا بہت اہتمام کرتے تھے اور دعاؤں پر بہت یقین تھا۔ اشراق کی نماز بھی ادا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے میرے بھانجے منیر شہزاد کی پیدائش کے وقت مَیں نے اُن کو گریہ وزاری کرتے ہوئے دیکھا۔ جب تک بچے کی پیدائش کی خبر نہیں ملی سر سجدہ سے نہیں اُٹھایا۔ دونوں میاں بیوی بہت متقی اور دعائیں کرنے والے تھے۔ ایک اور اُن کا ہی واقعہ ہے مَیں اُن کے گھر چنیوٹ گیا ہوا تھا واپسی پر دونوں میاں بیوی نے ریلوے اسٹیشن جانے کے لئے تانگہ کروایا، راستہ میں باتیں کررہے تھے کہ آج ہمارا مبلغ بیٹا[1] نسیم سیفی واپس آرہا ہے اُس کو اسٹیشن پر لینے جانا ہے، کہتے ہم نے اُس کو ضرور ملنے جانا ہے۔ اُس وقت تک مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ میرے خالہ زاد بھائی ہیں۔ یہ راز بعد میں کھلا۔

○○

[1] یہاں پر محترم سردار مصباح الدین صاحب، محترم نسیم سیفی صاحب مبلغ سلسلہ کو پیار سے اپنا بیٹا کہہ رہے ہیں۔

محترمہ صاحبزادی امۃ الباسط صاحبہ (بی بی باچھی)

میری عمر کے وہ لوگ جو دنیا داری کے دھندوں سے کسی حد تک فارغ ہو جاتے ہیں۔ دن تو اُن کا کسی نہ کسی طرح گزر جاتا ہے مگر رات ہوتے ہی جب سر تکیہ پہ رکھتے ہیں تو یادوں کے در کھل جاتے ہیں، پرانی یادوں اور جدائیوں کے غم سے رات بھیگ جاتی ہے، تو کبھی مسکراہٹیں ہونٹوں پر صبح تک جگائے رکھتی ہیں۔

آج جو مجھے بہت ہی پیارے تھے اُن اپنے محسنوں کی یاد جو مجھے بہت ہی عزیز ہے لکھنے لگی ہوں۔ پہلے کچھ پس منظر بیان کر دوں تا کہ خود کو سمجھانے میں آسانی ہو۔

میرا بڑا بیٹا اپنے کام کے سلسلہ میں امریکہ میں مقیم تھا۔ اس سے پہلے کبھی وہ گھر سے باہر اکیلا نہیں رہا تھا۔ ہر دو ماہ کے بعد مجھے فون آجاتا کہ اُمی آپ آجائیں اور مجھے جانا پڑتا، جب کہ گھر پر بھی میرے باقی بچوں کے ساتھ بہت ساری ذمہ داریاں تھیں۔ اس کا حل ہم دونوں میاں بیوی نے یہ نکالا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ ہم حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے پاس دعا کے لئے گئے اور اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ ہم اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور خواہش یہ بھی ہے کہ پاکستان سے بہو لائیں اور ساتھ حضورؒ کو یہ بھی بتایا کہ جس کمپنی میں میرا

بیٹا کام کرتا ہے وہ اُس کی بیوی کو اُسی وقت ویزا دے دیں گے جب اُس کی شادی ہو جائے گی یعنی بیوی کو لانے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئے گی۔ اور یہ سارے کام مجھے ایک ماہ میں ہی کرنے تھے اور جانا بھی مَیں نے اکیلے ہی تھا۔

میرے بیٹے کو شادی کے لئے صرف پندرہ دن کی چھٹی پہ آنا تھا۔

حضورؒ نے فرمایا:

''ہاں ہاں کیوں نہیں تم پاکستان جاؤ مَیں پاکستان منگلا صاحب کو فون کرواتا ہوں۔''

اُسی وقت پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کو بلوایا تاکید کی کہ منگلا صاحب کو فون کر دیں اور ساتھ ہی بی بی باچھی صاحبہ کو بھی اطلاع کر دیں کہ جہاں تک ہو سکے مدد فرمائیں۔ آپ نے ربوہ میں میری قیام گاہ کا فون نمبر بھی لے لیا۔

مَیں ابھی لندن میں ہی تھی کہ میرے جانے کی اطلاع پاکستان پہنچ چکی تھی۔ ہم نے جلدی جلدی سیٹ بک کروائی پھر بھی مجھے ایک ہفتہ جانے میں لگ گیا۔ لاہور بھی مجھے ایک دو دن لگ گئے تو ربوہ سے مجھے فون آیا کہ آپ کہاں ہیں؟ آپ کے لئے روزانہ فون آرہے ہیں، آپ نے کب ربوہ آنا ہے۔ مَیں فوراً ربوہ گئی۔ بی بی باچھی صاحبہ سے فون پر بات ہوئی اور اگلے دن میں اُن کے گھر گئی۔ بی بی باچھی صاحبہ سے اس سے قبل میری کوئی بہت زیادہ جان پہچان نہیں تھی۔ میری بیٹی لبنیٰ حضورؒ کے گھر ڈیوٹی دینے جاتی تھی تو مجھے بھی کبھی اُس کے ساتھ جانے کا موقع مل جاتا، اس طرح وہاں بی بی کے ساتھ ایک دو بار مختصر سلام دعا ہوئی۔ احترام کی وجہ سے میں بہت کھل کر نہیں مل سکی تھی۔

میری زندگی کا زیادہ حصہ پاکستان سے باہر گزرا ہے اسی وجہ سے اِن سب کے ساتھ رابطہ کرنے میں بہت مشکل محسوس ہو رہی تھی۔ مَیں بے تکلفی سے بات نہیں کر پا رہی تھی، مگر

بی بی باچھی صاحبہ کی شفقت نے مجھے حوصلہ دیا، مجھے بہت اچھی طرح سنبھال لیا۔ میں تو وہاں کسی کو بھی نہیں جانتی تھی لیکن بی بی باچھی صاحبہ نے میری رہنمائی فرمائی۔ سب جگہ میرے ساتھ گئیں۔ الحمدللہ ایک ماہ کے اندر جس مقصد کو میں لندن سے پاکستان لے کر گئی تھی کامیاب ہو گئی اور میرے بیٹے کی شادی ان سب معزز اور قابل احترام محسنوں کی شرکت سے انجام پائی۔

یہ سب میری وجہ سے نہیں ہوا۔ یہاں پر ہم حضرت خلیفۃ المسیح الرابع ؒ کی محبتوں اور شفقتوں سے تو مالا مال تھے ہی، مگر پیارے حضورؒ نے میرے لئے پاکستان میں بھی محبتوں کی بوچھاڑ کروادی۔ جن کو بھی یہ علم ہوتا کہ مجھے حضورؒ نے اس شادی کے لئے بھجوایا ہے میرا کام ہاتھوں ہاتھ کرتا۔ سب لوگوں نے اتنی محبت دی کہ مجھے محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں نے یہ شادی اپنی فیملی کے بغیر اکیلے میں کی ہے۔

بی بی باچھی صاحبہ کے ساتھ محبت اور شفقت کا ایسا تعلق بنا کہ اُس کے بعد مَیں جب بھی پاکستان جاتی اُن کو ملنے جاتی تو میرے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ تیار ہوتا اور اُن کا جب بھی لندن آنا ہوتا اور اگر مجھے ملنے میں دیر ہو جاتی تو پیغام آتا کہ تم ملنے کیوں نہیں آئی ہو۔

پھر ان محبت کے رشتوں کو مزید تقویت سعدیہ خان (صاحبزادی بی بی امتہ الجمیل صاحبہ کی بیٹی) کی وجہ سے ملی۔ سعدیہ بی بی میرے گھر کے قریب رہتی ہیں اور اُن کے بچے اُس وقت جس سکول میں جاتے تھے وہ سکول بھی میرے گھر کے سامنے ہی تھا۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کی ضرورت بھی بن گئے تھے، سامی صاحب (مرحوم) سعدیہ کو اپنی بیٹیوں ہی کی طرح پیار کرتے تھے۔ سعدیہ کے لئے ہمارا گھر کوئی غیر نہیں ہے۔

اُن دنوں جب بی بی باچھی صاحبہ پاکستان سے تشریف لائیں تو سعدیہ کے گھر قیام

کیا۔ بی بی جمیل صاحبہ اور اُن کی بیٹی (بی بی صوفیہ) کا قیام بھی سعدیہ کے گھر ہی تھا۔ ظاہر ہے میری تو یہ خوش نصیبی تھی کہ اکثر ملنا رہتا۔

سامی صاحب کا جماعتی کاموں کی وجہ سے ہر روز ہی مسجد جانا ہوتا تھا، اس طرح کبھی کبھار ان معزز مہمانوں کو لفٹ دینے کا اعزاز بھی مل جاتا۔ ایک دن سعدیہ کا فون آیا کہ کیا آپ نے جمعہ پر جانا ہے؟ اگر جانا ہے تو اُمی کو بھی ساتھ لے لیں مَیں نے کہا کیوں نہیں، ہمارے ساتھ بی بی باچھی صاحبہ، بی بی جمیل صاحبہ اور اُن کی بیٹی صوفیہ صاحبہ جمعہ کے لئے گئے اور واپسی بھی ہمارے ساتھ ہی ہوئی، واپسی پر مَیں نے دعوت دی کہ آج تو آپ سب میرے ساتھ ہی ہیں، ہمارے گھر چلیں۔ کہنے لگیں آج نہیں پھر کبھی آئیں گے۔ مَیں نے کہا یہ تو آپ ہمیشہ کہتی ہیں، آج مَیں نے کوئی خاص نہیں گوبھی گوشت بنایا ہے کھانا کھالیں۔ ہم نے بھی ابھی نہیں کھایا، اُنہوں نے پھر کبھی آنے کا کہہ کر چُپ کروادیا۔ مَیں احترام کی وجہ سے زیادہ اصرار نہ کرسکی، سامی صاحب مجھے گھر اُتار کے اُن کو چھوڑنے چلے گئے۔ مَیں ابھی کوٹ وغیرہ اُتار کر کچن میں آئی ہی تھی کہ دروازہ کھٹکا کھولا تو سب بیگمات مسکراتے ہوئے سامنے کھڑی تھیں۔ بی بی باچھی صاحبہ اور بی بی جمیل صاحبہ کہنے لگیں لو اللہ میاں نے تمہاری بات سن لی ہے، سعدیہ تو گھر پر نہیں تھی، تمہاری بھی خواہش پوری ہوگئی۔

میری تو خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی، مگر گھبراہٹ بھی ہوئی کہ معزز مہمانوں کی خاطر خواہ مہمان داری کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ پہلے سے ہی تیار شامی کباب، چٹنی، گوبھی گوشت اور گرم گرم پُھلکے مکھن لگا کر پیش کئے، مَیں تو دل میں شرمندہ سی تھی مگر معزز مہمانوں نے میری اتنی دلجوئی کی کہ مَیں کبھی بھول نہ پاؤں گی، اُس کے بعد جب بھی ملاقات ہوتی اُس سادہ سے کھانے کی تعریف ضرور ہوتی۔

اُس کے بعد تو جب بھی بی بی باچھی صاحبہ کا آنا ہوا۔ مسجد کے قریب ہی رہائش پذیر ہوئیں۔ وہیں پر سب کی ملاقاتیں ہوتیں۔ پوری جماعت کے ساتھ ہی وہ بہت پیار کرتی تھیں، جس سے بھی بات کریں وہ بی بی باچھی کے بارہ میں یہی کہے گا کہ وہ سب سے زیادہ مجھے ہی پیار کرتی تھیں اور یہ سچ بھی ہے اُن کی شخصیت اتنی دلربا اور پُرکشش تھی کہ دل یہی سمجھتا ہے کہ کہا جائے کہ وہ صرف میرے ساتھ ہی پیار کرتی تھیں۔

میری اُن سے آخری ملاقات جلسہ سالانہ کے موقع پر ہوئی۔ مَیں سٹیج کی طرف گئی وہاں بی بی جمیل صاحبہ اور بی بی باچھی صاحبہ دونوں بہنیں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ دونوں کو سلام کیا ہاتھ ملایا۔ آج بھی آنکھیں بند کرتی ہوں تو بی بی باچھی صاحبہ کے ہاتھ کا لمس مَیں محسوس کر سکتی ہوں۔

یہ واجب الاحترام مقدس بزرگ ہستی جنہوں نے ہمیں نیکی کے راستے دکھائے اور پل پل محبتوں کے درس دیئے، ہماری خوشیوں اور دکھوں میں شریک ہوئیں، وہ آج ہم میں نہیں مگر اُن کی یادیں بہت ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا کرے اور ہمیں بھی نیکیاں کرنے کی توفیق ملے تا کہ وہاں ہم بھی سب اُن جنتوں کے وارث بن سکیں۔ آمین ثم آمین۔

(الفضل ربوہ 22 اکتوبر 2007ء)

○○

میری اُمی جان کی یاد کا ایک اور ورق

یہ واقعہ جب ہوا تو مَیں اپنی اُمی جان کے ساتھ ہی تھی، مگر مجھے یاد نہیں تھا، میرے بھائی محمد اسلم خالد نے یاد دلایا تو مجھے بھی یاد آیا۔

میرے ابا جان اکتوبر 1950ء میں فیصل آباد سے نیروبی (افریقہ) جا چکے تھے۔ مالی لحاظ سے ہم بہت مشکلات سے گزر رہے تھے کہ ابھی ہمیں ابا جان کی طرف سے کوئی منی آڈر نہیں آیا تھا اور نہ ہی ابھی کوئی اُمید تھی۔ ہمارے تایا جی جو ہماری کفالت کر رہے تھے وہ بھی کوئی امیر آدمی نہیں تھے اُن کی اپنی بھی فیملی تھی لیکن پھر بھی اُنہوں نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ اللہ اُن کو جزائے خیر دے اور اُن کے درجات بلند فرمائے۔ جلسہ قریب آ رہا تھا۔ لوگ تیاریاں کر رہے تھے جب کہ ہم صرف سوچ ہی سکتے تھے۔ اُن دنوں میری اُمی جان لجنہ اماء اللہ کا چندہ وصول کرنے کی خدمت پر مامور تھیں۔ جلسہ سے کچھ عرصہ پہلے میری اُمی جان شیخ محسن صاحب کے گھر چندہ لینے گئیں۔ شیخ محسن صاحب اُس وقت کے لحاظ سے بہت امیر آدمی تھے اور اُن کی ملیں تھی۔ اُن کی بیگم نے اُمی جان کو پوچھ لیا کیا آپ جلسہ پر جا رہی ہو۔ اُمی کا جواب تھا نہیں ہم نہیں جا رہے۔ وہ جہاں دیدہ خاتون تھیں سمجھ گئیں کہ کیوں نہیں

جارہیں۔ کہنے لگیں نہیں آپ ضرور جائیں، آپ کے ٹکٹ کے پیسے مَیں دیتی ہوں، آپ تیاری کریں۔ اُمی نے بہت انکار کیا مگر اُس رحم دل عورت نے زبردستی اُمی جان کے ہاتھ پر دس روپے رکھ دئے۔ اُس زمانہ میں ہوسکتا ہے دس روپے کی بہت زیادہ قیمت ہو اور سفر کے لئے ایک روپے کا ٹکٹ ہوگا باقی رقم اخراجات کے لئے کافی ہوگی۔ ہوسکتا ہے میری اُمی جان کا حلیہ بھی قابل رحم ہو۔ اللہ جانے کیسے میری اُمی نے اپنے بچوں کی تیاری کی ہوگی۔ کچھ تھوڑا مجھے یاد آتا ہے چاچا جی فضل کریم صاحب جن کی مسجد کے ساتھ درزی کی دوکان تھی رات کو ہمیں سلائی مشین دے دیتے اور صبح کو لے لیتے۔ رات بھر اُمی جان کچھ اپنے کپڑے کاٹ کر چھوٹے کرتیں اور کچھ نہ جانے کیسے ادھر سے اُدھر کرتیں رہیں اور جلسہ کی تیاری ہوگئی۔

ہمارے تایا جی اسٹیشن پر چڑھانے آئے۔ اُنہوں نے ہی ٹکٹ خریدے۔ جلسہ کے لئے ٹرین کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ہمارے تایا جی نے ہمیں بھی اُس بھری ہوئی ٹرین میں اندر کردیا۔

ہمیں وہ ٹرین میں سوار کروا کر چلے گئے جب ٹرین چل پڑی اور اُس ٹرین نے لائل پور (فیصل آباد) کا اسٹیشن چھوڑ دیا ہم چار بہنوں اور ایک دس ماہ کے بھائی کو اُمی جان نے جب بٹھا دیا تو ایک دم یاد آیا ٹکٹ اور بقایا رقم تو بھائی جی نے دیئے ہی نہیں وہ تو اپنی جیب میں ہی لے گئے۔ پھر کیا تھا نہیں جانتی میری ماں کا وہ سفر کیسے کٹا ہوگا۔ لیکن اب کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ سارے راستے اُمی جان دعائیں ہی کرتی آئی ہوں گی۔ ربوہ اسٹیشن آگیا نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ مجھے نہیں یاد کہ اُس وقت میری اُمی پریشان ہوکر کیا سوچ رہی ہوں گی۔ اب جیب میں نہ ٹکٹ تھا اور نا ہی کوئی پیسہ۔ گاڑی اسٹیشن پر رُک گئی بھری ہوئی ٹرین خالی ہونی شروع ہوگئی۔ اُمی جان نے بھی اپنا سامان اور بچوں کو سمیٹنا شروع کیا رش اتنا تھا کہ میری اُمی

جان کی باری اُترنے میں آخر میں آئی۔ جیسے ہی سامان نیچے پھینکا ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا۔اُمی جان بچوں کے ساتھ ٹرین سے اُتر نہ سکیں،گھبرا گئیں اورتو کچھ سمجھ میں نہ آیا ٹرین کے اندر لگی زنجیر کھینچ دی کچھ دور جا کرٹرین رُک گئی۔اُمی جان اپنے بچوں کے ساتھ اُتر آئیں اور وہاں سے پیدل چل کر اسٹیشن تک جب پہنچیں تو تمام مسافر جا چکے تھے اور اسٹیشن بھی خالی ہو چکا تھا۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے میری اُمی جان کی عزت کی لاج رکھ لی۔

ہمیں اپنی پیاری اُمی جان پر بہت رشک آتا ہے کہ انہوں نے کتنی مشکلات کی زندگی نہایت صبر اور ہمت کے ساتھ گزاری۔ بہت سخت دور دیکھا لیکن الحمدللہ پھر زندگی کی خوشگوار گھڑیاں بھی آئیں لیکن وہ گھڑیاں بھی خدا تعالیٰ کا شکرادا کرتے ہوئے گزاریں۔الحمدللہ۔

آج کے دور کو سوچتی ہوں تو دُنیا کو بالکل بدلا ہوا پاتی ہوں۔اللہ تعالیٰ کے احسان ہیں اللہ نے ہر نعمت سے نوزا ہے مگر پھر بھی سب کم لگتا ہے۔میں اپنی ماں کی عظمت،کو اُن کے صبر اور ہمت کو ہمیشہ سلام پیش کرتی ہوں۔ دعا کرتی ہوں اللہ تعالیٰ میرے والدین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے مجھے جنت میں اپنے والدین سے ملائے۔اللہ تعالیٰ اُن کی دعائیں اور ہماری دعائیں قبول فرمائے۔آمین ثم آمین۔

○○

خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دو خادمات

محترمہ برکت بی بی صاحبہ اور محترمہ صوباں بی بی صاحبہ

میرے نانا جان حضرت میاں فضل محمد صاحبؓ ہرسیاں سے قادیان ہجرت کرنے سے پہلے اکثر قادیان آتے رہتے تھے۔ان کی پہلی بیوی حضرت برکت بی بی صاحبہ قادیان آتیں تو حضرت اماں جانؓ کے پاس ہی قیام ہوتا آپ آتے ہی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگتیں۔کھانے پکانے میں کافی مہارت تھی آپ نے کھانا پکایا تو حضرت مسیح موعودؑ نے پسند فرمایا اور پوچھا:

''آج کھانا کس نے پکایا ہے؟''

آپؓ نے بتایا کہ آپ کی ''نئی مریدنی نے''

حضرت اقدسؑ نے از راہ شفقت ارشاد فرمایا کہ اب یہ جب بھی آئیں کھانا یہی پکایا کریں۔

حضرت اماں جانؓ نے بھی خوب اطاعت کی۔جب بھی قادیان آتیں آپؓ فرماتیں برکت بی بی اب باورچی خانہ سنبھالو۔اس طرح حضرت نانی جان کو اس بابرکت خدمت کی

توفیق ملی۔

آپ قادیان آتیں تو کئی کئی دن ٹھہر جاتیں۔ یہ گھر ہی ایسا بابرکت تھا واپس جانے کو دل ہی نہ مانتا۔ اُدھر حضرت اماں جانؓ اس قدر محبت کرنے والی شفیق خاتون تھیں کہ آپ کا دل بھی نہ چاہتا کہ وہ واپس چلی جائیں کئی بار تو ایسا بھی ہوتا کہ جب میاں صاحب آپ کو لینے کے لئے آتے تو حضرت اماں جانؓ فرماتیں:

''فضل محمد برکت بی بی کو چند دن اور رہنے دو پھر آ کر لے جانا۔''

اور وہ ان دونوں کا پیار دیکھ کر تنہا واپس لوٹ جاتے

(زندہ درخت صفحہ 64)

حضرت برکت بی بی صاحبہ نے خواب میں دیکھا کہ:

''میں قادیان گئی ہوں۔ چھوٹا سا بچہ میری گود میں ہے۔ لنگر خانہ گئی ہوں اور لنگر خانے والوں سے کہا ہے کہ مجھے کھانا دیں۔ اُنہوں نے پوچھا آپ کہاں سے آئی ہیں؟ مَیں نے کہا دیال گڑھ سے۔ اُنہوں نے کہا دیال گڑھ والوں کے لئے یہاں کھانا نہیں ہے۔ مَیں نے کہا کھانا دیں یا نہ دیں میں تو یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ مَیں نے لنگر خانے میں ایک طرف چارپائی بچھائی اور بچے کو ساتھ لیکر لیٹ گئی۔''

عجب رنگ میں یہ خواب پورا ہوا۔ جب ہرسیاں کو چھوڑ کر یہ خاندان قادیان کی مقدس بستی میں منتقل ہو گیا تو آپ 1917ء میں ایک بچے کی پیدائش کے بعد بیمار ہو گئیں۔ اسی بیماری میں آپ کا وصال ہوا بچہ پہلے ہی فوت ہو گیا تھا۔ کھانے سے مراد زندگی ہوتی ہے۔ قادیان رہائش کے ساتھ دنیا سے دانہ پانی اُٹھ گیا تھا مگر دائمی لنگر خانے میں دوسری زندگی کا آغاز ہوا

ماں اور بچہ دونوں ہی قبر میں لیٹ گئے۔

(زندہ درخت صفحہ 66)

جب ہماری نانی جان برکت بی بی صاحبہ، جن کے ساتھ حضرت اماں جانؓ دل و جان سے پیار کرتی تھیں، کی وفات ہوئی تو ان کی بڑی بیٹی خالہ جی صالحہ صرف سات سال کی تھیں۔ ان سے چھوٹی میری اُمی جان حلیمہ بیگم کی عمر چار سال تھی۔ چھوٹی بچی بھی خالہ جی صالحہ کی گود میں آ گئی۔ بچوں کی دیکھ بھال کرنا سات سالہ بچی کے لیے بہت مشکل تھا۔ ہمارے نانا جی فضل محمد صاحب بھی جیسے تیسے اپنے بچوں کی معاونت کر رہے تھے۔

حضرت اماں جانؓ جو میری نانی برکت بی بی صاحبہ سے بہت محبت کرتی تھیں اُن کے بچوں کو اس حالت میں دیکھ کر بہت افسردہ ہوتی تھیں اور اکثر اُن کی دیکھ بھال کے لئے بھی اُن کے پاس چلی آتیں تھیں۔ میری اُمی جان حلیمہ اور خالہ جی صالحہ بہت چھوٹی تھیں اور گھر میں کوئی بڑا دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا تو اکثر حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نانا جی کو دوسری شادی کا مشورہ دیتے جس پر میرے نانا جی ہمیشہ معذرت کر دیتے۔

اللہ تعالیٰ کے کام بھی نرالے ہوتے ہیں، جہاں یہ فیملی قادیان میں مشکلات سے دو چار تھی تو دوسری طرف ایک اور تاجر فیملی کی بہو پاکپتن میں اسی طرح کی مشکلات سے نبرد آزما تھی۔ صوباں بی بی صاحبہ اپنے تین بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی کہ اچانک اُن کے شوہر کی وفات ہوگئی اور بیوہ کو احمدی ہونے کی سزا یہ ملی کہ باقی فیملی نے بے سروسامانی کی حالت میں گھر سے نکال دیا۔ دو بچوں کو تو اُن کی فیملی والوں نے ہی رکھ لیا مگر ایک بچی جو دو یا تین سال کی تھیں سردار بیگم اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ ہی آ ئیں۔ محترمہ صوباں بی بی صاحبہ نے اپنے مرکز قادیان میں پناہ لی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کا کفیل بھی کوئی اور نہیں حضرت اُم ناصر

صاحبہ کو بنا دیا۔ اس طرح یہ خوش نصیب ماں بیٹی حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے گھر حضرت امی جان کے زیر سایہ رہنے لگ گئیں۔ صوباں بی بی نے بھی جی بھر کے خدمت کی حضور انور، حضرت ام ناصرؓ اور حضرت اماں جانؓ آپ کے کھانوں کو بے حد پسند فرمانے لگے۔ حضرت صاحبؓ اکثر نانی جی صوباں کو ہماری گورنر کہہ کر بلاتے اور یہ بھی خوش نصیبی تھی کہ آپ محترمہ صوباں بی بی (ہماری چھوٹی نانی جان) کے مستقبل کے لئے پریشان بھی رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کا دوبارہ گھر بس جائے اور اس بات کے لئے حضرت ام ناصر اور حضور انور کو میرے نانا جی حضرت فضل محمد صاحب سے زیادہ مستحق اور کوئی نہیں نظر آیا۔

اُمی کہتی ہیں کہ میرے ابا جی فضل محمد صاحب اور بھائی عبدالرحیم صاحب مغرب کی نماز کے لئے بیت الذکر میں گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نماز کے لئے تشریف لائے تو بھائی عبدالرحیم کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ آج میں ایک نکاح کا اعلان کرنے والا ہوں۔ ابا جی سمجھ گئے کہ یہ جو عبدالرحیم کی طرف دیکھ کر ارشاد ہوا ہے، حضورؓ میرا نکاح پڑھائیں گے۔ ابا جی نے بھائی عبدالرحیم سے کہا کہ جاؤ چھوہارے لے آؤ۔ ان کا اندازہ ٹھیک تھا۔ حضورؓ نے نماز کے بعد میرے ابا جی کا نکاح مکرمہ صوباں بی بی سے پڑھا دیا۔

نکاح کے ایک دو روز کے بعد میرے بھائی اور بھابھی ہماری نئی اماں کو اور اُن کے ساتھ ایک ننھی پری سردار کو بھی ساتھی لے آئے اور اس طرح حضرت صوباں بی بی صاحبہ ہماری ماں بن کر ہمارے گھر آ گئیں۔ مجھے سوتیلی اور سگی کا تو علم نہیں تھا اور شاید ماں کی بھی مجھے خوشی ہوئی یا نہیں میں نہیں جانتی ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ اپنے سے دو یا تین سال چھوٹی سردار کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ میری بہن بھی تھی اور سہیلی بھی۔ وہ بھی میرے ساتھ بہت خوش تھی۔ ہم دونوں ہر وقت ساتھ ساتھ ہی رہتے۔ ہاں مجھے یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ ہماری اماں سردار سے

زیادہ مجھے پیار کرتی ہیں اور ہر چیز پہلے مجھے اور بعد میں سردار کو دی جاتی لیکن کبھی بھی سردار کو میں نے نہیں دیکھا کہ اس نے ضد کی ہو کہ پہلے میں کیوں نہیں؟

پھر نئی اماں نے مجھے اسی طرح پیار دیا جس طرح میرے ابا کرتے تھے صرف مجھے ہی نہیں بلکہ میرے تمام بہن بھائیوں کو اماں نے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے جلدی ہی نئی اماں سے ایک بہن صادقہ اور بھائی عبدالحمید بھی عطا کر دئے۔ جو میرے بہت لاڈلے ہو گئے، باقی سب بہن بھائی مجھ سے بڑے تھے اور اب میں صادقہ اور حمید کی بڑی بہن بن کر بہت خوش تھی اور دل بھر کر اُن کو پیار کرتی تھی۔

صوباں بی بی صاحبہ بہت نیک فطرت، خدا ترس، غریبوں کی ہمدرد اور ہر ایک سے حسن سلوک کرنے والی خاتون تھیں۔ اُن کی خواہش ہوتی کہ وہ ہر کسی کے کام آئیں۔ خاموشی سے خدمت کرتیں اگر کوئی کچھ کہہ بھی دیتا تو برداشت کر لیتیں۔ اُن میں صبر کا مادہ بہت تھا۔ خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور خاص طور پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ؓ سے بہت محبت کرتیں تھیں۔ اکثر روزانہ یا کبھی دو ناغہ ڈال کر حضور ؓ کے گھر جاتیں۔ حضور ؓ بھی بہت شفقت سے پیش آتے۔ ہماری صوباں یا ہماری گورنر کہہ کر بلاتے۔

ایک دن اماں حضور ؓ کے گھر گئیں تو پتہ چلا کہ حضرت اُم ناصر صاحبہ ؓ نے ایک لڑکے کو کسی کام کے لئے بازار بھیجا تھا اُس نے آ کر بتایا کہ کسی نے اُسے ایک پڑیا دی کہ حضور کے آگے کھانا پیش ہو تو کسی طرح اُس میں ڈال دینا۔ جب ڈال دو گے تو بہت روپے دیں گے۔ اماں جب واپس گھر گئیں تو ابا جان کو یہ بات بتائی۔ آپ کو بے حد فکر ہوئی اور کہا کہ صوباں اب تم جا کر حضرت صاحب ؓ کا کھانا پکایا کرو اور خاص حفاظت سے پیش کیا کرو۔

اماں نے جا کر حضور کی خدمت میں عرض کیا کہ اس طرح میاں نے کہا ہے۔ آپ نے

فرمایا:

''صوباں میری تو ہر روز کھانے کی باری ہوتی ہے تم کدھر کدھر جا کر پکاؤ گی۔ میرا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو وہ خود میری حفاظت فرماتا ہے۔''

دارالفضل میں ہمارے گھر سے آگے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ کا باغ تھا۔ حضرت اماں جانؓ اپنے خاندان مبارک کی بہو بیٹیوں کے ساتھ باغ میں تشریف لاتیں تو ذرا دیر کو ہمارے گھر بھی تشریف لاتیں اور فرماتیں مَیں تو صرف یہ دیکھنے آئی ہوں صوباں کیسی ہے اور کیا کر رہی ہے۔

ہماری اماں کو تحریک جدید کے پانچ ہزاری مجاہدین میں بھی شامل ہونے کا شرف حاصل ہے اور آپ کا نمبر 527 ہے۔ آپ کا وصیت نمبر 2469 تھا۔ آپ کو لوائے احمدیت کے لئے سوت کاتنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ تاریخ لجنہ اماء اللہ جلد اوّل کے صفحہ 425 پر چھیالیسویں نمبر پر آپ کا نام اس طرح لکھا ہوا ہے:

''صوباں بی بی صاحبہ اہلیہ بابا فضل محمد صاحب آف ہرسیاں''

امتہ الباری ناصر صاحبہ اپنی تصنیف زندہ درخت میں تحریر فرماتی ہیں:

''پھوپھی جان صادقہ اپنی یادوں کو یوں بیان کرتی ہیں کہ جب اماں کی آخری بیماری تھی۔ بھائی کو دفتر کی طرف سے کشمیر جانے کا حکم ملا وقت کم تھا تیاری بھی کرنی تھی۔ ملنے کے لئے نہ آ سکے بھابھی کو پیغام دیا کہ اماں کو میرا اسلام کہہ دینا اور معذرت کر دینا۔ بھابھی کسی وجہ سے نہ آ سکیں فاصلے بھی کافی تھے پیدل ہی آنا ہوتا تھا۔ جب بھابھی آئیں تو اماں نے چھٹتے ہی کہا کیا بات ہے عبدالرحیم چار دن سے نہیں آیا۔ بھابھی نے سارا پیغام دیا تو اماں نے بڑی حسرت سے کہا

کہ عبد الرحیم تم مجھے ملے بغیر ہی چلے گئے اب پتہ نہیں نصیب میں ملاقات ہے بھی یا نہیں۔ میری فرض شناس بھابھی نے یہ سب خط میں لکھ کر بھائی کو بھیج دیا کہ آپ کی اماں نے آپ کے پیغام کے جواب میں یہ کہا ہے۔ بھائی نے خط ملتے ہی ایک خط دفتر والوں کو لکھا کہ میں واپس آنا چاہتا ہوں۔ ماں کی خدمت کا موقع پھر شاید نہ ملے۔ بھائی واپس آئے اماں کو بہت محبت سے ملے اور اپنے مکان کے نیچے کرائے پر دی ہوئی دکان دو دن کے نوٹس پر خالی کروا کے اماں کو اپنے پاس لے آئے۔ اماں کا ہر لحاظ سے خیال رکھا تیمارداری میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، لیکن بھائی کے گھر آنے کے پورے چودہ دن بعد اماں کا انتقال ہو گیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ نے جنازہ پڑھایا اور اماں قادیان میں مدفون ہوئیں بھائی اور بھابھی نے بہت خدمت کی۔ آج کل سگی اولاد بھی اتنا نہیں کرتی مگر اماں کے حسن سلوک نے اپنی عزت اور قدر کا ایک مقام بنایا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔''

(الفضل ربوہ 2 جون 2014ء)

○○

سفر یورپ و پاکستان اور 'بھائی پھیرو' کی یادیں

یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے، مَیں اور سامی صاحب اپنے کچھ رشتہ داروں کو جرمنی ملنے گئے ایک دن مَیں اپنے بھانجے عبدالوحید (میری بڑی بہن کے بیٹے) کے گھر بھی گئی۔ رات جب ہم سب مل کر بیٹھے تو اپنے اپنے سفروں کی کہانیاں شروع ہو گئیں۔ وحید سے ہی بات کا آغاز ہوا اور اُس پر ہی ختم ہوا کہ اب باقیوں کو کچھ بھی سنانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ یہ روئیداد میرے کہنے پر اُس نے مجھے لکھ کر دی ہے جو مَیں اب آپ سب کو بھی اس مزے دار سفر میں شامل کرنے لگی ہوں۔ ہوسکتا ہے جس طرح اس نے واقعات لکھ کر دئے ہیں ویسے مَیں نہ لکھ سکوں، لیکن مجھے یقین ہے کے آپ سب کو یہ سفر نامہ اچھا لگے گا اور زندگی میں ایسے ایسے واقعات جن کو انسان کبھی بھی بھول نہیں پاتا۔ آپ کو بھی اپنی بہت سی بھولی ہوئی باتیں یاد آئیں گی، پھر کم از کم یہ یادیں اور باتیں مسکراہٹیں ضرور چھوڑ جاتی ہیں۔

(صفیہ سامی)

کام سے چھٹی کر کے ویگن لی جس میں سات افراد کی جگہ نَو یا دس افراد کو اندر ڈالا ہوا تھا۔ کرایہ پانچ روپے دروازہ کھٹ کھٹیا اندر سے کافی آوازیں آ رہی تھیں۔ پریشانی میں ہی گھر پہنچا۔ پریشانی کی وجہ میری مالی حالت بھی تھی۔ ایک کمرے کا گھر بیوی اور بچی کے ساتھ

محدود تنخواہ جس میں بیٹی کے لئے دودھ کے پیسے بھی کم پڑ جاتے تھے۔ اکثر Overtime کے لیئے اپنے Boss سے درخواست کرتا تھا۔ گھر پہنچنے پر بیوی نے دروازہ کھولا اندر داخل ہوا، بیوی کے نانا نانی، اور اُس کی ماں یعنی پورے کا پورا سسرال براجمان تھا بھاگنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سلام دعا کے بعد ابھی بیٹھا بھی نہیں تھا کہ پہلا فرمان ہوا کے آپ انگلینڈ چلے جائیں۔

میں نے کہا آپ انگلینڈ ایسے کہہ رہے ہیں جیسے پانچ روپے والی ویگن پکڑوں اور کام پر چلا جاؤں، مجھے لگا شاید یہ کوئی مذاق کر رہے ہیں، یا یہ ذرا زیادہ ہی بوڑھے ہو گئے ہیں جو ایسی باتیں کر رہے ہیں، میرے پاس تو اگلے دن کے ناشتے کے پیسے نہیں ہیں آپ کہہ رہے ہیں انگلینڈ چلے جاؤ! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟

نانا جان بولے:

''میاں آپ نے ہی تو انگلینڈ جانے کی بات کی ہے!''

''نہیں نہیں..'' میں گھبرایا..''مَیں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں؟''

اوہو! ایکدم ایک واقعہ یاد آ گیا، ہوا یوں تھا کہ ایک روز میں مری روڈ کمیٹی چوک سے پیدل چند روپے بچاتے ہوئے اصغر مال روڈ کی طرف رواں دواں تھا کہ جلد گھر پہنچ جاؤں۔ جلد جلد قدم آگے بڑھا رہا تھا کہ آواز آئی: وحید.. دیکھا تو ایک دوست چائے کے کھوکھے سے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ یہ دوست بھی میرے سسرال سے ہی تعلق رکھتا تھا۔ بہت ہی نفیس پانچ بہنوں کا بھائی اور ماں باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ بہت ہی سمارٹ اور ہینڈسم لڑکا تھا۔ بہت ہی راز دار طریقے سے جیسے کوئی خزانے کی چابی مل گئی ہو مجھے بتانے لگا کہ وحید انگلینڈ کے راستے کھل گئے ہیں.. ٹکٹ لو اور چلے جاؤ۔ وہاں کچھ دیر کے بعد ویزہ مل جائے گا۔

سچ پوچھیں مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ لیکن ہاں اُس نے مجھے جو ایک گرما گرم چائے کی پیالی پلا دی اُس سے مجھے کافی راحت مل گئی اور آگے پیدل چلنے میں آسانی ہو گئی۔ چند منٹوں میں مَیں گھر پہنچ گیا، جیسے ہی دروازہ کھولا تو بیوی کا پہلا سوال یہ آج آپ کہاں رہ گئے تھے دیر سے آنے کی وجہ بتائی اور کہا اچھا کھانا لاؤ کھانا کھاتے ہیں، دل میں یقین تھا کہ دال ہی ہوگی لیکن دل کو تسلی کے لئے کھانا ہی کہتے تھے جس سے ہمارے معصوم جسم میں جان آجائے۔

کھانا کھاتے ہوئے اُس دوست کی بھی بات کی جس نے لندن جانے کے راستے کھل جانے کا ذکر کیا تھا۔ پھر یہ ہی ذکر میری بیگم نے اپنے والدین کو خط میں لکھ دیا جو اُس وقت ربوہ میں رہتے تھے اور آج یہ جو سب ہمارے گھر میں موجود تھے یہ اُس بات کا ہی ذکر تھا۔ وہ سب مجھ سے اس بات کی پوچھ گچھ کر رہے تھے اور میں بظاہر انجان بنا اُن کی بات سُن رہا تھا۔ کے مجھے اس افسانے کا کوئی علم ہی نہیں ہے۔ اُنہوں نے کہا اب ہم آ گئے ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ دیکھو کیسے جانا ہے۔ مَیں نے کہا یہ تو ٹھیک ہے اس کے لئے تو زادِ راہ کی بھی ضرورت ہے۔ جواب ملا یہ تمہاری فکر نہیں یہ ہم کریں گے بس تم تیاری کرو۔ یہ سن کر اِک بار تو ایسے لگا دل نکل کر مُنہ میں آ گیا ہے، اور دل ہی دل میں دعا کی اللہ ایسا سسرال سب کو دے۔

تیاری کیا کرنی تھی، کرسی پر بیٹھے تھے کھڑے ہو گئے، پھر کچھ خیال بھی آنے شروع ہو گئے۔ سنا ہے یورپ میں برف باری بہت ہوتی ہے۔ ٹھنڈ بھی بہت ہوتی ہے۔ سنا ہے لنڈن زمین کے اندر بنا ہوا ہے، جہاز برف کے اُوپر اُترتے ہیں۔ جیسے چاند پر جانے کے لئے خاص قسم کے لباس کی ضرورت ہوتی اس طرح اب لنڈن کے لئے بھی سپیشل لباس چاہیے ہوگا۔ سو مَیں اور میری بیوی اندرونِ راجہ بازار چاند پر اُترنے والا لباس ڈھونڈنے نکل پڑے۔ گرم

کوٹ گرم پینٹ لونگ شوز ویسے شوز تو میں نے لینے ہی تھے کیونکہ میرے بوٹوں میں چل چل کر تلووں میں بڑے بڑے سوراخ ہو چکے تھے۔ ہمیشہ دعا یہی کرتے تھے کہ اللہ بارش نہ ہو پاؤں گیلے ہو جائیں گے۔ (جیسے اب یہاں گاڑی دھلوا کر دعا مانگتے ہیں کہ بارش نہ ہو گاڑی پھر گندی ہو جائے گی)

خرید وفروخت شروع ہوگئی۔ ایک نایاب قسم کا بہت بڑا سا سوٹ کیس خریدا جس میں رضائی گدا اور گھر کا کافی ساز و سامان سما جائے، تیاری مکمل ہوگئی۔ رات کافی لیٹ گھر پہنچے۔ سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو نیند کا نام نشان نہیں تھا۔ کبھی لندن، اور لندن کی گلیاں اور کبھی جہاز جس میں مَیں پہلے کبھی بیٹھا نہیں تھا، پھر لندن اُتر کر وہاں کے کیا مسائل ہوں گے؟ ان ہی سوچوں میں دن نکل آیا، ناشتہ کیا اور بھاگ کر وہی پانچ روپے والی ویگن پکڑی اور کام پر لیٹ پہنچا اور یہ کام پر لیٹ پہنچنا روزانہ کا معمول تھا۔ مینیجر اچھا آدمی تھا کام سے نہیں نکالتا تھا مگر ہر روز یہ فقرہ دہراتا آج پھر لیٹ ہو وحید، مگر آج مَیں خود کام چھوڑنے گیا تھا، مَیں نے اپنے مینیجر کو اپنی ساری کہانی سنائی اور آخر پر کہا سر میں لندن جا رہا ہوں، مجھے چھٹی چاہیئے، وہ سر جھکائے میری بات سنتا رہا آخر میں بولا جاؤ جا کر کام کرو، تم ابھی تک نیند میں ہو، کوئی چھٹی وٹی نہیں، تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔

مَیں نے ڈرتے ہوئے کام شروع کر دیا۔ اُسے میری باتوں کا یقین نہیں آیا۔ آتا بھی کیسے کہ مَیں ہر روز اُس سے overtime کے لئے کہتا اور وہ یہ بھی جانتا تھا یہ بالکل کنگلا کھانے کو پیسے نہیں اور بات لندن کی کر رہا ہے۔

شام کو چھٹی کے وقت پھر مَیں نے ڈرتے ڈرتے بات کی کہ سر مَیں اب کام پر نہیں آؤں گا مَیں واقعی لندن جا رہا ہوں۔ اُس نے بے یقینی سے کہا ٹھیک ہے لیکن کل کام پر ضرور آنا

اُس کے بعد شاید میں ایک دودن گیا ہونگا لیکن یاد نہیں ۔ ہاں اِن ایک دودن میں لندن کا ٹکٹ ضرور خرید لیا گیا اور سب جگہ اعلان کر دیا گیا کہ مَیں لندن جا رہا ہوں، لیکن اُس دوست کو نہیں بتایا جس نے لندن جانے کا راستہ بتایا تھا، کیونکہ وہ مجھے پھر اس چائے والے کھوکھے پر نظر ہی نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے وہ مجھ سے بھی پہلے لندن پہنچ چکا ہو۔

میری ٹکٹ بھی اگلے دن کی ہوگئی ۔جلدی جلدی سارے انتظامات ہو گئے۔ رات گزارنی مشکل ہوگئی نیند کوسوں دور تھی ۔، کچھ دیر کے بعد ابھی آنکھ جھپکی ہی تھی کے گھر کا دروازہ کوئی کھٹکھٹا رہا تھا جلدی میں دروازہ کھولا تو باہر میری بہن کھڑی تھی کہ لندن سے میرے کسی دوست کا فون آیا ہے کہ یہاں کے حالات بہت خراب ہیں لندن آنے کی غلطی نہ کرنا۔ مجھے ایسے لگا جیسے پکی پکائی دیگ اُلٹ گئی ہو۔ تمام پروگرام ختم اور اب مجھے ایسے لگنے لگا، کام پر میرا مینیجر ٹھیک کہہ رہا تھا کہ لندن جارہے ہو تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا، سو چا اب دوبارہ کام پر کیسے جاؤں گا۔

بہر حال سسرال والوں نے میرے جیسے کھوٹے سکے کو داؤ پر لگایا ہوا تھا۔ مَیں نے اُن کو ساری بات بتائی کہ لندن سے میرے ماموں کا لندن نہ آنے کا پیغام آیا ہے اور لندن جانا پیسے کو ضائع کرنا ہے۔ لیکن میری بیوی کے نانا صوبیدار عبدالمنان صاحب نے جواب میں کہا کہ مَیں نے رات کو خواب دیکھا ہے کہ چڑیاں صحن میں سے اُڑ کر اُوپر دیوار پر جا بیٹھی ہیں۔ یہ ایک مبارک خواب ہے، میرے لئے خشک زمین پر ایک بارش کا قطرہ تھا، خواب مبارک تھی یا نہیں میرے لئے اب یہ ہی مبارک بات تھی کہ اب تم لندن جاؤ، کیونکہ ذہنی طور پر تیار تھا ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھا اور صبح کو فلائٹ تھی۔ اب صرف مجھے جلدی ائیر پورٹ پہنچنا تھا۔ اللہ بھلا کرے میرے ایک دوست کا جو وقت پر اپنی موٹر سائیکل لے کر میرے گھر پہنچ

گیا اور مَیں دروازے پر ہی اپنی فیملی کو سلام کر کے چھلانگ مار کر اُس کی سائیکل پر بیٹھ گیا اور وہ بوری نما بیگ پیچھے لٹکا لیا۔ میرے دوست کو کچی پکی سڑکوں کا علم تھا سو اُس نے وقت پر مجھے ائیر پورٹ پہنچا دیا، ابھی British Air Ways والے میرا انتظار کر رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے میری جامہ تلاشی ہونی تھی جس کے بارے مجھے کچھ علم نہیں تھا۔

اب میں بڑی شان سے اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ لیکر اندر داخل ہوا۔ ایک پولیس مین مجھے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی واردات میں ملوث ہوں اور اُس نے مجھے پہچان لیا ہو، لیکن جلدی احساس ہو گیا کہ اُس کا کوئی قصور نہیں میری حالت ہی ایسی تھی لمبی لمبی مونچھیں چاند پر اُترنے والے لمبے لمبے بوٹ، سب سے پہلے اُس نے مجھے ایک دروازے سے گزارا اور ساتھ کہا بوٹ اتارو۔ مَیں پریشان ہو گیا کہ اس میں اس نے کیا خاص بات دیکھ لی؟ اور خاص بات یہ تھی کہ بوٹ کی ایڑی تھوڑی بڑی اور چوڑی سی تھی، پولیس والوں نے اُس کے اندر تک جانے کا راستہ ڈھونڈنے کی کوشش شروع کر دی اور اُس کو زمین پر مار مار کر چیک کرنا شروع کر دیا۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور پوچھ لیا اس میں سے کیا ڈھونڈ رہے ہو مَیں کوئی سمگلر نہیں ہوں، اُس کا جواب سن کر میں حیران پریشان ہو گیا کہ بھائی سمگلر بالکل آپ کی ہی طرح کے ہوتے ہیں۔

آج جب میں اپنی پرانی تصویر دیکھتا ہوں تو اُس کی بات سچ ہی لگتی ہے۔ میری شکل ہی ایسی تھی۔ میری بھی مونچھیں اس پولیس والے کی طرح بڑی بڑی تھیں چہرے سے گھبراہٹ نمایاں نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا ضرور کچھ نہ کچھ چھپا کر لے جا رہا ہوں۔ لمبی چوڑی تلاشی کے بعد جب کچھ نہ ملا تو مخاطب ہوا کہ لندن جا رہے ہو؟ مَیں نے کہا جی میں لندن جا رہا ہوں۔ مجھے جواب میں بولا تمہارے جیسے روز یہاں سے لندن جاتے ہیں اور اگلے جہاز میں واپس آ رہے

ہوتے ہیں۔لیکن اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ بہت ساری دعائیں ہیں۔

بہر حال میں جہاز میں داخل ہو گیا۔ جہاز چلنے سے پہلے کچھ اعلانات ہوئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ اُن کے لاوڈ سپیکر خراب تھے ویسے بھی انگلش کی مجھے سمجھ کہاں تھی۔ جب ائیر ہوسٹس نے اشاروں سے سمجھایا تو سمجھ آ گئی سوائے بیلٹ باندھنے کے یا شاید ہم دل سے یہ ہی چاہتے تھے کہ وہ خود ہی آ کر باندھ دے۔

میرے ساتھ ایک پاکستانی بیٹھا ہوا تھا۔ اسلام آباد سے لندن تک اُس نے میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔شاید اُسے شک تھا ہم اُس سے کوئی پیسے نہ مانگ لیں لیکن مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ جیسے ہی جہاز نے پاکستانی سرزمین سے اپنے پاؤں چھوڑے میرا دل بیٹھنے لگا اور آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات برسنے لگی۔ بہت ساری چیزیں ساتھ لیکر جا رہا تھا اور سارا کچھ چھوڑ کر جا رہا تھا۔بچپن سے لیکر اب تک کی تمام چیزیں، احساسات اپنا ماحول، اپنی آزادی، اپنی زبان، اور بہت کچھ، جو لیکر جا رہے تھے فکریں پریشانیاں اور خوف۔ پیچھے چھوڑ کر جانے والی چیزوں میں غربت اور افلاس بھی ہے۔

اور اب پریشانی اور خوف یہ تھا کہ لندن پہنچ کر ائیر پورٹ پر میرے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ مجھے باہر جانے بھی دیں گے یا وہ پولیس والے کی بات سچ ہو گی اور پھر جامہ تلاشی کروانی پڑے گی اور ساتھ اُس کی لعن طعن سننی پڑے گی۔اب مَیں نے جہاز میں ہی ائیر پورٹ سے باہر نکلنے کی سکیمیں بنانا شروع کر دیں۔ بُرے بُرے یتیموں والے منہ بنانے شروع کر دئے، جیسے جہاز کے عملے نے ہی مجھے ویزہ دلوانا ہے کیونکہ مَیں نے ان کی ائیر لائن کا ٹکٹ جو خریدا ہے، کبھی سفر کی تھکاوٹ، کبھی شدید سر میں درد، کبھی جہاز کے شور کا شکوہ، لیکن ان ساری باتوں کا جیسے اُن پر کوئی اثر ہی نہ ہو۔ جب ان ساری باتوں کا کوئی فائدہ نظر نہ آیا تو پھر کچھ اور سوچنے

کی ضرورت محسوس ہوئی اب یہ سوچا کہ جب جہاز لینڈ کرے گا تو جہاز سے نکل کر ایک طرف دوڑ لگا دیں گے مجھے اندازہ تھا کے بھاگنے میں تو ہم ماسٹر تھے۔ ہمیں کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ یا پھر پاسپورٹ چیک کرنے والے کا انتظار کریں گے کب اُن کے پاس رش ہو اور ہم آنکھ بچا کر نکل بھاگیں۔

جہاز لنڈن ائیر پورٹ پر اُترنے لگا ہم نے اپنی طبیعت اور خراب کرنے کی کوشش شروع کر دی کہ شاید ویزہ پکا ہی لگ جائے۔ لوگ جہاز سے باہر نکلنے شروع ہو گئے۔ ہمیں بھاگنے کے لئے کوئی میدان نہیں نظر آیا۔ ایک سُرنگ میں لوگ لائن لگائے نکل رہے تھے۔ جہاز کا عملہ بھی سارا غائب ہو گیا، اور اب یہ سُرنگ ہمیں وہاں تک لے آئی جہاں پاسپورٹ چیک ہو رہے تھے۔ ہم بھی لائن میں کھڑے ہو گئے جب کہ ہمیں لائن میں لگنے کی عادت نہیں تھی۔ ہم نے اُوپر سے اور کبھی دائیں بائیں جھانکنے کی بہت کوشش کی مگر مجال ہے جو بھاگنے کا کوئی بھی چانس ملتا۔ آرام سے کھڑے ہو گئے۔

ایک بہت خوبصورت لڑکی نے ہم سے پاسپورٹ مانگا، دل خوش ہو گیا کہ بس یہ تو ہمیں آرام سے پاس کر کے جانے دے گی۔ کیونکہ وہ بہت غور سے ہمدردی بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ میرا پاسپورٹ اندر باہر سے دیکھ رہی تھی جو صاف اور شفاف تھا کوئی مہر وغیرہ نہیں تھی اور پھر انگریزی میں کچھ بولی جس سے مجھے اتنی سی سمجھ آئی کہ آپ شاہی مہمان ہیں۔ بس پھر تھوڑی ہی دیر میں شاہی میزبان ہمیں لینے آ گئے، میری وجہ سے میرے پیچھے ایک لمبی لائن لگ گئی تھی میں لائن سے نکلا تو لوگوں نے شکر کیا اور ہم اُن میزبانوں کے ساتھ چل پڑے جن میں ایک گورا اور دوسرا انڈین تھا، مجھے ایک کمرے میں لے گئے اُنہوں نے ہاتھوں پر دستانے پہنے اُس وقت میرا بوری نما سوٹ کیس بھی آ چکا تھا۔ گورے نے پہلے وہ کھولا جس میں

سب سے اُوپر میرا تھری پیس سوٹ تھا تا کہ خراب نہ ہوجائے، اُس نے اُس کو ایسے پکڑا جیسے مرے ہوئے چوہے کو دُم سے پکڑ کر باہر پھینکتے ہیں، اُس نے کوٹ کو اچھی طرح ٹٹولا اور اُس کی آنکھوں میں چمک آ گئی مَیں خوش ہوا کہ شکر ہے میرا کوٹ اسے پسند آ گیا ہے، اتنا نایاب کوٹ اس نے پہلے کہاں دیکھا ہوگا ابھی مَیں اس کوشش میں ہی تھا کہ مَیں اپنے سوٹ کی تعریف شروع کروں، اُس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا یہ کیا ہے۔ میں نے کہا میرا سوٹ ہے۔

اُس نے زور زور سے سر ہلانا شروع کر دیا، مَیں نے شکر کیا کے شاید اس کو سمجھ آ گئی ہے۔اُس نے میرے کوٹ کو کھینچ کر استری کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان سے آیا ہوا کوٹ لندن تک سفر سے کافی چڑمُڑ ہوا پڑا تھا۔اُس نے کوٹ کی تلاشی شروع کر دی تمام جیبیں خالی تھیں۔مگر ایک جگہ اُس کے ہاتھ کو کوئی سخت چیز محسوس ہوئی جس کا مجھے بھی علم نہیں تھا کہ کیا ہے، اُس نے دبا دبا کر مجھے بھی محسوس کروایا۔ مجھے فوراً سمجھ آ گئی کیا چیز ہے یہ پن کے اندر کا حصہّ تھا جو پھٹی ہوئی جیب میں سے کوٹ کے اندر داخل ہو گیا۔اس کو پاکستان میں ہم refill کہتے ہیں۔ مَیں نے اُسے کہا یہ ریفل ہے، وہ سمجھا کہ میں رائفل کہہ رہا ہوں۔ اُسنے کہا کہ اس کو باہر نکالو۔ مَیں نے ہاتھ اُس سراخ میں ڈالا اور وہ ریفل نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ انڈین دیکھ کر بولا انگریزی تو ٹھیک سے بول لیا کریں۔ مَیں تو ٹھیک ہی بول رہا تھا اُنہیں کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال تلاشی کے بعد مجھ سے پوچھا کے باہر کوئی لینے آیا ہے مَیں نے ساری فیملی کے نام لے دیئے۔تھوڑی دیر کے بعد میری نانی جان اور خالو اندر آ گئے نانی جان نے تو رونا شروع کر دیا۔اُدھر گورا بھی دل میں رو رہا تھا کہ اب تو ویزہ دینا ہی پڑے گا۔ میرا پاسپورٹ تو رکھ لیا ایک پیپر پر دو ہفتوں کا ویزہ دے کر اپنی جان بچائی اور ساتھ کہہ دیا کہ اگر نہ آئے تو پھر

شاہی مہمان بننے کا پیغام بھی دے دیا۔

اب ہماری گاڑی لندن کی صاف سُتھری سڑکوں پر بھاگی جارہی تھی اور ہم لندن کا نظارہ کرتے جارہے تھے۔گھر میں سب ہمارا انتظار کررہے تھے ہمارے نانا جان (مرحوم) نے ہمیں اپنے گلے لگایا آنکھوں میں آنسو تھے اور دُعائیں دے رہے تھے۔میرے آنے سے سب بہت خوش تھے ساتھ ہی میرے دوہفتوں کے ویزے سے سب پریشان بھی تھے اور اس ہی سوچ سے میرے نانا جان نے اگلے دن اپنا اور میرا پاس بنوایا اور ہرروز پورے لنڈن کی سیر کے لئے کبھی پارکوں میں اور کبھی بڑے بڑے بازاروں میں لیکر جاتے یہ سب اُن کی خوشی کے لئے کرتا ورنہ میرے اندر ہر وقت یہ ہی فکر ستائے جاتی کے دوہفتوں کے بعد کیا ہوگا۔اور دو ہفتے چند گھنٹوں میں گزر گئے اور واپسی کی تیاری شروع ہوگئی میرے بیگ میں تمام چیزیں جیسے نکالی گئی تھیں دوبارہ ڈالی گئیں ۔ بھاری قدموں سے دوبارہ ائیر پورٹ پر روانہ ہوگئے اور اُس وقت میرے تمام رشتے دار اور چھوٹے سے چھوٹے بچے بھی اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں ہاتھ اُٹھائے دُعاؤں میں لگے ہوئے تھے۔اللہ کا نام لیکر ائیر پورٹ میں داخل ہوئے۔گورے مجھے ایک کمرے میں لے گئے ۔وہاں پھر میرا انٹرویولیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے وہ تمام دُعائیں قبول فرمائیں جو ننھے منے اور بزرگوں کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں نے کی تھیں، گورے فیل ہوگئے اور اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور مجھے ایک ماہ کا ویزہ مل گیا اور ساتھ کہا اگر اور ضرورت ہوتو آپ ہوم آفس چلے جانا۔آج ہم سب بہت خوش تھے میرے پاسپورٹ پر مہر لگ کر میری جیب میں آچکا تھا،کل کیا ہوگا اب آرام سے پروگرام بنائیں گے۔مبارک بادیں شروع ہوگئیں، پاکستان بھی اطلاع دے دی گئی۔

کچھ دنوں کے آرام کے بعد ہماری خالہ نے اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی جو کہ ان

ملکوں میں بہت نایاب بات ہے۔ہم فوراًاپنی خالہ کے گھر چلے گئے،خالہ کے سب بچوں نے بہت پیار دیا۔سب بچے مجھ سے چھوٹے تھے۔سارا دن بھائی جان بھائی جان ہوتا بہت مزے کئے۔مزا یہ بھی تھا کہ پاکستان میں اگر کسی کے گھر فریج ہے تو اُس کو تالہ لگا ہوتا یہاں فریج بھرے ہوئے بھی اور کھلے بھی جب چاہیں اور جو چاہیں کھا پی سکتے ہیں،مزا ہی مزا۔

ایک دن میرے کزن نے پوچھا بھائی جان آئس کریم کھانی ہے،دل تو کر رہا تھا مگر تکلفاً کہہ دیا نہیں وہ چپ ہو گیا۔میرے دل میں تھا وہ پھر کہے گا کھا لیں لیکن اُس نے نہیں پوچھا۔پھر سمجھ آ گئی کے یہاں ایسے نہیں چلے گا جو بات ہے صاف کہہ دینے میں ہی فائدہ ہے۔

نانا جان کے ساتھ باہر جاتا تو فٹ پاتھ پر اگر کوئی خالی Can ہوتا تو فٹ بال کی طرح ٹھڈے مار مار کر چلتا۔نانا جی کہتے بچے میں آپ کو فٹ بال لے دیتا ہوں یہاں ایسے نہیں چل سکتے۔پھر اگر کسی گھر کی دیوار سے کوئی پھل یا پتے نظر آتے تو اُن کو بھی میں ہاتھ اُٹھا کر توڑنے کی کوشش کرتا،پھر نانا جی سمجھاتے۔

ایک دن کہتے وحید تمہاری پرابلم کیا ہے کیوں ایسے کرتے ہو۔اُن کو تو جواب نہیں دیا دل میں سوچا کہ ہماری پرابلم یہ ہے کہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے اور اپنی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔لیکن اُس کے بعد مَیں نے اپنی عادتوں کو کنٹرول کرنا شروع کر دیا۔

اپنے خالہ زاد چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی دیکھا۔اُن کے ساتھ بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی خاص طور پر شازی (منیر شہزاد) جس کو سب شازی ہی بلاتے تھے۔بہت خاموش سا تھا لیکن بڑے سے بڑے کام کر جانے والا۔اُس نے مجھے بہت سیریں کروائیں۔چند دنوں کے بعد

خالہ اور خالو نے توجہ دلائی کے اب اپنی اصل زندگی کی طرف لوٹ آ ؤ،نہیں جانتے کل کیا ہو کچھ کام کی باتیں بھی ہو جائیں ، ایک دن خالہ مجھے ایک ایشین گروسری سٹور پر لے گئیں جہاں مزدوری کا کام تھا۔ مَیں جوان تھا ہمت والا تھا کام شروع کر دیا۔ بوریاں اُٹھانی تھیں لوگوں کا سامان کاروں کی ڈگی میں رکھنا تھا۔ یہ سب تو ٹھیک تھا مگر چونکہ اُن کی ساری فیملی بچوں سمیت اپنی دُوکان پر کام کرتے تھے۔اُن کو پورا اختیار دیا ہوا تھا کہ دوکان میں کام کرنے والوں کے ساتھ جیسے چاہو پیش آ ؤ، سو ہم تین ہفتوں کے بعد ہی دوکان سے باہر کھڑے تھے کہ ہم جیسے غیرت مندوں کی اُن کو ضروت نہیں تھی۔

لٹکے منہ کے ساتھ گھر آیا خالہ کو بہت دکھ ہوا۔ مَیں بہت خوش تھا، پاکستان میں کم از کم ایسے مزدور تو نہیں تھے کہ سب کے سامنے بوریاں اُٹھاتے رہیں۔ دراصل ہم پاکستانی مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں کام کرنا ہمارے لئے موت کے برابر ہے۔

پھر بھی خالہ کو ساری بات بتائی خالہ نے تسلی دی اور فوراً ہی دوسرا کام ڈھونڈ نکالا۔اُن کی کوئی دوست تھی اُن کی KFC کی دوکان تھی۔اُن کو ہر وقت کسی نا کسی کام والے کی ضرورت رہتی تھی۔ہم وہاں چلے گئے۔ یہ کام مجھے بہت پسند آیا۔اُن کے ریسٹورنٹ کے پیچھے مجھے کام کرنا تھا کھانا بھی مفت ملتا تھا۔ سارا دن کام ہوتا خاص طور پر جب رات کو ریسٹورنٹ بند ہوتا تو وہ سر پر کھڑے ہو کر صفائی کرواتے کیونکہ یہاں صفائی کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔دُکان کے اُوپر ہی ایک کمرہ تھا رات کو وہاں جا کر سو جاتا دن بھر کا تھکا ہوا ہوش نہیں ہوتی تھی کہ پاکستان میں ہوں یا لندن کے کسی سٹور میں سویا پڑا ہوں۔

صبح اُٹھ کر خالہ کے گھر جاتا ناشتہ وغیرہ اور نہا دھو کر پھر تین بجے کام شروع ہو جاتا۔ الحمدللہ اچھے پیسے بن جاتے یعنی میں اب کماؤ پُتر ہو گیا تھا۔ میرے پاس اب چار ماہ کا ویزہ تھا یہ ویزہ

مجھے ہوم آفس نے دیا تھا اور میرے خالو میرے ساتھ گئے تھے کہ انگلش کے ہم محتاج تھے۔

اب اگلے پروگرام کی سوچ تھی کہ کیا کرنا ہے۔ہم ایک قدم بھی حضور سے مشورہ کئے بغیر نہیں چل سکتے۔سو ہم نے ملاقات کا وقت لے لیا۔ پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کے آفس میں میرے ماموں محمد اسلم خالد صاحب کام کرتے تھے (ماشاء اللہ ابھی بھی کرتے ہیں) ملاقات کے لئے گیا۔سیکرٹری صاحب نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا۔ ہمارا حلیہ وہی تھا جو ائیر پورٹ پر تھا۔ہمیں اندر جانے کی اجازت دی اور خود دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ سے ملاقات میں جلدی سے حضور سے کہا، حضور میں اب پاکستان نہیں جانا چاہتا..حضور! میں کہاں جاؤں! حضورؒ نے فرمایا مجھے کیا علم تم کہاں جاؤ... جہاں جی چاہتا ہے چلے جاؤ۔ پھر شاید رحم آیا فرمایا ناروے چلے جاؤ یا ڈنمارک چلے جاؤ۔اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔ملاقات ختم ہوگئی۔میں بھی نروس تھا، جلدی سے باہر آ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد پرائیویٹ سیکرٹری صاحب نے میرے ماموں کو پوچھا یہ کون لڑکا تھا۔ماموں نے بتایا کہ میرا بھانجا ہے۔سیکرٹری صاحب نے کہا کہ یہ لڑکا ''تر گیا'' ہے۔اس کو حضور نے دل سے دعا دے دی ہے اور پھر یہ سچ بھی ہو گیا۔ جہاں بھی ویزہ کے لئے گیا، ماموں کے ساتھ اٹلی ایمبسی گیا ویزہ مل گیا۔اُس کے بعد خالہ کے بیٹے منیر کے ساتھ ایمبسیوں میں گیا بیلجیم، سویٹزر لینڈ، اور جہاں بھی گیا، میری شکل دیکھے بغیر ویزہ دے دیتے۔ یہ سب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور حضورؒ کی دعاؤں سے ہوا۔

جرمنی کا ویزہ لینے گیا۔دو دن کی مہلت مانگی۔دو دن کے بعد ویزہ لینے گیا۔کھڑکی میں سے لڑکی نے کچھ سمجھانے کی کوشش کی جو میری سمجھ میں نہ آیا میں واپس جانے لگا تو پھر اُس نے آواز لگائی۔جیب کی طرف اشارہ کیا۔پھر سمجھ آئی کہ فیس مانگ رہی ہے۔جلدی سے پیسے

دیئے اور گھر بھاگے۔اب صرف مجھے اپنی ہی اجازت کی ضرورت تھی کہ میں کب لندن سے رخصت ہوتا ہوں۔نانا جان اور نانی جان کی دعائیں ماموں اور ممانی کی چھیڑ چھاڑ، خالہ اور خالو کی فکرمندیاں سب نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔

خالہ کے دو بچے چھوٹے تھے جن کو کبھی کبھی انگلی پکڑ کر سکول بھی لیجا تا تھا۔ یہ سب کے ساتھ پیار کے تانے بانے بن چکے تھے۔سردیاں شدید تھیں۔جانے کی تیاری شروع ہوگئی۔ خالہ نے زبردست قسم کی موٹی Hud والی جیکیٹ لے دی ۔ ماموں مجھے وکٹوریا اسٹیشن چڑھانے گئے مَیں نے دیکھا کے ماموں اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈ رہے ہیں ہ تھوڑی دیر کے بعد اُن کو اُن کی مطلوبہ چیز مل گئی۔وہ تھے ایک انڈین آدمی جن کے سُپرد مجھے کیا کہ راستہ میں وہ میرا خیال رکھیں۔اس ٹرین نے ہمیں بحری جہاز تک پہنچا دیا وہاں ہماری چیکنگ ہوئی۔ چیک کرنے والے نے سارے ویزے دیکھے اور ہمیں دیکھا اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کے اس پاسپورٹ پر اتنے ویزے! مجھے پاسپورٹ واپس کیا اور شکریہ کہا مجھے یقین تھا اُس نے میرا شکریہ لندن چھوڑنے پر ہی کیا ہوگا۔

بحری جہاز میں سوار ہو گئے۔ جہاز بہت ہی بڑا تھا۔ مجھے تو بڑا ہی لگتا تھا، میرے لئے یہ سب تجربات نئے تھے۔انگلینڈ کی روشنیاں دور سے دور ہوتی گئیں، اب فکر تھی کے نا جانے اب آگے میرے ساتھ کیا ہوگا، مَیں نے اُس انڈین پر اب نظر رکھی ہوئی تھی اتنے بڑے جہاز میں کہیں گم نہ ہوجائے۔لوگوں میں یہ نمایاں نظر آ رہا تھا۔وہ انڈین سے زیادہ افریقن لگتا تھا۔ اس لئے ڈھونڈ نا زیادہ مشکل نہیں تھا۔رات ہوگئی تھی چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور سمندر کا شور تھا اور پانی کو چیرتا ہوا جہاز اپنی منزل کی طرف بھاگ رہا تھا،تھوڑی دیر میں جہاز کے اندر دُکان کا دروازہ کھول دیا گیا۔مَیں بھی اندر ضرور گیا مگر صرف چیزیں دیکھیں اور اپنی

جیب میں سے Polo نکال کر منہ میں رکھی اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے دوکان سے باہر نکل آیا۔ لوگ شاپنگ کر رہے تھے لیکن میرے لئے ابھی یہ سب میری پہنچ سے باہر تھا۔

بہری جہاز میں اور سمندر کے پانی میں ایک جنگ جاری تھی۔ کچھ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے کچھ سیٹوں پر سونے کی کوشش کرتے رہے اور ہمارے ساتھی نے بھی جو کہ ایک انڈین تھے، اپنے بیگ میں سے اپنی شراب کی بوتل نکالی اور شروع ہو گیا۔ گورے پیتے ہیں تو کم از کم اپنے ہوش و حواس میں تو رہتے ہیں، لیکن اس کا نشے سے بُرا حال تھا۔ ہماری منزل قریب آ گئی بندرگاہ کی روشنیاں نظر آنی شروع ہو گئیں، لوگوں نے اپنا اپنا بکھرا ہوا سامان اکھٹا کرنا شروع کر دیا جو جہاز کے ہچکولوں سے اِدھر اُدھر بکھر گیا تھا۔ جلدی جلدی باہر جانے والے راستے پر لائنیں بننی شروع ہو گئیں۔ راستے کھول دئے گئے۔ جن صاحب نے میرا خیال رکھنا تھا اُن کا سامان میں نے اُٹھایا ہوا تھا۔ وہ نشے میں مدہوش تھے اور اُن سے چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

بحری جہاز کو چھوڑ کر بیلجیم سے پھر ٹرین میں بیٹھے۔ صبح کا وقت تھا۔ ٹرین کے ڈبے قریباً خالی ہی تھے۔ یہ بندہ تو چار بندوں کی سیٹ پر اپنا پیٹ لٹکائے سو گیا۔ جب اگلا اسٹیشن آیا اور مزید سواریاں اندر آئیں تو اس کو اُٹھانے کی کوششیں شروع کیں اور وہ آنکھیں ملتا ہوا بیٹھ گیا۔ مَیں نے شرمندہ سا ہو کر اپنی جیب میں سے اپنی پسندیدہ Polo سب کو آفر کی جو سب نے انکار کر دیا اور میری شرمندگی اور بڑھ گئی۔

چھ گھنٹے کے سفر کا اختتام ہوا۔ کہنے لگا لو، فرنکفرٹ آ گیا۔ دل میں سوچا مجھے تو علم ہی ہے کہ مَیں تو جاگ ہی رہا تھا۔ تمہیں ہی نشے نے چور کیا ہوا ہے، پھر بھی مَیں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور وہ اپنی اور مَیں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

اور پھر 13 سال کے بعد جب کہ میرے والدین، میری بیوی بچے اور میرا ایک بھائی بھی اپنی فیملی کے ساتھ جرمنی میں آ کر آباد ہو چکے تھے میرے دل میں پھر ایک بار اپنے پاکستان کی یاد نے آ ڈیرا ڈالا اور جھٹ پٹ پروگرام بنا یا اور اپنے دیس واپس جا کر اپنی یادوں کو تازہ کرنے کو دل مچل اُٹھا۔ پاکستان کی محبت پہلے سے ہی بہت تھی۔ انسان جہاں پیدا ہوتا ہے اور بچپن گزارتا ہے وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہی وجہ تھی کے پاکستان جانے کا فوری فیصلہ کر لیا۔ ٹکٹ Air Emirates کا ملا۔ پاکستان میں میری دو بہنیں تھیں اُن کے لئے اور باقی بھی تمام بچوں اور بڑوں کے لئے تحفے اور اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لیں۔

وقت پر ائیر پورٹ پہنچ گیا۔ اس دفعہ بہت خود اعتمادی تھی، کوئی خوف نہیں تھا، چہرہ بھی پہلے سے کچھ نہ کچھ بدل گیا تھا اور لباس بھی ایسا نہیں تھا کہ ہر کوئی مجھے ہی دیکھے۔ غرض سب کچھ مناسب ہی تھا۔ اس بار سامان والا اٹیچی کیس بھی اچھا تھا، جو جہاز کے اندر چلا گیا اور جو چھوٹا بیگ ہاتھ میں تھا وہ بھی کافی اچھا تھا، امیگریشن والے بھی بہت ہی بھلے تھے۔ پاسپورٹ پر صرف ایک نظر ڈالی اور آگے کے سارے دروازے خود بخود کھلتے گئے اور ہم آرام سے جہاز کے اندر پہنچ گئے۔ اس بار جہاز میں بہت سکون سے بیٹھے بیلٹ بھی خود ہی باندھ لی، رن وے کی دوڑ کو بھی enjoy کیا۔ جہاز کے نیچے گھر ماچس کی ڈبیہ کی طرح چھوٹے چھوٹے لگنے لگے۔ انسان تو نظر ہی نہیں آتے تھے۔ چھ گھنٹے کی فلائٹ کے بعد دوبئی پر جہاز لینڈ کر گیا۔ دو گھنٹے اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد پاکستان جانے والوں کی لائن لگ گئی۔

یہ نظارہ مَیں نے پہلی بار دیکھا تھا، پاکستانی ڈراموں میں دیکھا اور سُنا تھا لیکن اب مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، ہمارے پاکستانی بھائی جن کے چہروں پر انتہا کی خوشی نظر آ رہی تھی اور باتوں سے بھی محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی جیل سے رہا ہو کر آ رہے ہیں اور جیل

میں محنت مزدوری کر کے جو رقم حاصل ہوئی اُس سے اپنے بیوی بچوں کے لئے چیزیں اُٹھائی ہوئی تھیں۔ ایک خان صاحب نے لمبی سی سُرخ رنگ کی ٹیپ ریکارڈر اپنے کندھے پر اُٹھائی ہوئی تھی، بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے گھر والی چپلیں پہن رکھی تھیں، کچھ لوگوں نے گٹھڑیاں کندھوں پر رکھی ہوئی تھیں، سُرمہ لگائے ہوئے بچے ماؤں کی گودیوں میں خوش نظر آ رہے تھے اور کچھ بزرگ داڑھیوں والے جن کے چہروں اور جسم سے سخت محنت کے آثار نظر آ رہے تھے۔

ہمارا جہاز چونکہ کافی فاصلے پر کھڑا تھا سو ہم سب بس میں سوار ہوئے اور اپنے جہاز تک پہنچے۔ جہاز میں چڑھنے کے لئے سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ لوگ اپنا سامان کندھوں پر اُٹھائے ہانپتے ہوئے چڑھ رہے تھے۔ ہمارا امتحان ہر جگہ ہوجاتا ہے اب یہاں ایئر ہوسٹس عربی میں بات کر رہی تھیں اس لئے ہم نے بھی بس اپنے سر کو جھکایا اور آگے بڑھ گئے۔ چھوٹا جہاز تھا۔ سامان رکھنے والے کیبن بھی سامان کے لحاظ سے بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ سیٹوں پر بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھی جہاز نے پرواز پکڑی نیچے جھانک کر دیکھا تیل کی دولت کی چمک نظر آئی۔ جہاں تک نظر جاتی روشنیاں ہی روشنیاں تھیں، جہاز سیدھا ہوا کھانے کی ٹرالی آئی، میرے ساتھ ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایئر ہوسٹس نے اُن سے پوچھا:

''آپ کیا کھانا پسند فرمائیں گے چکن یا فش؟''

اُنہیں کچھ سمجھ نہیں آئی۔ ایئر ہوسٹس نے مجھ سے مدد مانگی، مَیں نے اردو میں پوچھا بزرگو..!، مرغی کھاؤ گے یا مچھلی؟ اُنہیں پھر بھی سمجھ نہیں آئی، وہ بزرگ ضلع ہزارہ سے تعلق رکھتے تھے، جب مَیں راولپنڈی میں رہتا تھا تو کچھ نہ کچھ ہزارہ زبان بول لیتا تھا، پھر مَیں نے کہا:

بزرگو،کوکڑ کھاسو یا مچھی کھاسو؟ وہ جھٹ سے بولے کوکڑ کھاساں۔

مَیں نے ائیر ہوسٹس سے کہاان کو،کوکڑ دے دیں۔

راستہ بھران بزرگ سے بات ہوتی رہی۔جن کوکسی ایجنٹ کی مدد سے دوبئ میں کام ملا تھا،اُنہوں نے بتایا کہ ہم سب مزدوروں کوایک بس میں سوار کر کے اُس بلڈنگ میں لے جاتے ہیں جہاں ہمارا کام ہورہا ہوتا ہےاورچھٹی کے بعدگھرچھوڑ دیا جا تا ہے،ہم میں سے اکثر نے دوبئ نہیں دیکھا،ہم سالوں بعدگھر جاتے ہیں کیونکہ ہمیں اجرت بھی بہت کم ملتی ہے عرصہ دراز سے کام کرر ہے ہیں مگر پھربھی پریشانیوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔بزرگ کی باتیں سن کر بہت تکلیف ہوئی کہ ہمارے لوگ کس قدر تکلیفوں سے گزر کراپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں،اللہ تعالیٰ سب کی مددفرمائے۔

دو گھنٹے بہت جلدی گزر گئے۔جہاز نے پاکستان کی حدود کو چھولیا تھا جہاں سے چلے تھے وہاں واپس آ گئے،دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔جہاز سے باہر نکلے دل چاہا زمین کو چوم لیں۔یہ حسرت بھی ہم نے اپنے دل میں ہی رکھی۔لائنوں میں لگ گئے،لمبی لمبی لائنیں اتنی چیکنگ تھی کہ اللہ کی پناہ اتنی تو پہلی بارلندن پہنچنے پر بھی نہیں ہوئی جتنی یہاں ہورہی تھی۔سب پاکستانی پاسپورٹ والے ہی تھےاورغریب لوگ دوبئ سے محنت مزدوری کر کے آ رہے تھے مگراُن سے بھی کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرر ہے تھے۔آخرمیری باری بھی آ گئی شکر ہے جلدی فارغ ہوگیا کیونکہ میرے پاس جرمن پاسپورٹ تھا۔اب ہمارے سامان کو چیک کرنے کی باری تھی،میرے بیگ سے ایک سبز رنگ کی بوتل نکل آئی پوچھنے پر مَیں نے بتایا کے اس میں زیتون کا تیل ہےمگراُس کی تسلی نہ ہوئی اپنے آفیسر کے پاس لیکرگیا۔وہ تجربہ کار تھے دیکھتے ساتھ ہی کہا ٹھیک ہے واپس کردو،ہمیں جانے کی اجازت مل گئی۔

باہر جاتے ہوئے بہت خوش تھے کے سب رشتے دار میرا انتظار کر رہے ہونگے، نکلتے ہی سب گھیر لیں گے۔ باہر نکلے ایک ہجوم تھا لوگوں کا ہر کوئی اپنے رشتے داروں کو لینے آیا ہوا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا پورا شہر ہی اُمڈ کر آ گیا ہے۔ ایک بندے کو لینے پوری پوری بس بھر کر لینے والوں کی تھی۔ مَیں بھی باہر نکل کر کھڑا ہو گیا مَیں اکیلے ایسے کھڑا تھا جیسے ابھی تقریر شروع کرنی ہے، لیکن مَیں اپنے رشتہ داروں کو موقع دے رہا تھا کے وہ مجھے دیکھ لیں، لیکن کوئی بھی آگے نہیں بڑھا اور نا ہی کسی نے مجھے آواز دی، مَیں نے سوچا ہجوم بہت ہے، شاید مَیں نظر نہیں آیا۔ مَیں نے پھر تھوڑے سے اور آگے قدم بڑھائے اور اپنوں کو ڈھونڈنے لگا لیکن کہیں سے بھی کوئی اشارہ نہیں ملا۔ مَیں نے سوچا ضروری نہیں کے وہ مجھے ڈھونڈیں، میں ہی کوشش کرتا ہوں ڈھونڈنے کی اور ایک ایک شخص کو پہچاننے کی کوشش شروع کر دی مردوں میں تو مجھے کوئی نظر نہیں آیا عورتوں نے نقاب پہنے ہوئے تھے، آہستہ آہستہ ہجوم کم ہونا شروع ہو گیا۔ اب مجھے فکر لاحق شروع ہو گئی۔ میرے پاس نہ تو کوئی فون نمبر تھا اور نہ ہی کوئی ایڈریس تھا۔ ہاں ربوہ کے فون نمبر تھے۔

دیکھتے دیکھتے ائیر پورٹ خالی ہو گیا، لگتا ہی نہیں تھا کہ ابھی ابھی یہاں ایک جلسہ گاہ کی صورت نظر آ رہی تھی۔ اب صرف صفائی والے اور کچھ ائیر پورٹ کا عملہ نظر آ رہا تھا یا صرف مَیں ادھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا جس سے یہ لوگ خوب اندازہ کر سکتے تھے کہ مَیں پریشان ہوں۔ کچھ ہی دیر میں ٹیکسی والے میرے اردگرد گِدھوں کی طرح منڈلانے لگے:

''باؤ جی کتھے جانا اے''

مَیں نے جواب دیا کہیں نہیں جانا، اُن کا پھر جواب جب آئے ہو تو کہیں تو جانا ہوگا۔ مَیں نے پھر جواب دیا بھئی مجھے کوئی لینے آ رہا ہے۔ ٹیکسی والے کا فوراً جواب دیا:

''باؤجی اب تک جس نے آنا ہوتا وہ آ گیا ہوتا تم تین گھنٹے سے یہاں کھڑے ہو''

بات تو اُسکی ٹھیک تھی۔ مَیں سات بجے سے باہر کھڑا تھا اور اب گیارہ بج گئے تھے۔ٹیکسی والا پھر بولا، آپ کے پاس کوئی تو ایڈریس ہوگا مَیں چھوڑ آتا ہوں، اب ٹیکسی والوں کو مجھ پر رحم آنے لگا تھا۔اب مَیں بھی ٹیکسی والے کو ہی ہمدرد سمجھنے لگا اور کہا یار میرے پاس کوئی ایڈریس نہیں ہے، وہ پھر بولا کوئی تو فون ہوگا؟ اُس کے کہنے سے مَیں نے اپنی سالی کو ربوہ فون کیا اُس نے جھٹ سے فون اُٹھایا اور اُس نے یہ خوش خبری سنائی کے بھائی آپ کو ائیر پورٹ پر لینے گیا تھا آپ ملے نہیں اور اب تو ''بھائی پھیرو'' واپس چلا گیا ہے۔

''بھائی پھیرو'' لاہور سے تین گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔جنہوں نے مجھے لینے آنا تھا وہ میرے سالے صاحب تھے۔جب مَیں پاکستان سے گیا تھا تو وہ تیرہ (13) سال کے بچے تھے اور اب وہ (26) چھبیس سال کے نوجوان تھے اس لئے مَیں اُن کو نہیں پہچان سکا اور اُنہوں نے مجھے اس لئے نہیں پچانا کے اب مَیں کلین شیو تھا جب کہ لندن جاتے وقت میری بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔سو ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے، اب مَیں کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ائیر پورٹ میں چھوڑ نا نہیں چاہتا تھا کہ یورپ میں پاکستان کے حالات سن سن کر محتاط ہو گیا تھا اور اب ٹیکسی والے بھی اپنے منہ میں ہلکی پھلکی مجھے گالیاں سنا کر چلے گئے۔

اب بارہ بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔اگلی فلائٹ کے لوگ باہر آنا شروع ہو گئے اور اُن کو لینے والوں کا ایک بار ہجوم پھر شروع ہو گیا۔اللہ بے سہاروں کا سہارا بن جاتا ہے۔ہوا یوں کے اس ہجوم میں مجھے ایک شناسا چہرہ نظر آیا اور ایکدم اُنہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا اور بھاگ کر میرے پاس آئے اور کہا بھائی جان آپ یہاں کہاں کھڑے ہیں ہم نے سُنا تو تھا کہ

آپ نے آنا ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کے آپ نے آج آنا تھا۔ یہ صاحب بھی میرے سسرال میں سے ہی تھے، ایکدم بولے آپ کو کوئی لینے نہیں آیا؟ اور میرا یہ حال ہو چکا تھا کے اب مجھے چکر آنے شروع ہو چکے تھے اور بھوک کے مارے بُرا حال تھا۔ ان طارق صاحب کو دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے کسی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جائے۔ اُنہوں نے میرا سامان لیا اور کار میں رکھتے ہوئے بولے ہمارے کسی قریبی عزیز کی والدہ صاحبہ کی میت جرمنی سے آ رہی ہے۔ ہم اُن کو لینے آئے ہیں۔ آپ تھوڑی دیر گاڑی میں ہی انتظار کریں ہم آپ کو آپکی خالہ ساس کے پاس چھوڑ دیں گے۔ میری بیوی کی خالہ لاہور میں ہی رہتی تھیں۔ اب مَیں مروت میں آ گیا اور کہا کوئی بات نہیں مَیں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں اور مَیں اُن کے ساتھ کارگو سینٹر کی طرف چلا گیا۔ اب ان کے ساتھ اور بھی ان کے عزیز آئے ہوئے تھے سب کے ساتھ باری باری تعارف ہوا اور سب کو باری باری کئی بار اپنی کہانی سنانی پڑی۔

کچھ دیر میں میت کا پاسپورٹ چیک کرنے کے بعد میت وُرثا کے حوالے کر دی گئی۔ مَیں نے بھی ثواب کی خاطر اپنا کندھا پیش کر دیا۔ ایمبولنس میں میت ڈال دی گئی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے، مَیں طارق کی گاڑی میں بیٹھ گیا کچھ لوگ اور بھی ساتھ تھے کچھ میت کے ساتھ تھے۔ لاہور میں ایک گھر تھا جہاں سب نے اکٹھے ہونا تھا۔ جب کار اُس گلی میں پہنچی جہاں گھر تھا گھر کے باہر ایک شامیانہ لگا ہوا تھا جہاں پر محلے کے لوگ قریب دور کے تمام رشتے دار میت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم کار میں تھوڑا پہلے پہنچ گئے، جیسے ہی میں کار سے اُترا میرا لباس اور تھکی ہوئی شکل دیکھ کر لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ یہی وہ بندہ ہے جو میت کے ساتھ جرمنی سے آیا ہے۔ بس پھر کیا تھا لوگوں نے گلے مل مل کر مجھے نچوڑ کر رکھ دیا۔ مَیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کے مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ بھائی میرے گلے نہ لگو، مجھ سے اتنا افسوس کیا

گیا کہ اب مَیں خود بھی میت ہی لگنے لگا تھا۔میت بھی گھر پہنچ گئی ۔سارے لوگ اُدھر مصروف ہو گئے۔

میری حالت بد سے بدتر ہوئی جارہی تھی۔آخری کھانا جہاز میں ہی کھایا تھا۔تھکان سے بُرا حال تھا۔افسوس والے گھر سے کھانا کھانے کی بھی بات نہیں کر سکتے تھے۔میت آنے پر سب رشتہ دار لوگ گھر کے اندر چلے گئے۔اب شامیانے میں صرف مَیں ہی رہ گیا اور جو بھی باہر سے افسوس کے لئے اندر آرہا تھا آتے ہی میرے گلے لگ کر افسوس کرتا۔میرا دل چاہتا اب تو مَیں ہی ان کا گلا دبا دوں۔شامیانے میں بیٹھے ہوئے تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے۔شام کے چار بج گئے اور میرے دماغ کے بارہ بج چکے تھے۔

اب میت کو آگے ربوہ لیکر جانا تھا۔میت کو ایمبولنس میں رکھا گیا اور پھر دوبارہ گلے ملنے کی تقریب شروع ہوگئی سب کو لگ رہا تھا یہی میت لایا ہے اور اب بچارہ میت کو ربوہ لیکر جارہا ہے۔مَیں پھر افسوس کرنے والوں کے گھیرے میں آگیا۔جیسے ہی طارق صاحب نے میری طرف دیکھا اُن کو مجھ پر رحم آیا ہوگا جو فوراً کہا چلیں مَیں آپ کو خالہ کے گھر چھوڑ دوں۔مَیں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پھرتی سے چھلانگ لگائی اور کار کے اندر بیٹھ گیا۔جلدی گھر پہنچ گئے خالہ کو میرے آنے کی اطلاع مل چکی تھی۔کھانا تیار تھا،کوئی تکلف نہیں کیا۔کھانے پر ٹوٹ پڑا۔اُنہوں نے سوچا ہوگا شائد یہ جرمنی جا کر بھی بھوکے،کے بھوکے ہی رہے لیکن اس وقت مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی اتنے میں ''بھائی پھیرو'' سے عامر یعنی میرے سالے صاحب بھی آ گئے،دل تو چاہا کے بہت کچھ سناؤں مگر مجبوری کی مسکراہٹ سے ہی کام لیا۔دل میں سوچا یہ سب میرے سسرالی ہیں بس مسکراہٹوں سے ہی کام لو ورنہ یہ نا سوچیں ہم نے کس کو اپنی بیٹی دے دی۔

''بھائی پھیرو'' کا نام عامر کو پسند نہیں تھا اس لئے وہ سب کو بتانے کے لئے ''بھائی پھیرو'' سے جو پہلے گاؤں تھا اُس کا ہی نام بتاتا تھا، جب کہ وہ ''بھائی پھیرو'' میں کسی ٹیکسٹائل فرم میں کام کرتا تھا۔اب ہم اُس کے ساتھ ''بھائی پھیرو'' کے لئے تیار ہو گئے رات ہو گئی تھی۔ایک دو جگہ بس بدل کر جانا تھا۔

ایک جگہ جب ہم نے بس بدلنی تھی تو کافی دیر وہاں رکنا پڑا۔وہاں پھر عامر نے میری دعوت کا سوچا اور ایک ڈھابہ پر ہم چلے گئے۔کھانے کا آرڈر دیا اور کچھ دیر کے بعد کڑاہی سمیت گوشت آ گیا۔خوشبو اور رنگت سے بہت اچھا لگ رہا تھا۔اُوپر ہرا دھنیہ سبز مرچ ادرک اور ٹماٹر کاٹ کر ڈالے ہوئے تھے۔گرما گرم نان کے ساتھ سیون اپ کی بوتلیں بھی ساتھ آ گئیں۔یقین کریں اُس ڈھابے کے کھانے کو میں کبھی بھول نہیں سکا۔وہ کسی بھی فائیو سٹار ہوٹل سے کم نہیں تھا۔آدھی رات کو ہم ''بھائی پھیرو'' پہنچے بس سے اُتر کے گاؤں کی گلیوں میں رات کے وقت کتوں سے بچتے ہوئے گھر پہنچے۔اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اپنی ساس امی اور سسر صاحب کو سلام کیا اور دو دنوں سے شدید تھکا ہوا ایسے سویا کے رات کو کچھ پتا نہیں چلا کہ مچھر کتنے لٹر خون پی گئے ہیں۔ہمارے خون میں کچھ زیادہ ہی مزا تھا۔اُن کا ٹیسٹ چینج ہوا تھا۔پاکستانی خون پی پی کر تنگ پڑے ہوئے تھے۔صبح جب اُٹھے تو چادر میں کئی مچھر مرے ہوئے تھے۔لگتا تھا تسلی سے اپنی سوئی لگا کر اپنی بوتل بھرتے رہے۔وزن کی وجہ سے اُڑا نہیں گیا اور ہمارے نیچے ہی آ کر مرتے گئے۔

ایک دن ہم نے اس گاؤں کی سیر کر کے گزارا۔بہت مزا آیا سرسبز کھیتوں میں لوگ کام کر رہے تھے اور کچھ گاؤں والوں نے ہمیں ولائیتی بابو جی سمجھ کر گنے بھی تحفے میں دیئے۔اگلے دن ربوہ جانے کا پروگرام تھا صبح ہی عامر کو ٹیکسی لانے کا کہا، ٹیکسی کی تلاش شروع ہو گئی

کچھ گھنٹوں کی تلاش کے بعد منہ مانگے دام پر ٹیکسی ملی اور ساتھ یہ بھی کہا گیا کے آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو ''بھائی پھیرو'' سے کوئی ٹیکسی مل گئی۔ جب کہ گاؤں میں دو شادیاں بھی ہیں، ہم نے بھی دل میں شکر کیا اور ٹیکسی والے کا دل سے شکریہ ادا کیا کہ وہ ہمارے کام آیا۔ ٹیکسی میں سامان رکھا دیکھنے میں گاڑی نئی ہی لگ رہی، سیٹوں پر پلاسٹک چڑھا ہوا تھا۔

ہم سب کار میں سوار ہو گئے موسم خوشگوار تھا۔ نہ گرم اور نہ سرد۔ ہم سفر کا مزا لینے لگے ہرے بھرے کھیتوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کار کی رفتار جب ذرا تیز ہوتی یا کہیں سے سڑک خراب ہوتی تو گاڑی کے پیچھے سے زور کی آواز آتی جیسے ہتھوڑے سے لوہے کو مارا جاتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے ڈرائیور کو پوچھا یہ کیا ماجرا ہے۔ اُس نے بتایا کے مَیں نے چوڑے ٹائر لگائے ہوئے ہیں تاکہ خوب صورت لگے اُس کی آواز ہے۔ ہم نے یقین کر لیا کیونکہ ہماری باگ ڈور اُس کے ہاتھ میں تھی۔ آگے جا کر کچھ زیادہ ہی آوازیں آنی شروع ہو گئیں، اُس نے کہا باؤ جی اس کا ٹائر چینج کر کے دیکھتا ہوں۔ ہم نے بھی سہارا دیا۔

ایک موڑ پر درختوں کی چھاؤں میں جگہ اس نے بہت اچھی ڈھونڈی کہ ہمیں اس تکلیف کا احساس نہ ہو۔ دائیں طرف ایک انگریزوں کے زمانے کی بلڈنگ تھی اُس کے آگے گارڈن بنا ہوا تھا جو کہ بہت ہی خوبصورت اور ساتھ ہی اُس کے آگے دریا بہہ رہا تھا جو کہ میرے خیال کے مطابق لاہور کی طرف سے آ رہا تھا۔ شاید راوی دریا تھا۔ بہت ہی اچھی ہوا چل رہی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

ڈرائیور صاحب کی آواز آ گئی اور ہم نے اپنا سامان گاڑی میں رکھا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن گاڑی کی اُس آواز میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اب ڈرائیور نے نئی چیز کا خدشہ ظاہر کیا جس کے بارے میں پہلی دفعہ سنا، کہنے لگا باؤ جی لگتا ہے اس کے

''گوڈے'' خراب ہیں ، مَیں نے کہا انسان کے تو گوڈے ہو تے ہیں یہ کار کے کب سے گوڈے ہو گئے۔ پھر بھی احتیاطاً پوچھ لیا میرے گوڈوں سے کام چل جائے گا، آ گے سے کہنے لگا نہیں جی لو ہے کے چاہئیں اور مَیں آپ کو ربوہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ چند میل کے فاصلے پر ایک قصبہ آ رہا ہے آپ کو دوسری کار لے دیتا ہوں۔

ہمارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا اُس ہی کے رحم کرم پر تھے خاموش ہو گئے، آ گے جا کر جو قصبہ آ رہا تھا اُس کا نام بھی عجیب وغریب تھا(کھونڈا موڑ) یہاں پر چند ٹیکے والے کھڑے تھے جو لوگ بسوں سے اُتر تے تھے یہ اُن مسافروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے گلا پھاڑ پھاڑ کر مختلف گاؤں کا نام لے لے کر اپنی اچھی سروس کا دعویٰ کر رہے تھے۔ ساتھ ہی سر سبز گھاس کھلا کر اپنے گھوڑوں کو تر و تازہ رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چھوٹی موٹی کچھ کھانے پینے کی دوکانیں بھی تھیں۔ ہمارا ڈرئیور نئے ڈرائیور کے ساتھ سودا کر رہا تھا۔ وہ سودا کر کے آیا ہمیں بس خوش خبری دے دی کے بات ہو گئی ہے، مَیں نے کار کا جائزہ لیا کوئی سو سال پرانی کار تھی، ایسے لگتا تھا کے اپنے ہی گاؤں سے پرانی چیزیں اکٹھی کر کے کار بنائی ہوئی ہے۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کیا اس حالت میں آپ ہمیں ہماری منزل تک پہنچا دیں گے۔ وہ ہم پر ہی برس پڑا جیسے میں نے کوئی گالی دے دی ہو کہنے لگا ابھی تو دو تین سال یہ آرام سے نکال دے گی۔ ہمیں بھی اعتبار آ گیا۔ اللہ کو اور اپنے تمام بزگوں کو یاد کر کے اس کار نما سواری میں سوار ہو گئے۔ اس کی ڈگی میں سامان رکھا گیا ڈرائیور اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھا ایک دفعہ شیشے میں دیکھا کہ میں کتنا خوبصورت لگ رہا ہوں۔ تھوڑے ہاتھوں سے بال سیدھے کئے اور پتہ نہیں کیا پڑھا، گاڑی سٹارٹ کی اور فل سپیڈ سے گاڑی کو چلایا پیچھے مٹی کے بادل بنا دئے، ایسے لگتا تھا ڈرائیور نے دوبارہ اس اڈہ پر نہیں آنا، کار برق رفتاری سے بھاگی جا رہی

تھی۔ہم نے بھی شکر کیا کہ پہلی نئی کار کی نسبت یہ پرانی بہتر ہے۔سڑک ناہموار ہونے کی وجہ سے میرا سر بار بار کار کی چھت کے ساتھ لگ لگ کر ہوش اُڑ رہے تھے۔جسم کا ایک ایک حصہّ درد کے مارے چور، چور ہورہا تھا، ڈرائیور مزے سے گنگناتا ہوا جارہا تھا کہ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور کار ایک طرف کولڑھک گئی۔لگتا ہے کے ڈرائیور اس دھماکے کے لئے پہلے سے ہی تیار تھا۔بہت مہارت سے کار کو اُلٹنے سے بچالیا اور بشارت دی کہ ٹائیر پھٹ گیا ہے۔

کار سڑک کے ایک طرف کھڑی کی اور ہم پھر سے ایک دفعہ سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ڈرائیور کہتا باؤجی فکر کی کوئی بات نہیں میرے پاس ڈیگی میں سٹیپنی ہے۔ڈیگی کھولی گئی میرے بیگ جو کہ کالے رنگ کے تھے اُن کا اب رنگ بدل چکا تھا۔ڈیگی کے اندر دو بڑے بڑے سوراخ تھے جو کہ نیچے کی طرف سڑک تک جارہے تھے اُن میں سے سڑک صاف دکھائی دے رہی تھی جو باہر کی ساری مٹی اندر لانے کے لئے کافی تھے۔دوسرا ٹائیر نکالا گیا اور تبدیل کرنا شروع کردیا۔ہمارے قریب سے بسوں والے سائیکل سوار حتیٰ کے بیل گاڑی والے بھی مسکرا کر گزر رہے تھے یعنی کہ آپ سے تو ہماری بیل گاڑی ہی اچھی ہے۔

اور ہم اپنا مذاق بنتے ہوئے خوشی سے دیکھ رہے تھے۔کار کا ٹائیر تبدیل ہوگیا دوبارہ آگے روانگی شروع ہوئی تھوڑی ہی دیر میں دوسرا زبردست دھماکہ ہوا، اب کے بار ہمیں خود ہی سمجھ آ گئی کے اب دوسرا ٹائیر پھٹ گیا ہے۔بہت پریشانی ہوئی کہ اب کیا ہوگا اب تو دوسرا ٹائیر بھی نہیں ہے۔ڈرائیور ہمیں تسلیاں دینے لگا۔ہم تو اُس کی تسلیوں کی وجہ سے ہی یہاں تک پہنچ گئے تھے اور یقین کریں ابھی ہم نے آدھا سفر بھی طے نہیں کیا تھا، اب ہم نے مل کر کار کو دھکا لگایا اور گھسیٹتے ہوئے پاس والے گاؤں تک لیکر گئے۔جہاں پر ایک پنکچر لگانے والی ورکشاپ تھی وہاں سے ایک نیا ٹائیر خریدا ایک کو پنکچر لگوایا اور ہم سامان سمیت ایک بار پھر باہر

کھڑے تھے۔اس کام میں تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔

ہمارے پاس اِن باتوں کے لئے کافی وقت تھا کیونکہ جرمنی سے ہم چھٹی لے کر آئے تھے۔اب ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ٹائیر بھی لگ گئے۔سامان اُٹھا کر پھر سے ڈیگی میں رکھا اور دوبارہ منزل کی طرف روانہ ہوئے۔جب ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کی وائپر چلائے شیشوں پر مٹی اور ہلکی بارش کی وجہ سے مٹی کا ایک لیپ ہوگیا میں نے کہا پانی چلاؤ تاکہ شیشے صاف ہوجائیں، کہنے لگا باؤ جی یہاں پر پانی والا سسٹم اکثر خراب ہوجاتا ہے کیونکہ پانی صاف نہیں ہوتا ہم چپ ہوکر بیٹھ گئے۔ڈرائیور کے سامنے شیشے میں صرف ایک سوراخ تھا جس میں سے وہ باہر دیکھ رہا تھا جیسے دور بین میں سے دیکھ رہے ہوں اور ہمیں ساتھ بیٹھے باہر کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور رات بھی ہوچکی تھی۔

ہم صبح دس بجے کے نکلے ہوئے تھے اور اب شام کے پانچ بج چکے تھے۔سفر مشکل سے ایک سو پچاس کلومیٹر ہوگا۔میرا خیال ہے ہم پیدل چل پڑتے تو کب کے پہنچ گئے ہوتے۔ہم ٹیکسی ڈرائیور کے تجربوں میں مارے گئے یا شاید مجھے پاکستان چھوڑ کر جانے کی سزا مل رہی تھی۔اللہ اللہ کرکے ربوہ کے قریب پہنچے دریا کے پُل سے ربوہ نظر آنا شروع ہوگیا۔تمام سفر کی تھکاوٹ ایکدم سے دور ہوگئی۔ہم گاڑی سے باہر نکلے تو ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے منہ اور کپڑے مٹی سے بھرے ہوئے تھے۔

ربوہ جہاں میرا بچپن گزرا تھا، جس کی یادیں اب میرے دل میں مچل رہی ہیں، وہ ہر طرح کے موسم وہ تپتی گرمیاں جن میں دوپہر میں باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔گرمی اتنی شدید ہوتی تھی کہ بغیر جوتی کے اگر صحن میں چلیں تو پاؤں میں چھالے بن جائیں۔دوپہر کے وقت اکثر لوگ کمرے بند کرکے کھڑکیوں کے پردے گرا کر کمروں کے اندر سو جاتے

تھے اکثر عورتیں صبح ہی صبح ٹوکریاں پکڑے بازار میں سبزی گوشت یا اورضروریات زندگی کی چیزیں لے آتیں تاکہ دوپہر کو نہ نکلنا پڑے۔ اگر کسی کو باہر جانا بھی پڑتا تو سر پر گیلا تولیہ رکھ کر نکلتے۔ باہر مزدور بیٹھنے کے لئے سایہ دار جگہ ڈھونڈتے۔ لو چلتی تو نوجوان منچلے دریائے چناب کے کنارے بیٹھ کر تربوز کھاتے اور دریا میں نہا کر گرمی کی شدت کو دور کرتے۔

ربوہ میں کہیں میٹھا پانی اور کہیں نمکین، کلرزدہ زمین بھی یاد ہے پاؤں زمین پر رکھتے تھے تو پاؤں زمین میں ہی دھنس جاتا تھا، بہر حال یہ ربوہ کے رنگ تھے جنہوں نے مجھے ایک دم اپنی لپیٹ میں لے لیا ، اب ہم بہشتی مقبرہ تک پہنچ چکے تھے، اور اپنی منزل مقصود تک بھی ٹیکسی والے کا شکریہ ادا کیا پھر بھی جیسے تیسے اُس نے ہمیں ہمارے گھر تک پہنچایا تھا۔

اب مَیں آپ کو ربوہ، اسلام آباد کی تمام مصروفیت کو چھوڑ کر واپسی کے واقعات سُناتا ہوں۔

الحمدللہ کچھ دن ربوہ میں گزار کر اسلام آباد اپنی بہنوں کو ملنے چلا گیا بہت اچھا وقت گزرا اب واپسی شروع ہو چکی تھی سو ہم لاہور پہنچ گئے۔ ایک دن لاہور رہ کر واپس اپنے سسرال ''بھائی پھیرو'' ہی جانا تھا کہ میرا پاسپوٹ اور تمام ضروری سامان وہاں ہی تھے۔ لاہور میری خالہ رہتی ہیں، اُن سے ملاقات کرنی بھی ضروری تھی۔ خالہ کے گھر پہنچا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں، تھوڑی باتوں کے بعد خالو مجھے اپنی چھت پر لے گئے جہاں سے پورے لاہور کا نظارہ نظر آتا ہے۔، کچھ فاصلے پر بڑے بڑے جالی کے جنگلے بنے ہوئے تھے ان جنگلوں میں کبوتر رکھے ہوئے ہیں، ساتھ ہی پتنگوں سے سجا ہوا خوبصورت نیلا آسمان بہت بھلا لگ رہا تھا، بہت دیر تک مَیں یہ رنگ برنگی پتنگیں اُڑتی ہوئی دیکھتا رہا، مجھے یاد آ رہا تھا کے ان پتنگوں پر مَیں نے بہت مار بھی کھائی لیکن پتنگ بازی کی محبت میں کبھی کمی نہیں آئی بلکہ شدت ہی آئی۔ یہ

لاہور اور لاہور کی رنگینیاں شاید مجھے اس لئے بھی بہت پسند تھیں کہ میری پیدائش بھی لاہور کی ہی ہے۔ خالہ کی آواز نے چونکا دیا کہ بھئی نیچے بھی آ جائیں...کیا اُوپر ہی وقت گزار دیں گے کھانا تیار ہے۔ اُوپر لاہور کا سحر انگیز نظارہ چھوڑ کر ہم نیچے آ گئے۔

خالہ نے کافی تکلف کیا ہوا تھا گوشت وغیرہ اور کئی مزید ڈشیں تھیں، ساتھ سلاد بھی تھا، چونکہ گرمی زیادہ تھی مَیں نے کوشش کی کہ گوشت نہ کھاؤں۔ سلاد کھایا اور پانی پیا، سلاد اور پانی کا نہ جانے اندر جا کر کیا تبادلہ خیال ہوا کہ مجھے فوڈ پائزن ہو گیا، اور میرے پیٹ سے جو پرانی سے پرانی چیز تھی وہ بھی باہر آ گئی۔ پانی کا گلاس ہاتھ میں ہی رہ گیا اور دوڑیں ٹائلٹ میں ایسے ہی لگا تا جیسے کسی ندی کا روکا ہوا پانی کا بندھ کھل گیا ہو اور مَیں نے آج ہی ''بھائی پھیرو'' بھی جانا تھا کیونکہ میرے پاس اب صرف پانچ دن باقی بچے تھے واپس جرمنی جانے کیلئے اور اب مَیں نے باقی بچے دنوں میں عامر کے ساتھ سیف الملوک دیکھنے جانا تھا۔ مَیں نے سوچا کل تک ٹھیک ہو جاؤں گا لیکن دن بدن حالت خراب ہوتی گئی، چار دن خالہ کے گھر ہی گزر گئے بہت کوشش کر کے بھی مَیں دروازے تک نہیں جا سکتا تھا۔ جسم سے پانی ختم ہو گیا۔ موت کا فرشتہ اِرد گرد گھومتا نظر آنے لگا۔ بہت دعائیں کی اللہ اپنے فضلوں سے کرم کر دے پھر پاکستان کا رُخ نہیں کروں گا۔ پانچ دنوں کے بعد اللہ نے میری دعائیں سُن لیں اور جان بخشی ہو گئی اور ٹائلٹ کا سفر ختم ہوا مگر کمزوری اتنی ہو گئی کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔

اب اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ ہم ''بھائی پھیرو،، چلے جائیں اب میری واپسی میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ مَیں نے فیصلہ کیا کہ اپنا سامان ''بھائی پھیرو'' سے منگوا لوں۔ عامر کو فون کیا کہ آج ہی میرا سامان شام تک لے کر آ جاؤ تا کہ مَیں اگلے دن جرمنی کے لئے روانہ ہو سکوں۔ عامر نے حامی بھر لی کے مَیں لے آؤں گا۔ اب مَیں انتظار میں تھا کہ وہ دو پہر تک میرا سامان

لیکر پہنچ جائے گا۔ میرا پاسپورٹ بھی سامان میں ہی تھا۔ آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا۔ دوپہر کا وقت گزرنے لگا بار بار کھڑکی سے گلی کی نکڑ تک نظر دوڑانے لگا لیکن عامر کا کہیں نام ونشان نہ نظر آئے۔ سوچنے لگا ہوسکتا ابھی اُس کو کوئی بس نہ ملی ہو یا گھر سے دیر میں نکلا ہو، تھوڑی دیر اور انتظار کرلو۔ وقت گزرنے لگا شام ہوگئی بہت فکر شروع ہوگئی کہ کیا بنے گا۔ کل واپسی ہے نہ پاسپورٹ ہے نا سامان ہے اور یہاں سے 'بھائی پھیرو' کا ٹیکسی کا سفر بھی دو گھنٹے کا ہے۔ اب رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ عامر صاحب کا کہیں نام ونشان نظر نہیں آرہا تھا اور مجھے جرمنی جانے کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا، جسم میں بے حد کمزوری ہو چکی تھی مَیں کمزوری سے کانپ رہا تھا۔

مَیں نے فیصلہ کیا کہ ابھی ''بھائی پھرو،، کے لئے روانہ ہوتا ہوں تا اپنا سامان دیکھوں کہاں ہے۔ خالہ کو اپنا پروگرام بتایا، خالو لاہور کے بہت پرانے رہنے والوں میں سے ہیں اور وہ بہت اچھی طرح سے لاہور کے حالات سے واقف تھے، انہوں نے یہی کہا کہ اس وقت سفر کرنا مناسب نہیں اور تمہاری صحت بھی اس قابل نہیں کہ تم سفر پر نکلو۔ لیکن میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، اللہ کا نام لیا اور گھر سے چل پڑے ٹیکسی لی اور اڈے پر پہنچ گئے۔ ''بھائی پھیرو' والی ویگن دیکھنی شروع کی۔ آخری ویگن جا چکی تھی۔ ٹیکسی پر سفر کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا کے مجھے سارے راستے دھکے لگا کر بھائی پھیرو تک نہ پہنچنا پڑے۔ پھر کسی نے بتایا یتیم خانہ چوک چلے جائیں وہاں سے بس مل جائے گی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے پہلے دن کڑھائی گوشت کھا کر مزا لیا تھا۔ ٹیکسی لی اور یتیم خانہ چوک پہنچ گئے وہاں سے ایک چھوٹی سی بس جا رہی تھی۔ بس میں جگہ نہیں تھی بس بھری ہوئی تھی، بس والا کھڑے ہونے کی بھی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ بہت منت سماجت کرنے پر مان گیا۔

میرا قد لمبا ہونے کی وجہ سے میں بس میں پورا نہیں آ رہا تھا۔ سر کے بجائے کمر چھت کو لگ رہی تھی۔ ہم کسی جانور کی طرح نظر آ رہے تھے۔ جیسے جانوروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ شفٹ کرتے ہیں یہی حال ہمارا تھا۔ بس چلی سڑک اتنی خستہ حال تھی کے کبھی جمپ اور کبھی ہائی جمپ، اپنی بیماری بھی بھول گئے۔ مشکلیں اتنی پڑیں کہ مشکل آسان ہوگئی اور پیٹ بھی اپنی جگہ پر آ گیا۔ اگر ہمیں علم ہوتا تو پہلے ہی یہ نسخہ آزما لیتے۔

میرے سامنے ایک موٹا تازہ بھینسا نما انسان بیٹھا ہوا تھا۔ لمبی قمیص، موٹی موٹی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا اس کی ایک دن کی خوراک بیس پچیس لوگوں کے برابر ہوگی۔ شکل سے بھی بدمعاش لگ رہا تھا اور میری طرف گھور گھور کے دیکھ رہا تھا جیسے بھوکا ہے اور مجھے ہی کھانے کی تیاری میں ہے۔ پھر پتہ نہیں اللہ تعالیٰ نے اُس کے دل میں کیا ڈالا مجھے آواز دے کر کہنے لگا کہ میرے پاس بیٹھ جاؤ اس نے دو سیٹوں کے پیسے دے کر جگہ لی ہوئی تھی اور اپنے جسم کے لحاظ سے بکنگ کروائی ہوئی تھی تاکہ آرام سے سفر کر سکے۔ مَیں نے فوراً اُس کی سیٹ کی قیمت ادا کرنے کی کوشش کی لیکن اُس نے میری طرف سختی سے دیکھا لیکن نرمی سے بات سمجھاتے ہوئے کہا کہ کوئی بات نہیں تم آرام سے بیٹھو۔ مَیں جو اُس وقت سے اُس کے لئے دل میں غلط رائے بنائے بیٹھا تھا وہ سب ہوا میں اُڑ گیا اور بہت شرمندہ ہوا کہ ہم کیسے ایک سیکنڈ میں دوسروں کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ مَیں سارے راستہ اُس کا شکریہ ادا کرتا رہا اور وہ مجھے مسکرا کر دیکھتا رہا۔ ''بھائی پھیرو'' اُترتے وقت پھر میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

بس سے نیچے اُترا ہر طرف گھپ اندھیرا ہاتھ کو ہاتھ دِکھائی نہیں دے رہا تھا اور گاؤں کے آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے گھر آئے مہمان کو خوش آمدید کہہ رہے

ہوں۔اب رات کا ایک بج چکا تھا۔مَیں ہر طرح کی آفت سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گیا، کتوں کا ڈر، کسی ڈاکو کا ڈر، میرے پاس ایک مرچوں والا سپرے تھا جو مَیں جرمنی سے ساتھ لے کر گیا تھا۔وہی میرے پاس سب سے بڑا ہتھیار تھا، جیب سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا، جیسے رائفل ہوتی ہے اُس سڑک پر چل پڑا جو گاؤں کے اندر کی طرف جاتی ہے۔دائیں بائیں دوکانیں اور چائے کے کھوکھے جن میں دن کو چند لوگ بیٹھے ہوتے ہیں ہر آنے جانے والے کا جائزہ لے رہے ہوتے ہیں، اب سب دوکاندار اور مزدور چار پائیوں پر پڑے سو رہے تھے۔کچھ دوکانوں میں ہلکے پھلکے بلب جل رہے تھے جن کی روشنی میں چند قدم چلنے کی توفیق ملی۔اُس کے بعد پھر وہی گھپ اندھیرا، شکر ہے اب یہ سڑک ختم ہوگئی تھی، پھر بھی ہم پاؤں پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کے کتوں سے جان بخشی ہوگئی اور ڈاکوؤں کو بھی شائد ہمارے آنے کی اطلاع نہیں تھی، کیونکہ ہم اچانک اُٹھ کر آ گئے تھے۔ بہت مشکل سے اندھیرے میں ٹٹولتے ٹٹولتے گھر کے دروازے پر پہنچے، لوہے کا گیٹ تھا اُسے کھٹ کھٹایا کوئی جواب نہیں آیا اور زور سے کھٹکھٹایا کوئی جواب نہیں اب تیسری بار اور زور سے کھٹکھٹایا کوئی جواب نہیں آیا، اب جو مجھے فکر دامنگیر ہوئی وہ یہ کہ عامر میرا سامان لیکر لاہور نا پہنچ گیا ہو، واپسی کا بھی کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔اب مَیں پاگلوں کی طرح زور زور سے دروازے کو پیٹنے لگا۔آخر اندر سے آواز آئی کون ہے؟، مَیں نے اپنی پوری قوت اور طاقت سے اپنا تعارف کرایا، دروازہ کھلا شکر کیا اندر گئے۔عامر صاحب لمبی تان کر خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی چہرے سے پریشانی نظر آنے لگی جیسے چور پکڑا گیا ہو۔میری اتنی بُری حالت تھی کہ بات کرنے کی بھی طاقت نہیں تھی، کمزوری، سفر، پریشانی، اور آدھی رات کا سفر، اسوقت صرف مجھے بیڈ چاہئے تھا، کہ تھوڑا آرام کرلوں۔ساس صاحبہ نے

جلدی سے سونے کا انتظام کیا اور مَیں فوراً چار پائی پر لیٹ گیا نیند نے جلدی ہی آ پنی آغوش میں لے لیا، صبح تیز روشنی کی وجہ سے آنکھ کھل گئی، اُٹھتے ہی ائیر پورٹ جانے کی فکر لاحق ہوگئی، ساس صاحب نے عامر کو اُٹھانے کی کوشش شروع کر دی لیکن اُن کی نیند ایسی نہیں تھی کے وہ آسانی سے اُٹھ جاتے، ڈانٹ پڑی تو اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ ناشتہ کر کے ٹیکسی لینے چلے گئے اور میں نے سامان پیک کرنا شروع کر دیا، میرے پاس کافی سامان ہو گیا تھا میرا اپنا اتنا نہیں تھا جتنا لوگوں کا اپنے رشتہ داروں کے لئے دیا گیا تھا۔

ایک اور سامان دینے والوں کا قصہ بھی سنا دیتا ہوں۔ ربوہ میں گھر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب آئے اور کہا آج آپ کی دعوت ہمارے گھر ہے مَیں نے بہت کوشش کی کہ اس دعوت کو ٹال دوں مگر وہ صاحب نہ مانے آخر مجھے جانا پڑا۔ میرے لئے وہ سائیکل بھی لیکر آئے اور دوسری پر وہ خود سوار ہو گئے۔ کھانے کے بعد وہ ایک بہت بڑا سا پیکٹ اور دوسرا تھوڑا چھوٹا پیکٹ لا کر میرے آگے رکھ دئے اور کہا یہ جرمنی لے جائیں۔ مَیں نے کہا بزرگو مَیں نے تو اپنا اتنا سامان نہیں خریدا جتنا آپ مجھے اُٹھوا رہے ہیں، میں یہ چھوٹا پیکٹ لے جاتا ہوں، بڑے پیکٹ کی میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ میرے انکار پر بزرگ ناراض ہو گئے کہنے لگے چھوٹا پیکٹ بھی لیکر جانے کی ضرورت نہیں۔ اُن کی ناراضگی ایسی تھی کے واپسی پر سلام دعا کے بعد سائیکل کو لینے لگا تو کہنے لگے سائیکل یہاں ہی رہنے دو اور واپس پیدل ہی جائیں۔ باہر نکل کر اُنکی دعوت اور سائیکل کی پیش کش کا علم ہوا۔ انسان تجربوں سے بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔

واپس ''بھائی پھیرو'' آتا ہوں جہاں عامر ٹیکسی لینے گیا ہوا تھا، میرے پاس بہت سامان تھا جو لوگوں کے پیار اور خلوص سے پُر تھا جس کی جرمنی میں کوئی بھی ضرورت نہیں تھی مگر اب وہ سب مَیں نے اُٹھانا تھا۔ عامر صاحب پھر ایک بار ٹیکسی لانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس دفعہ بھی ٹیکسی کوئی شہکار ہی تھی، یہ ٹیکسی تو نہیں تھی۔ کسی دودھ والے کی پک اپ تھی جس کے پچھلے حصے میں ترپال ڈالی ہوئی تھی اور آگے دو بندوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی ڈرائیور سمیت۔ جب میں نے عامر سے پوچھا تو اُسکا جواب تھا کہ گاؤں میں اور کوئی ٹیکسی نہیں تھی۔

ٹیکسی کی پچھلے حصہ سے شدید گوبر کی بدبو آ رہی تھی۔ گھر سے کپڑا لا کر اُس پر ڈالا گیا۔ اُس پر ہم نے اپنے بیگ رکھے۔ مجھے مشورہ دیا گیا کہ آپ آگے بیٹھ جائیں کہ آندھی بہت چل رہی ہے، پیچھے مٹی آپ پر زیادہ پڑے گی۔ آپ کی حالت خراب ہو جائے گی۔ ہمیں اگلی سیٹ پر بیٹھنے کا حکم صادر ہو گیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ آپ نے ائیر پورٹ جانا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ پر اتنی مٹی پڑ جائے کہ آپ کے پاسپورٹ کے ساتھ آپ کی تصویر میچ نہ ہو سکے سو ہم اگلی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ پچھلی سیٹ پر عامر اور میری ساس صاحبہ اور میرے سسر صاحب بیٹھ گئے۔ مجھے اگلی سیٹ پر بیٹھنے سے کوئی فرق نہیں پڑا کہ فرنٹ کا شیشہ تو تھا ہی نہیں اور نا اس گاڑی کا کوئی دروازہ تھا۔

چلتے چلتے ڈرائیور صاحب نے فیصلہ سُنا دیا کے میری گاڑی ائیر پورٹ نہیں جا سکتی بلکہ شہر کے اندر بھی نہیں جا سکتی، کیونکہ میری گاڑی کو شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ ڈرائیور نے کہا میں آپ کو لاہور شہر شروع ہوتے ہی اُتار دوں گا۔ وہاں سے آپ کو ٹیکسی مل جائے گی جو آپ کو ائیر پورٹ لے جائے گی۔

مجھے فکر لگی ہوئی تھی کے کہیں میری فلائٹ نہ مس ہو جائے، مَیں ایک دن بھی پاکستان میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے عرصے میں میرا پاکستان سے پیار کا بھوت اُتر چکا تھا۔ گھر کی یاد ستا رہی تھی، اور مَیں اب کوئی بھی رِسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ ہم اب لاہور شہر کی سرحد کو چھو چکے تھے اچھی قسم کی ٹیکسیاں بھی نظر آنی شروع ہو گئیں۔ جلدی سے نئی ٹیکسی میں سوار ہوئے اور

ائیر پورٹ پر پہنچ گئے۔ وقت بہت تھوڑا تھا، عامر اور اپنی ساس صاحبہ اور اپنے سسر صاحب کو سلام کیا اور اندر کو بھاگے۔ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔

اس دفعہ جہاز نے اپنے پاؤں جو پاکستان کی سر زمین سے چھوڑے تو شیشے سے باہر دیکھنے کی بھی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ اور پھر الحمد للہ جہاز بلندی پر جا کر سیدھا ہو کر اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو گیا۔

○○

ہر پل امتحان ہے زندگی!

بہت ہی مشکل یہ موضوع ہے۔اس موضوع پر لکھنا کوئی آسان بات نہیں ہے لیکن پھر بھی نہ جانے مَیں نے کیوں اس مشکل کام میں اپنا ہاتھ ڈال لیا ہے۔ یہ بھی ہرگز مطلب نہیں ہے کہ اس موضوع پر جو میں لکھنے لگی ہوں وہ میری ذات سے تعلق رکھتا ہے۔اس کو لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم سب ایک بیوہ کی زندگی کو کتنا سمجھ سکتے ہیں۔اس اُمید پر کہ میرے لکھنے سے شاید کسی کا دل پسیج جائے اور وہ اپنے برتاؤ میں بہتری لے آئے اور کسی کو کوئی خوشی دے سکے۔

زندگی سدا ایک سی نہیں رہتی۔ بہت اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ میری ہنستی مسکراتی زندگی بھی ایک دم بدل کر رہ گئی، پھر کچھ ایسے دلگداز واقعات میرے سامنے آئے جنہوں نے مجھے اپنے اور دوسروں کے درد بانٹنے کا سلیقہ سکھایا۔ جب اپنے گردوپیش پر نظر ڈالی تو کئی خواتین کو چپکے چپکے اپنے زخموں کو سہلاتے ہوئے دیکھا۔ اِن سب تکلیف دہ باتوں میں کہیں نہ کہیں عورت کو ہی عورت پر ظلم کرتے دیکھا۔انجانے میں ہم وہ کچھ کر جاتی ہیں جو کسی صورت بھی قابل قبول یا برداشت نہیں ہوسکتا۔ان سب وجوہات میں مَیں خود بھی شامل ہوں، نہ جانے، نہ چاہتے ہوئے مَیں نے بھی کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔اللہ تعالیٰ مجھے بھی معاف فرمائے۔آمین۔

جب ہم خود کسی تکلیف سے گزریں تو دوسرے کے دکھ درد کا زیادہ احساس ہوتا ہے مَیں یہاں کچھ چشم دید واقعات لکھوں گی یہ کوئی افسانہ یا من گھڑت قصہ نہیں ہے۔

سب سے پہلے ایک ایسی نوجوان بیوہ کے بارے میں لکھوں گی جو بہت جوانی کی عمر میں بیوہ ہوئی اور اُس نے کس جدوجہد سے زندگی گزاری تھی وہ ایک مثال چھوڑ گئی ہے۔

شوہر کی وفات کے بعد اپنے والدین کے گھر آ گئی۔ روایتی طور پر وہی ہوا جو ہر گھر میں ہوتا ہے۔ والدین کی خواہش کہ دوبارہ شادی کرلو، جو وہ کسی صورت میں نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے بل بوتے پر اپنے بچوں کی پرورش کرنا چاہتی تھیں۔ جب بیوہ نے دیکھا کہ مَیں ان سب کی باتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی نہیں دے سکتی تو اُس بے حد خوبصورت جوان بیوہ بیٹی اور بہن نے ان ساری مشکلات سے نکلنے کے لئے ایک ایسا فیصلہ لیا جس پر پوری زندگی عمل کیا۔ یعنی علیحدہ سے گھر لیا اور محنت مزدوری شروع کردی۔ چھوٹی سی دوکان ڈالی، محنت اور عزت سے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور اس قابل کردیا کہ دنیا میں فخر سے سر اُٹھا کر زندگی گزار سکیں۔

ماشاءاللہ، اللہ نے اتنا نوازا کہ کئی گھروں کی یہ بیوہ کفالت کرنے لگیں۔ خاص طور پر اپنے غریب بہن بھائیوں کو ہمیشہ فوقیت دی، جہاں کہیں بھی کوئی یتیم یا بیوہ کا علم ہوا فوراً اُن کا دکھ درد بٹانے پہنچ جاتیں۔ الحمدللہ پوری فیملی میں نمایاں ہو کر جیئے، بچوں نے بہت دنیا کمائی۔ اپنی ماں کو بھی بہت عزت دی۔ وہ ماں دنیا کی خوش نصیب ترین ماں تھی جو بھی بات وہ منہ سے نکالتی پوری ہوتی۔ بے حد نفیس مزاج کی تحمل والی سلیقہ شعار، بردبار خاتون سب کے دکھوں میں شامل ہونے والی تھیں۔

جب بچوں کی شادیاں ہوگئیں اور وہ اپنی اپنی زندگی میں مگن ہو گئے تو آپ تنہائی کا شکار

ہوگئیں، خاموش سی رہنے لگیں۔ اپنے خدا کی رضا میں راضی ہر قسم کے حالات کو برداشت کرتی رہیں اور آہستہ آہستہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کے زندگی سے ناطہ توڑ گئیں۔ ایک سوال چھوڑ گئیں کہ ایک ماں کے کتنے بھی بچے ہوں، وہ سنبھال سکتی ہے، مگر بچے ایک ماں کو بھی کیوں سنبھال نہیں سکتے؟

دوسرا واقعہ

مَیں بس میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک سٹاپ سے بزرگ سی عورت سوار ہوئیں اور میرے پاس ہی آ کر بیٹھ گئیں۔ تھوڑا غور سے دیکھا تو وہ رو رہی تھیں۔ مجھے دکھ ہوا کے نہ جانے کیوں رو رہی ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے وجہ پوچھ لی وہ مزید رونے لگیں۔ مَیں نے اُن کو تسلی دی اور پوچھا آپ بتائیں شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔ بولی نہیں میری کوئی بھی مدد نہیں کرسکتا۔ بولیں مَیں اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتی ہوں، بہو نے ناک میں دم کیا ہوا ہے ،نہاتی ہوں تو پانی باہر کیوں گرا، اگر نہیں نہاتی تو تم سے بدبو آ رہی ہے۔ کچن میں کوئی کام کرنا چاہوں تو کہتی ہے تمہیں کوئی عقل ہی نہیں ہے۔ بچوں کے ساتھ بات تک نہیں کرنے دیتی۔ غرض میں اُس کے رحم کرم پر ہوں جو بھی کرلوں وہی خراب ہو جاتا ہے۔ اب میں تنگ آ کر بس میں بیٹھ گئی ہوں۔ مَیں نے پوچھا اب آپ کہاں جا رہی ہیں؟

کہنے لگیں...! کہیں بھی نہیں جہاں بس رک جائے گی وہاں سے پھر واپس آ جاؤں گی۔ جب سے خاوند فوت ہوا میرا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے میرا تو بس سٹاپ آ گیا تھا۔ مجھے اُترنا ہی تھا مگر مَیں آج تک اُن آنسوؤں کو نہیں بھول سکی۔ اُس کے وہ آنسو میرے اندر ہی گرتے رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اِن محترمہ کا بھی کچھ قصور ہو مگر کیا ایک عورت دوسری بیوہ عورت

کی اتنی دشمن ہوسکتی ہے کے اُس کا اپنے گھر میں رہنا بھی مشکل ہو جائے اور وہ در بدر گھومتی پھرے۔کاش کہ ہم عورتیں دوسری عورت کا دکھ سمجھ سکیں۔افسوس صد افسوس۔

اب سُنئے ایک اور خاتون کی داستان جِسے میں بہت قریب سے جانتی ہوں۔یہ ہر وقت مجھے یہ کہتی ہیں کے میرا بیٹا میرا اتنا خیال رکھتا ہے کہ میں تنگ آ گئی ہوں مَیں اُس کو کہتی ہوں مجھے خود سے بازار جانے دو۔مگر نہیں مانتا کہتا ہے کہ آپ اکیلے نہیں جائیں کہیں گر گرا نہ جائیں۔کھانے پینے کا خیال رکھتا ہے۔رات کا کھانا ہم دونوں اکٹھے کھاتے ہیں۔مجھے عمرہ کروا کر لایا ہے۔سارا وقت میرا ہاتھ تھام کر رکھا کہ کہیں میں بھول کے ادھر اُدھر نہ ہو جاؤں۔غرض ہر لحاظ سے میرا خیال رکھتا ہے۔جب سے اُس کے ابو فوت ہوئے ہیں مجھے ایک منٹ کے لئے بھی اکیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا۔

مَیں نے پوچھا باقی جو آپ کے بچے ہیں وہ آپ کے ساتھ کیسے ہیں۔کہتی ہیں اُن سب کی شادیاں ہو چکی ہیں،اُن کو وقت نہیں ملتا وہ اپنے بیوی بچوں میں بے حد مصروف ہیں۔کہتی ہیں مَیں اس اپنے بیٹے کو کہتی ہوں تم بیالیس سال کے ہو گئے ہو،شادی کر لو مگر نہیں مانتا۔اب مَیں پھر حیران ہوں کیوں شادی نہیں کرتا۔وہ اپنی ماں کی زندگی میں ایک عورت کو اپنی زندگی میں شامل کیوں نہیں کر رہا اُس کو کیا ڈر ہے؟یہ سوال میرے لئے اور ہر عورت کے لئے ہے۔

بہت سارے اسی طرح کے لوگوں کو جانتی ہوں اور دُکھ سے سوچتی ہوں کیوں ہم جو دنیا میں اولاد کو لانے کا سبب بنتی ہیں۔ماں جیسا ہمدرد اور شفقت سے بھر پور لقب پانے والیاں اپنی بیٹی اور بیٹوں کو پروان چڑھانے والیاں کیوں اپنی ہی ہم جنس کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے اپنی اَنا کو مطمئن کرتی ہیں؟اور نہیں جانتیں کے ہم کیا کر رہی ہیں۔

مَیں نے خود بھی پانچ بچوں اور اپنے شوہر کے ساتھ بے حد خوشگوار زندگی گزاری

ہے۔الحمدللہ۔مگر پھر میری زندگی میں بھی ایک ایسا دن آیا کہ مَیں نے خود ہی اپنے شوہر کی اس زندگی سے نجات کے لئے دُعا مانگی جو اللہ تعالیٰ نے قبول بھی فرمالی۔

بیماری کے آخری دنوں میں جب کہ ڈاکٹروں نے بھی کافی حد تک مایوسی کا اظہار کر دیا تھا اور ہمیں ہر طرح کے حالات کے لئے تیار رہنے کا مشورہ بھی دے دیا تھا۔ اِن کو چوبیس گھنٹے خون کی بوتلیں لگی رہتی تھیں۔ ایک دن مَیں جب اِن کے پاس بیٹھی ہوئی تھی آنکھیں کھولیں بہت ہی نقاہت کی حالت میں میرا ہاتھ پکڑا کہنے لگے میری ایک بات مانو گی۔ یہ جو بات مَیں تمہیں کہنے لگا ہوں وہ صرف تم ہی کر سکتی ہو کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا؟ میرے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کہنے والے تھے، کہتے ہیں ہاتھ اُٹھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگو کے اللہ اب میرے پر کرم کر دے اور میری پردہ پوشی فرما دے مَیں تھک گیا ہوں۔ رُک کر بولے بہت اچھی زندگی گزری ہے، پھر آہستہ سے کہتے ہیں اور اب تو بات کرنے کی ہمت بھی نہیں ہے، تم مجھے روک کر کیا کرو گی۔ مجھے اپنے پیار اور زندگی سے آزاد کرو اور میرے لئے دُعا مانگ لو مَیں اب اللہ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔

مَیں اپنی اُس وقت کی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ ایک لمحہ کے لئے میری سانسیں رُک گئیں۔ یہ میری زندگی کا ساتھی اپنی زندگی کی آخری سانسوں میں مجھ سے کیسی دعا کی بھیک مانگ رہا ہے، مَیں سُن ہو گئی۔ اُن کے ہاتھ اُسی کمزوری اور نقاہت کی حالت میں ابھی میرے ہاتھوں میں ہی تھے اور اتنی سے دیر میں مجھ پر غم کی صدیاں بیت گئیں۔ مَیں نے اُن کے وہ کمزور بے جان سے ہاتھ جو میرے ہاتھوں میں تھے آہستہ سے اُن کے سینے پر رکھے، اُنہوں نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

مَیں سجدوں میں گری رہی وہ دُعا مانگتی رہی جو میرے شوہر نے آخری وقت مجھے مانگنے

کے لئے کہا تھا۔ وہ بہت تکلیف میں تھے۔ ہم سب سے دیکھا نہیں جا تا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہماری عاجزیاں قبول فرمائیں اور وہ اللہ کا نیک بندہ اپنے اللہ کے حضور حاضر ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مجھے آج تک کبھی افسوس نہیں ہوا کہ مَیں جو ہمیشہ اُن کی سلامتی اور لمبی عمر کی دعا مانگتی تھی آج اُن کے لئے ایسی دعا کیوں مانگی جو عام حالت میں کبھی انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔

میری آنکھوں میں آنسو تھے، دل غم سے پھٹا جا رہا تھا لیکن نہیں جانتی کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے کہاں سے اتنا صبر دے دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا صبر دیا کہ اُس دن کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اُس ذات پاک نے مجھے حوصلہ دیا۔ بیوگی کا غم کوئی چھوٹا غم نہیں ہوتا مگر پروردگار ساتھ دے تو برداشت کی طاقت مل جاتی ہے۔ مَیں اس غم کے ادراک کے بعد کسی بیوہ کو صرف زبان سے تسلی نہیں دیتی بلکہ دل کے درد سے اُسی کیفیت میں ڈوب کر دعا دیتی ہوں جس سے مَیں گزر چکی ہوں۔

شوہر کی وفات کے بعد خود کو اور سب بچوں کو سنبھالنا ایک مشکل کام تھا۔ بچوں کو میں نے کہا آپ سب اپنی اپنی زندگیوں میں نارمل ہو جائیں۔ میرے پاس صرف میرا چھوٹا بیٹا تھا جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، مَیں نے اپنی عدت اپنے رب کے سہارے اپنے ہی گلے لگ کر اور سجدہ ریز ہو کر گزاری۔ میں سارا وقت محسوس کر سکتی تھی کہ اللہ خود میرے اندر آ گیا ہے۔

مَیں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی بھی مجھے ہمدردی کرے یا بیچاری سمجھ کر رحم کی نظروں سے دیکھے۔ مَیں اس غم کو ہمت اور بہادری سے گزارنا چاہتی تھی۔

ہاں جب شوہر کے پانچ ہفتوں کے بعد میری والدہ اس دُنیا سے رخصت ہوئیں تو میں ٹوٹ گئی۔ ایک زندگی بھر کا ساتھی اور دوسری زندگی دینے والی، دونوں ہستیوں سے میں ایک

دم محروم ہو گئی تھی۔ لیکن صبر کا دامن پھر بھی نہیں چھوڑا، سجدوں میں مزید مزا آنے لگا۔ میری تنہائیوں نے مجھے اتنا کچھ سکھا دیا کہ میں الحمدللہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔

پھر ایک دن میرے ہاتھ میں بی بی قوسی صاحبہ کا لکھا ہو کلام، جو روز نامہ الفضل 20 اگست 2001ء میں چھپا ہوا تھا، آ گیا جس نے مجھے مزید جینے کے ڈھنگ سکھائے۔ کلام کا کچھ حصہ لکھتی ہوں جو آج بھی میرے سامنے رہتا ہے۔ لکھتی ہیں:

اس کی درگہ پہ جا بیٹھو
جتنا چاہو تڑپو، مچلو
اس بن داتا کون ملے گا
جو بھی مانگو، اس سے مانگو
اس کے پیار کی خواہش ہے تو
اپنے دل کے دھبے دھولو
اس کے لئے پر اتنا جانو
آنسو خوب بہانے ہوں گے، دامن خوب بھگونا ہوگا
ہنسو گے ساتھ ہنسے گی دنیا، بیٹھ اکیلے رونا ہوگا

پھر مَیں نے اپنے نفس پر کنٹرول کرنا سیکھا۔ اپنی خواہشات پر کنٹرول کیا۔ اپنی اَنا کو کچل دیا۔ بے جا شکوے شکایات سے پرہیز کیا۔ اپنے بچوں کو اور اُن کی زندگیوں میں وہ کیسے رہنا چاہتے ہیں خود فیصلے کریں۔ اپنی دخل اندازی کو چھوڑا۔ ان سب باتوں کا مجھے بے حد فائدہ ہوا، لوگوں کے اچھے اور سچے مشوروں پر عمل کرنا سیکھا۔ میرے سامنے ان بیواؤں کے گھر کے حالات تھے جہاں بہوؤں سے اختلاف رائے نے زندگی اجیرن کی ہوئی تھی۔

جب میرا شمار بھی ان میں ہوا جن کو شوہر کی وفات کے بعد بیٹوں کے ساتھ رہنا ہوتا ہے تو مَیں نے فیصلہ کیا کہ ان کی زندگی میں دخل نہیں دوں گی تا کہ ایسی نوبت نہ آئے۔

مجھے بہت جلد یہ بات اللہ تعالیٰ نے سمجھا دی کہ ایک عورت جو اپنے خاوند کی زندگی میں حکمران ہوتی ہے۔ اپنے بچوں کی نگران اور اُن کے اچھے بُرے فیصلوں کی راز دار ہوتی ہے۔ اُس کو اپنے خاوند کی ہر طرح سے معاونت اور راہنمائی حاصل ہوتی ہے، مگر اُس کی وفات کے بعد وہ صرف خاوند ہی کی نہیں بلکہ ایک ہمدرد اور Companion سے محروم ہو جاتی ہے جو ہر سرد گرم میں اُس کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ مناسب فیصلہ کرنے اور اسے منوانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر جینا اور ان سارے کاموں کو سرانجام دینا جو پہلے نہیں کئے ہوتے اور نسبتاً زیادہ مشکلات میں گھر کر کرنے پڑتے ہیں۔ اُس عورت کے اعصاب اور مزاج پر بُری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ طبیعت میں چڑ چڑا پن آ جاتا ہے۔ اپنے اندر ہونے والی تبدیلی اور ہر دم بڑھتے ہوئے محرومی کے احساس پر قابو پانے میں وہ تھک ہار جاتی ہے، زندگی کے اس مشکل دور کے احساسات دوسرے نہیں سمجھ سکتے، جس سے گھروں میں بدمزگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں اُس کی زندگی کو اور مشکل بنا دیتی ہیں، جس سے گھروں میں مزید مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں، ایک بہو اور بچے اُس کے اُس مزاج کو نہیں سمجھ سکتے، یہ ایک امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ جب سب کچھ بدل گیا تو پھر ہم خود کو ہی بدل لیں اور دوسروں سے توقعات کو محدود کر لیں۔ بچے ہمارے لئے کچھ بھی کر لیں وہ ہماری دلی کیفیات کو نہیں سمجھ سکتے۔

پھر مجھے لگتا ہے یہاں ہمیں ہی اپنے آپ کو بدلنے کی ضرورت ہے نہ کہ بچوں کو۔ میں یقین اور تجربہ سے کہہ سکتی ہوں اگر ہم اپنی بہوؤں کو پورے اختیارات دے دیں اور دخل اندازی کم کر دیں اور اُن کو پورا موقعہ دیں اور پیار محبت کی زبان کو آزمائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ

کچھ نہ کچھ مشکلات کم نہ ہوں اور اگر اس میں آپ کے بیٹے سمجھدار ہیں وہ بہت خوبصورتی سے ایک پُل کا کردار نبھا سکتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے، بہو پر کہیں لازم نہیں ہے کے وہ ہماری خدمت کرے۔ وہ پابند نہیں ہے کہ وہ ہماری خواہشات پوری کرے۔ وہ دوسرے گھر سے آئی ہوئی بچیاں ہیں جو ہمارے مزاج کو فوری نہیں سمجھ سکتیں۔ ان سب باتوں کو سمجھنے کے لئے اُن کو وقت درکار ہوتا ہے۔ دوسرے گھر سے آئی ہوئی بچی کو عزت دیں گے تو انشاءاللہ ضرور عزت پائیں گے۔

مَیں تین بہوؤں کی بیوہ ساس ہوں۔ الحمدللہ، میری بہوئیں میری بہت عزت اور پیار کرتی ہیں لیکن مَیں اِس بہو کی احسان مند ہوں جس کے ساتھ مجھے تیرہ (13) سال ہو گئے ہیں رہتے ہوئے، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُونچ نیچ بہت آئے ہیں لیکن میرے بیٹے اور بہو نے ہمیشہ سمجھداری سے کام لیا۔ میری بہو کے والدین ہمیشہ اپنی بیٹی کو یہ نصیحت کرتے ہیں کے اپنی ساس کے آنکھ میں کبھی آنسو نہ آنے دینا۔

دل سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب بہنوں کے زندگی کے ساتھیوں کو صحت مند لمبی زندگی عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم سب عورتیں ایک دوسرے کی عزت کرنے والی ہوں اور قدر کرنے والی ہوں۔ دُکھ سکھ میں ایک دوسرے کے کام آنے والی بنیں۔ ان باتوں سے ہمارے بیٹوں کو بھی سکون ملتا ہے اور گھروں میں اچھی اور صحت مند اولاد پروان چڑھتی ہے۔

آخر میں پھر بی بی قوسی صاحبہ کا ہی کلام لکھتی ہوں کہتی ہیں:

نفس پہ قابو رکھنا ہوگا، دل کو بھی سمجھانا ہوگا
اپنے روگ چھپانے ہوں گے، دوجوں کو بہلانا ہوگا

کتنے دکھیارے لوگوں کے، زخموں کو سہلانا ہوگا

سب کا درد بٹانا ہوگا

اچھی فصلیں چاہتے ہو تو، اچھے بیج ہی بونا ہوگا

ہنسوگے ساتھ ہنسے گی دنیا، بیٹھ اکیلے رونا ہوگا

یہ بھی حقیقت ہے کہ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ انسانی جسم بے حد کمزور ہوتا جاتا ہے۔ دُعا کرتی ہوں اور دُعا کی درخواست کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بڑھاپے کی بیماریوں اور کمزوریوں سے بچائے اور اللہ اُس وقت تک مجھے زندہ رکھے جب تک اللہ کے علم میں زندگی میرے لئے بہتر ہے اور اُس وقت وفات دے جب اللہ کے علم میں میری موت بہتر ہو۔ پھر وہ مجھے اپنی رحمتوں اور برکتوں کی چادر میں لپیٹ لے۔ آمین۔

دل کی گہرائیوں سے دعا کرتی ہوں جو بھی میرے لئے دعا کرتے ہیں جو میرے دُکھوں میں اور میری خوشیوں میں ساتھ دیتے ہیں۔ اپنی ساری اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ ہمیشہ اِن سب کو دین کی راہوں پر چلائے اور ہمیشہ اللہ اِن کو اس حالت میں زندہ رکھے کہ اپنے سے زیادہ دکھی دنیا کے کام آنے والے بنیں۔ دین اور دکھی دنیا کی خدمت کرنے والے ہوں۔ دُنیا میں خوشیاں اور مسکراہٹیں بانٹنے والے بنیں۔ آمین۔ ثم آمین۔

(احمدیہ گزٹ۔ امریکہ اور النور۔ مارچ۔ اپریل 2017)

○○

میرے بچپن کا ایک یادگار واقعہ

نماز و قرآن کریم پڑھنے کے بعد ابھی مَیں اپنے بستر میں ہی آرام کر رہی تھی کہ میرا بیٹا عکاشہ میرے کمرے میں آیا اور ایک پارسل میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہنے لگا کہ امی باہر کوئی صاحب آئے تھے اُنہوں نے یہ پارسل آپ کے لئے دیا ہے اور وہ کہہ رہے تھے کے آپ کی اُمی جان جائیں گی کہ کس نے بھجوایا ہے۔

مَیں بہت حیران ہوئی صبح ہی صبح یہ کون مہربان ہیں؟ خیر پارسل کو ہاتھ میں پکڑے دیکھ رہی تھی اور سوچ بھی رہی تھی کے کہاں سے ہو سکتا ہے۔ باہر نام ''سیدہ مجید'' لکھا ہوا تھا۔ تمام سیدہ میرے ذہن میں گھوم گئیں ۔ پارسل کھولا اندر بہت خوبصورت شال کے تحفہ کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ جلدی جلدی سرسری سی نظر ڈال کر پہچاننے کی کوشش کی اور پھر جان گئی کے یہ کون مہربان ہیں۔ بہت ہی مدت کے بعد رابطہ ہوا۔

اُنہوں نے اس خط میں مجھے ایک بہت ہی پرانے واقعہ کی طرف توجہ دلائی۔ اُنہوں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد لکھا:

''صفیہ..! شاید آپ کو یاد ہو گا ایک جلسہ پر مَیں نے آصفہ کا آپ سے

تعارف کروایا تھا کہ اُسکی امی کے حوالہ کے ساتھ واقعہ کا بھی ذکر کیا تھا تو آپ نے اپنے میاں کا نام بھی بتایا تھا جو مجھے یاد تھا۔ آپ کے نام کے حوالے سے اخبار الفضل میں گاہے بگاہے مضمون آتے تھے جسے پڑھ کر سب کو بتاتی تھی کہ یہ وہ صفیہ ہے جو امتہ الحکیم کی سہیلی تھی۔ اخبار بھی شاید سنبھال کر رکھے ہوں۔ اب 28 نومبر 2015 روزنامہ الفضل میں اخبار میں ''میری پونجی'' پر لکھا ہوا تبصرہ مَیں نے پڑھا۔ مجھے بے حد اشتیاق ہوا کہ یہ کتاب حاصل کروں۔ مَیں نے کتاب کے لئے کوشش شروع کر دی حالات کی وجہ سے ربوہ کے بازار سے کتابیں ملنی بند ہو چکی ہیں۔ محترمہ عاصمہ بخاری صاحبہ ایک عہدیدار بڑے جوش جذبہ والی ہیں اور ان کا تقریباً روزانہ ہی ربوہ جانا ہوتا ہے۔ اُن کی ذمہ داری لگائی کہ یہ کتاب جہاں سے بھی ہوسکتا ہو آپ نے یہ کتاب مجھے لا کر دینی ہے؟

مَیں نے کتاب کی تلاش شروع کر دی۔ ہماری ایک مہربان لجنہ ممبر نے میری مدد کی اور ''میری پونجی'' کتاب پرنٹ کر کے اُس کی جلد بنوا کر مجھے دی۔ اُس مہربان نے اس اتنے بڑے کام کا مجھ سے کوئی معاوضہ نہیں لیا لیکن مجھے بے بہا خوشی دے دی، مَیں نے اُن کے لئے بہت دعائیں بھی کیں۔''

پھر آپ لکھتی ہیں:

''فیصل آباد کے حالات واقعات بیان کرتے ہوئے آپ قبولیت دعا کا واقعہ شاید بھول گئی ہیں، جو مسلم گرلز ہائی سکول میں پیش آیا تھا۔''

اب وہ واقعہ جیسے مجھے یاد ہے لکھتی ہوں۔ یہ سب یادیں تو بہت ہی دھندلی دھندلی سی ہیں، ہوسکتا ہے کچھ تھوڑا بہت آگے یا پیچھے ہو جائے جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ کوشش

کرتی ہوں کہ کچھ نہ کچھ ان یادوں کو جوڑ سکوں۔

ہمارا گھر فیصل آباد میں احمدیہ مسجد کے بالکل سامنے تھا۔ مسجد میں ہر وقت آنا جانا ہوتا تھا میری عمر اُس وقت تقریباً دس یا گیارہ سال ہوگی دوسری یا تیسری جماعت کی بات ہے۔ نئے پڑھنے والوں کے لئے مختصراً لکھ دیتی ہوں میری پرورش میری غیر احمدی تائی اماں کی گود میں ہوئی تھی جس کی کوئی اولاد نہیں تھی اُن کے افریقہ جانے کے بعد میں اپنی اُمی ابا جان کے پاس آ گئی جہاں ہر وقت احمدیت کی ہی بات ہوتی تھی۔ ان تمام باتوں کا ذکر ''میری پونجی'' میں لکھ چکی ہوں۔

احمدیہ مسجد ہمارے گھر کے سامنے تھی اور احمدیت اور تبلیغ کی باتیں ہمارے گھر میں ہوتی تھیں جو مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ایک دن مسجد سے پمفلٹ اُٹھائے اور سکول لے گئی۔ امتہ الحکیم میری سہیلی بہت سمجھدار تھی۔ جب اُس نے وہ پمفلٹ میرے ہاتھ میں دیکھے تو اُس نے کہا صفیہ یہ تم نے کیا کیا؟ اگر ہماری اُستانی تاج نے جو کہ دینیات کی استانی تھی دیکھ لئے تو قیامت آ جائے گی۔ مَیں تو نئی نئی احمدیت میں آئی تھی ہوش سے زیادہ جوش ہی تھا۔ جلدی سے اُٹھی اور سیدھے استانی تاج کے ہاتھ میں وہ پمفلٹ تھما دئے، پھر واقعی قیامت آ گئی۔ میری سہیلی میرے ساتھ ہی تھی، استانی جی نے پمفلٹ ایک ہاتھ میں لئے دوسرے ہاتھ سے سیدھا تھپڑ میرے منہ پر اتنے زور سے مارا کہ میں گِر گئی۔ مجھے میری سہیلی نے سنبھالا اور کہا کہ صفیہ اب پھر مت لے کر آنا۔

مَیں نے اُس کی بات نہ مانی۔ اگلے دن مسجد سے بہت سارے پمفلٹ اُٹھائے سکول جا کر بانٹ دئے۔ میری کلاس میں اور بھی احمدی بچیاں تھیں۔ میرے علاوہ سب انجام جانتی تھیں ہاتھ اُٹھائے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ میری سہیلی میرے ساتھ مجھے سمجھاتی بھی رہی اور

ساتھ بھی دیا۔ جب استانی تاج کو یہ علم ہوا کہ آج پھر غلطی کو دہرایا گیا ہے وہ تو آگ بگولا ہو گئی۔ ہم دونوں کو پکڑ کر لے گئی ۔ اب جو باقی احمدی لڑکیاں تھیں وہ ڈر کے مارے ہاتھ اُٹھائے دعائیں مانگنے لگیں ۔ہمیں استانی تاج نے ہیڈ مسٹرس کے آفس کے سامنے سزا کے طور پر دھوپ میں بینچ پر کھڑا کر دیا۔ باقی جو بچے دعا کر رہے تھے اللہ نے اُن کی دعائیں لی اور بلا ٹل گئی۔

ہوا یوں کہ جب ہیڈ مسٹرس صاحبہ نے ہمیں دھوپ میں سزا کاٹتے دیکھا تو استانی تاج سے وجہ پوچھی ہوگی جو اُنہوں نے بتائی ہوگی۔ ہمیں علم نہیں مگر تھوڑی دیر کے بعد ہیڈ مسٹرس صاحبہ نے استانی تاج کو ڈانٹا کہ کیوں بچوں کو پریشان کرتی ہو، ہوسکتا ہے ہمیں بھی کچھ کہا گیا ہو۔

میرا خیال ہے مَیں نے بھی اپنی کہانی گھر آکر اپنی امی ابا جان کو سنائی ہوگی، جو اُس کے بعد کوئی ایسا موقعہ سکول سے ڈانٹ کھانے کا نہیں آیا۔

تھوڑا سا یہ بھی یاد آتا ہے ہم سب احمدی بچیاں دوپہر کو جب کھانے کا وقت ہوتا تھا تو ہم سب مل کر کھانا کھایا کرتے تھے۔

ایک دو سال کے بعد میری تائی اماں افریقہ سے واپس آ گئیں اور مجھے ساتھ لے گئیں۔ میری تعلیم کا سلسلہ پھر ختم ہو گیا مَیں اپنی اماں کے ساتھ لاہور چلی گئی، اس طرح میں دوبارہ اپنی دوستوں کو نہیں مل سکی۔ کافی عرصہ بعد جب مَیں تقریباً پندرہ سال کی ہونگی، واپس اپنی امی جان کے پاس ربوہ آ گئی دوبارہ سکول شروع کیا۔ پھر چند سالوں کے بعد ایک جلسہ سالانہ کی ڈیوٹی دیتے ہوئے میری پیاری سہیلی امتہ الحکیم سے ملاقات ہوئی جب کہ وہ بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ مَیں زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہی ہوں اس لئے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ لیکن

اب اُس کے بچوں سے رابطہ رہتا ہے۔

محترمہ امتہ الحکیم صاحبہ کی وفات دسمبر 1983 میں ہوئی۔آپ محترم شیخ رحمت اللہ صاحب مرحوم کی بیٹی، محترم شیخ طاہر احمد صاحب مرحوم کی اہلیہ اور محترم مکرم شیخ محمد احمد مظہر صاحب مرحوم ایڈووکیٹ فیصل آباد کی بہو تھیں۔اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے اور آپ کی ساری اولاد کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔آمین۔

کچھ لوگوں سے مختصر سی ملاقات ساری زندگی کے لئے اپنے نقش چھوڑ جاتی ہے۔الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ مجھ پر کرم کیا، بہت نیک اور با اخلاق لوگ مجھے ملے اور کچھ نہ کچھ میری زندگی بناتے گئے۔

آخر میں پھر ایک بار سیدہ مجید صاحبہ کا شکریہ ادا کرتی چلوں جنہوں نے اتنی محنت سے ''میری پونجی'' کو حاصل کیا۔یہ میرے لئے عین سعادت ہے۔پھر میری پیاری دوست کو میری زندگی میں دوبارہ زندہ کر دیا۔جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

○○

میرے کھٹے میٹھے سفر

مجھے لندن میں رہتے ہوئے تقریباً45 سال ہو گئے ہیں!

29 جولائی 2017ء۔ ائیر کینیڈا کی فلائیٹ میں آج پھر میرے دائیں بائیں سیٹوں پر اجنبی لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ مَیں نے سفر کی کہانی لکھنے کا سوچا اور موبائل پر ہی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ آٹھ گھنٹے آرام سے گزر گئے۔ ویسے بھی سفر میں سونا اور کھانا میرا بہت کم ہوتا ہے۔

سفر تو میں نے اپنی زندگی میں بہت کئے ہیں۔ چار پانچ کے علاوہ سب سفر میں نے اکیلے ہی کئے ہیں۔ اُن میں سے کچھ سفروں کی کہانی آپ سب کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔

پاکستان سے ہجرت کے بارہ سال بعد پہلی بار سامی صاحب (مرحوم) اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ جن کی عمریں سات اور پانچ سال تھیں ربوہ کے جلسہ سالانہ 1983ء پر گئے تھے۔ یہ سفر ہم نے Egypt Airline کے ذریعہ کیا۔ جاتے ہوئے اور واپسی پر بھی ہم نے مصر میں بارہ گھنٹے رُکنا تھا۔ اُس دوران اُنہوں نے ہمیں اہرام مصر اور وہاں کی تمام مشہور جگہوں کی سیر کروائی جہاں پر عطر بنایا جاتا ہے۔ وہ جگہ بھی دکھائی اور چھوٹے چھوٹے گفٹ بھی

دئے۔ واپسی پر جب لندن پہنچے تو ہمارا وہ اٹیچی گم ہو گیا جس میں سب نئے کپڑے تھے۔ بہت افسوس تھا اور فکر بھی کہ کیا غریبوں نے کچھ بنا ہی لیا تھا وہ بھی گم گیا۔ بہت دُعائیں کیں۔ الحمدللہ ایک ماہ کے بعد اٹیچی صحیح سلامت سب سامان کے ساتھ گھر پہنچ گیا۔

1987ء۔میرا اور میری بیٹی لبنیٰ کا پروگرام ناروے اور سویڈن جانے کا بنا۔ہم سیدھے ناروے گئے۔وہاں چودھری رشید صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں۔اُن کے ساتھ ہمارا بہن بھائیوں والا رشتہ ہے۔اُنہوں نے ہمیں ناروے کی خوب سیر کروائی۔ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں رہنے کے لئے وہ ہٹ (Hut) ملا جس میں ہمارے پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ قیام فرماتے تھے۔ناروے کے گلیشیر،خوبصورت آبشاریں اور میٹھے پانی کی بہتی ہوئی ندیاں دیکھیں۔یہاں کی سیروں کے بعد سویڈن کا سفر ہم نے ٹرین سے کیا۔کچھ دن وہاں قیام کیا،رشتہ داروں کو ملنے کے بعد ہماری واپسی ہوئی۔

1988ء۔دوسرا سفر میں نے سامی صاحب (مرحوم) اور دونوں بچوں کے ساتھ جرمنی کا کیا جہاں سامی صاحب کے بھتیجے کی شادی تھی۔یہ اُس وقت کی بات ہے جب یوروٹنل نہیں تھا۔یہ سفر ہم نے ٹرین اور فیری سے کیا۔ہم نے اپنی زندگی میں پہلی بار سمندر کا سفر کیا تھا۔

1988ء۔میں ہی مَیں اپنے دونوں بیٹوں منیر اور بلال کو پہلی بار پاکستان دکھانے کے لئے لے کر گئی تھی۔ہم سیدھے کراچی گئے۔وہاں سامی صاحب کے بھائی کی فیملی رہتی تھی۔ان سب کو پہلی بار ملنا تھا۔بچوں نے بہت مزے کئے۔سمندر دیکھا،اُونٹوں پر بیٹھے،کراچی کی بھرپور سیر کی اور اسلام آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔وہاں میری بہن بشریٰ اپنی فیملی کے ساتھ رہتی تھی۔اُس نے ہمیں مری کی سیر کے لئے ایک دن کی ٹیکسی بُک کروادی۔وہاں کے حالات وہ جانتی تھی۔اس لیئے ٹیکسی والے کی لائسنس کی کاپی اور مزید معلومات اپنے پاس رکھ لیں۔

میرے بیٹوں کی عمریں اُس وقت اٹھارہ اور بیس کے درمیان تھیں۔ دونوں نے پہلی بار پاکستان دیکھا تھا اس لئے اُن کو ہر چیز ہی انوکھی لگتی تھی۔ مری کی ہم نے خوب سیر کی گھڑسواری کا مزا لیا، ائیر لفٹ اور وہاں کی تمام مشہور جگہیں دیکھیں۔ چونکہ ہم مری کے بارے میں اتنا نہیں جانتے تھے لیکن ٹیکسی والے نے ہمیں ہر وہ جگہ دکھائی جو وہاں پر دیکھنے والی تھی۔ سیر کے بعد شام کو ہم واپس اسلام آباد گھر پہنچ گئے۔ اسلام آباد اور پنڈی کی سیر کے بعد ہم نے لاہور کا رُخ کیا، وہاں بھی میری بہن رہتی ہے۔ دو ہفتے لاہور میں رہ کر بچوں نے خوب سیر کر کے دن گزارے، اور الحمدللہ ہم خوشی خوشی واپس گھر لوٹے۔

1991ء۔ میری بڑی بہن آپا سعیدہ شمیم کی بیٹی خولہ کی شادی طے پائی تو اُس نے مجھے کہا کہ صفیہ تم نے میری بیٹی کی شادی میں ضرور شامل ہونا ہے۔ میری اپنی بیٹی لبنیٰ کی شادی تو ہو چکی تھی۔ اب باری میرے بیٹے منیر کی تھی اور یہ خواہش بھی تھی کے بچوں کی شادیاں پاکستان میں ہی کی جائیں۔ سو فیصلہ ہوا کہ مَیں شادی میں بھی شامل ہو جاؤں اور بیٹے کی شادی کے لیئے کوئی رشتہ بھی دیکھ لیا جائے۔ مَیں نے اپنی بہنوں کو اطلاع کر دی اور ساتھ اپنی خواہش کا بھی اظہار کر دیا کہ کوئی مناسب رشتہ تلاش کریں۔

میری بہنوں نے ہمیشہ میری بہت مدد کی خاص طور پر میری بہن عزیز نے کہ میرا ہمیشہ ٹھکانا لاہور اُس کے گھر ہی رہا۔ اُس نے میرے پانچوں بچوں کی شادیوں میں میری بہت مدد کی ہے۔ جزاکم اللہ احسن الجزاء۔

مَیں سیدھی پنڈی اپنی بڑی بہن سعیدہ کے گھر پہنچی جہاں شادی کی گہما گہمی تھی۔ شادی کے بعد میں اسلام آباد چھوٹی بہن بشریٰ کے پاس چلی گئی۔ اُس نے ایک دو رشتوں کی بات کی ہوئی تھی۔ میرا بیٹا بھی لندن سے دو ہفتوں کے لیئے آ گیا۔ میری بہن نے لڑکی والوں سے

بات چیت کر کے وقت مقرر کر لیا اور ہم اپنے بیٹے کے ساتھ لڑکی والوں کے گھر چلے گئے۔ پہلے ہی گھر گئے تو لڑکی والے ہمیں اور ہم ان کو پسند آ گئے۔ پہلی ہی نظر میں ہمیں لڑکی بھی پسند آ گئی اور ہمارے بیٹے سے بھی وہ بہت خوش ہوئے۔ اسطرح طے پایا کے اگلے دن وہ ہمارے گھر آئیں گے پھر باقی بات چیت طے پائے گی۔ ہم خوش خوش گھر آ گئے۔ ہمارے گھر سارا دن اس ہی موضوع پر بات ہوتی رہی۔

شام کے آخری پہر میری بہن بشریٰ (مرحومہ) کے نیچے والے فلیٹ سے ایک بچی آئی اور کہا کہ آپ کے گھر لندن سے جو مہمان لڑکا آیا ہوا ہے اُس کے لئے فون ہے پلیز وہ آ کر سُن لیں۔ ہم پہلے تو یہ ڈرے کہ اللہ کرے خیر ہو، شاید لندن سے فون آیا ہے۔ پھر یہ فکر کہ گھر فون کیوں نہیں کیا؟ نیچے والے گھر کیوں کیا بہر حال جب تک میرا بیٹا فون سُن کر نہیں آیا ہزاروں خیال آتے رہے۔ جب وہ مسکراتا ہوا آیا تو ہمیں لگا گھر سے کوئی خوشی کی خبر آئی ہے۔ وہ مسکرایا اور کہا کہ اُس لڑکی کا فون تھا جس کے آپ ہزاروں گن گا رہے ہیں۔ اُس نے التجا کی ہے کہ میں اس رشتہ سے انکار کر دوں اور کسی کو خبر بھی نہ ہو کیونکہ مَیں کسی اور سے شادی کرنا چاہتی ہوں ۔لیکن یہ بھی ضروری ہے میرے گھر والوں کو علم نہ ہو کہ میں نے آپ کو فون کیا ہے۔ ایک سیکنڈ میں ہمارے سب پروگرام بدل گئے۔ ہم نے اُس بچی کی خواہش کے مطابق اُس کے گھر والوں سے معذرت کر لی لیکن کسی طرح اُس کے والدین کو بھی علم ہو گیا اور وہ ہم سے معذرت کرنے بھی آئے اور پھر اسلام آباد سے ہماری لاہور کی روانگی شروع ہو گئی۔

لاہور میں بھی میری بہن عزیز نے کچھ رشتوں کی معلومات لی ہوئی تھیں۔ پھر ہم ایک بچی کو دیکھنے اُس کے گھر گئے۔ یہ بھی ہمیں پہلی ہی نظر میں پسند آ گئی۔ میرا بیٹا بھی اُن کو اچھا لگا۔ وہ لڑکی اپنے عزیزوں کے ساتھ لاہور میں رہتی تھی۔ والدہ سیالکوٹ میں تھیں اور والد کی

وفات ہو چکی تھی۔ میرا بیٹا پندرہ بیس دن کی چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ میری واپسی اُس کے ساتھ ہی تھی لیکن اب مجھے سیالکوٹ میں بچی کی والدہ کو ملنا تھا اس لئے میں نے اپنی بکنگ آگے کروالی اور میرا بیٹا واپس چلا گیا۔

ایک دو دن کے بعد میرے کزن بھائی جان فاروق، اُن کی بہن باجی بی بی (مرحومہ) اور میری چھوٹی بہن عزیز لاہور سے سیالکوٹ کے لیئے تیار ہو گئے۔ سیالکوٹ میں اُس وقت میرے ماموں اور ممانی جان (مرحومین) بھی اپنے بیٹے کرنل نسیم سیفی صاحب مرحوم کے ساتھ رہائش پزیر تھے، اُن کو بھی ملنے کی خواہش تھی۔ ہم سب خوشی خوشی سیالکوٹ گئے۔ ماموں جان اور ممانی کو ملے۔ اُس بچی کی والدہ سے بہت اچھی ملاقات ہوئی، واپس ماموں اور ممانی جان کے گھر آئے اور رات اُن کے ہاں بسر کی۔ اگلے دن صبح ہی ہماری واپسی تھی۔ بہت خوبصورت موسم تھا۔ ہلکی ہلکی پھوار تھی۔ اگلی سیٹ پر بھائی جان کے ساتھ باجی بی بی، پچھلی سیٹوں پر ہم دونوں بہنیں پاؤں اُوپر کر کے خوش گپیوں میں مشغول، سفر پر چل پڑے۔ سیٹ بیلٹ کا تو کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ ہم سب گزرے ہوئے کل کی باتیں اور تبصرے کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ابھی ہم گوجرانوالہ سے کچھ دور ہی تھے کہ بکریوں کے ریوڑ دکھائی دئے اور ساتھ بھائی جان فاروق کی بلند ہوتی ہوئی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ ہماری کار گھومتی ہوئی ایک کھڈ میں گِر چکی تھی۔ کار ڈرائیور والی سیٹ کی طرف لڑھک گئی تھی اور مَیں اُسی طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر کے لیئے ہمیں کچھ سمجھ نہیں آئی کہ ہوا کیا ہے۔ میرے سر اور گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا۔ باجی بی بی اور عزیز کو اندرونی گہری چوٹیں لگیں۔ بھائی جان کی سمجھ نہیں آئی دیکھا تو وہ کار سے باہر کھڑے ہمیں نکالنے کی جدو جہد کر رہے تھے اور اُن کے ساتھ وہاں کے مزدور بھی ہمیں کار سے باہر نکالنے میں مدد کر رہے تھے۔

ہمیں تباہ شدہ کار سے باہر نکال کر ایک بہت ہی ٹوٹے ہوئے کچے کمرہ میں لے گئے۔ بچارے بھائی جان کو ہماری بھی فکر تھی اور واپس گھر جانے کے لئے کسی سواری کے بندوبست کرنے کی بھی فکر تھی۔ وہ ہمیں اللہ کے سہارے اُن مزدوروں کے جھونپڑے میں چھوڑ کر گجرانوالہ سے کوئی سواری لینے چلے گئے۔ اب ہم اُس وقت کے لحاظ سے اس کمرہ میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اُنہی مزدوروں کی رضائی اوڑھ کر بیٹھ گئیں اور اُنہیں کے مٹی کے پیالوں اور گلاسوں سے ہم نے Ibuprofen کھائی۔ مَیں جب بھی سفر میں ہوتی ہوں تو تھوڑی بہت اس قسم کی دوائیاں میرے پرس میں ہوتی ہیں۔

بھائی جان جب واپسی کیلئے سواری کا بندوبست کرنے جا رہے تھے تو جاتے ہوئے ہمیں ہوشیار رہنے کیلئے سمجھا کر گئے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے پاسپورٹ اور جہاز کی ٹکٹ کی تھی کیونکہ میری اگلے دن کی فلائٹ تھی اس لئے یہ چیزیں میں نے حفاظت کے ساتھ اپنے پرس میں رکھ لی تھیں جس کا مجھے سب سے زیادہ فکر تھی۔

بھائی جان گوجرانوالہ سے ایک گاڑی لیکر آئے، ہم سیدھے CMH ہسپتال پہنچے۔ میرے سر کے زخم میں ٹانکے لگے۔ باقی سب کی بھی مرہم پٹی ہوئی اور ہم سب آدھی رات کو بھائی جان فاروق کے گھر پہنچے جہاں ایک ہی کمرے میں ہسپتال کی طرح سے چار بستر لگے ہوئے تھے۔

اب میری مشکل یہ تھی کے اگلے دن میری لندن کے لیئے فلائٹ تھی اور میں اب کسی صورت بھی رُکنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن سب گھر والے اس حق میں نہیں تھے کہ میں سفر کروں۔ مَیں نے اپنے اُس بھائی کو فون کیا جو میرے سفر اور بکنگ میں میری مدد کرتے تھے۔ اُن کو اپنی ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ مجھے کہنے لگے باجی اگر آپ اپنے پاؤں پر چل

سکتی ہیں تو پلیز آپ آ جائیں ۔ باقی میری ذمہ داری ہوگی کیونکہ ایک بار آپ پہلے بھی کینسل کروا چکی ہیں ۔ پھر میں نے کسی کی نہیں سُنی اُسی حالت میں میں عزیز کے گھر بھا گی گئی ۔ سب گھر والوں نے مل کر میرا جوں توں سامان باندھا اور میں اپنے سر کی پٹی اچھی طرح چھپا کر موٹا سا سکارف لپیٹ کر بہت ساری Ibuprofen کھا کر ائیر پورٹ پہنچ گئی ۔ میرے کزن بھائی نے میرا بہت ساتھ دیا مجھے جہاز کے اندر بٹھا کر ائیر ہوسٹس کو بتا کر چلا گیا۔

میرا یہ سفر ایسا تھا پہلے کراچی ، پھر دوحہ اور دوبئی سے لندن اور ہر جگہ جہاز بدلنا تھا۔ اور مَیں دوائیاں کھا کھا کر نیند میں ساتھ والے مسافر کو یہ کہہ کر کہ میری طبیعت خراب ہے، اگر میں سو جاؤں تو مجھے پلیز اُٹھا دیں اور اسطرح میں نے زخمی حالت میں لندن تک سفر طے کیا۔ الحمدللہ! خیریت سے گھر پہنچ گئی ۔ یہاں میرے گھر کسی کو اس ایکسیڈنٹ کا علم نہیں تھا۔ گھر والوں نے اور ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ خیریت سے گھر پہنچ گئی ہوں ۔ جس کام کے لیئے گئی تھی یعنی رشتہ نہ ہوسکا اور شادی کا سلسلہ کچھ دیر کے لیئے رُک گیا۔

یہاں یہ بھی ذکر کرنا ضروری ہے کہ جب میرے دونوں بیٹوں کی شادیاں ہوئیں تو بھائی جان فاروق نے نہ صرف یہ کہ شمولیت کی بلکہ میری مدد بھی فرمائی ۔ جزکم اللہ۔

1993ء میرا بیٹا ملازمت کے سلسلہ میں امریکہ چلا گیا۔ زندگی میں وہ پہلی بار گھر سے باہر گیا تھا۔ وہ امریکہ Connecticut میں گیا تھا جو نیو یارک سے چار گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ جاتے ہی دل کی تسلی کے لئے دو بیڈ روم کا گھر لے لیا کہ میرے والدین مجھے ملنے آئیں گے (جو کہ ناممکن تھا) ابھی ایک دو ماہ ہی گزرے تھے کہ فون پر فون آنے شروع ہو گئے امی آ جائیں مَیں بہت اداس ہوں ۔ پلیز تھوڑے دنوں کے لئے آ جائیں ۔ ہم بھی اُن والدین میں سے ہیں جو اپنے بچوں کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں ۔ پھر سامی صاحب نے مجھے اور

میری چھوٹی بیٹی سارہ کو تیار کر دیا کہ جائیں۔شاید دو یا تین ہفتوں کے لئے ہم اُس کے پاس چلے گئے۔ہم سیدھے نیو یارک اپنے ماموں جان محترم عبدالحمید صاحب (مرحوم) کے پاس چلے گئے۔ وہاں سے اپنی ممانی محترمہ آمنہ صاحبہ اہلیہ چوہدری عبدالحمید صاحب کو ساتھ لیکر Connecticut چلے گئے۔ ویک اینڈ پر منیر نے کہا امی میں آپ کو کینیڈا سیر کے لئے لے جاؤں وہاں آپ اپنے چچا کو بھی مل لیں اور مسجد بیت السلام بھی دیکھ لیں۔

وہ ہمیں کینیڈا لے گیا۔ایک مدت کے بعد میری ملاقات اپنے چچا منظور سے ہوئی جو پارٹیشن کے بعد پہلی بار ہوئی تھی۔ پھر کینیڈا کی بھی سیر ہوگئی۔ یہ ہم سب کا کینیڈا کا پہلا وزٹ تھا۔واپسی پر میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح سمجھا کر آئی تھی کہ تم اب یہاں اپنا دل لگاؤ۔میں بار بار نہیں آسکتی۔میرے اس طرح گھر سے جانے سے باقی بچے اور سامی صاحب یعنی پورا گھر اُلٹ پلٹ ہوجاتا ہے۔

1994ء کے آغاز کی بات ہے،ابھی دو ماہ ہی گزرے تھے کہ پھر فون پر فون میں بیمار ہو گیا ہوں۔کام چھوڑ کر نہیں آسکتا،براہ کرم آپ آجائیں۔ مَیں نے اپنے ماموں اور ممانی (اللہ اُن کے درجات بلند کرے) سے مدد مانگی کہ براہ کرم آپ اُس کے پاس جائیں۔وہ بھی گئے مگر ایک ہی بات کہ امی آپ آئیں۔ظاہر ہے مجھے جانا پڑا۔مَیں دو تین ہفتوں کے لئے پھر امریکہ گئی۔اُس کی تنہائی اور اپنے امریکہ کے چکر بچانے کا یہی حل تھا کہ اُس کی شادی کر دوں تا کہ اس کی تنہائی ختم ہو، پہلے مَیں نے کوشش کی کہ امریکہ یا کینیڈا میں ہی کوئی رشتہ مل جائے مگر ایسا ہونا سکا۔اپنے ماموں ممانی سے مشورہ کیا اُنہوں نے مشورہ دیا تم جلدی پاکستان جاؤ اور اس کی شادی کر دو۔یہ سب میرے مالی وسائل کے حساب سے بہت مشکل مشورہ تھا۔ دوسرے میرا بیٹا پاکستان شادی کرنے کے لئے بالکل راضی نہیں تھا (اس بات کو گزرے

ہوئے تقریباً 24 سال ہو گئے ہیں)ایک مسئلہ تو میرے ماموں نے اُسی وقت حل کر دیا۔ میرے ہاتھ پر اچھی خاصی رقم رکھ دی کے یہ لواور جاؤ۔سامی صاحب سے مشورہ کیا تو اُنہوں نے بھی پاکستان جانے کا مشورہ دیا۔کیونکہ ہماری خواہش بھی یہی تھی کہ بچوں کی شادیاں پاکستان کی جائیں۔سو میں اُسی دن نیویارک سے لندن پہنچی اور فوری پیارے آقا حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ سے ملاقات کا وقت لیا۔ملاقات کے لیئے گئے اور اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ حضور میں پاکستان بیٹے کی شادی کے لئے جانا چاہتی ہوں۔آپؒ نے نہ صرف یہ کہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائی بلکہ ازراہ شفقت اُسی وقت پاکستان بی بی باچھی صاحبہ اور منگلا صاحب کوفون کر دیا کہ صفیہ سامی کے بیٹے کے رشتہ کے لئے مدد کی جائے۔(مَیں اس شادی کی تفصیل یہاں نہیں بیان کروں گی کے یہ سب میں ’میری پونجی‘ اپنی کتاب میں لکھ چکی ہوں)

الحمدللہ حضورؒ کی دعاؤں سے اور وہاں سب کی مدد سے میں پانچ ہفتوں میں اپنے بیٹے کی شادی کروانے میں کامیاب ہوگئی اور پھر بہو اور بیٹے کو امریکہ روانہ کر دیا اور میں اپنے گھر پہنچ گئی۔سوچا اب میں سامی صاحب اور بچوں کو پورا وقت دے سکتی ہوں۔

کچھ ہی ماہ بعد ہمیں یہ تو خوشخبری مل ہی چکی تھی کے ہم دادا دادی بننے والے ہیں۔ہم سب بہت خوش تھے۔پھر 1995ء مارچ امریکہ سے میرے بیٹے کا فون آیا امی پلیز جلدی آ جائیں ڈاکٹروں نے بچے کے متعلق پریشانی کا اظہار کیا ہے اور اب وقت بھی قریب ہے آپ کوشش کریں اور جلدی آ جائیں۔ظاہر ہے مجھے جانا تھا مَیں گئی۔الحمدللہ ہم اپنے پیارے پوتے کے دادا دادی بن گئے۔

سچ پوچھیں اُن دنوں ہماری ساری فیملی کے اکثر لوگ مجھے کہتے تھے کے اس کو واقعی پر لگ گئے ہیں۔ہر وقت جہازوں میں ہی رہتی ہے۔لیکن یہ بھی سچ ہے مَیں اپنی مرضی یا شوق

سے کبھی بھی نہیں گئی۔ جب بھی کہیں نکلی ہوں کوئی نہ کوئی ایمرجنسی اور کام کی مجبوری سے ہی سفر کئے ہیں اور سامی صاحب کے کہنے اور تیار کرنے پر نکلی ہوں۔

1995ء کے آخری دنوں میں میری بہن عزیز کا فون آیا کہ آپا میری بیٹی کی شادی ہے تو آپ نے ضرور آنا ہے۔ پہلے تو میرا جواب تھا کہ بہن میں نہیں آ سکتی۔ اللہ شادی آپ سب کو مبارک کرے۔ مَیں سفر کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔ لیکن میرا دوسرا بیٹا بھی شادی کے لئے تیار تھا۔ اُس نے بڑے بھائی کی پاکستان میں ہوئی شادی دیکھی تو کہنے لگا ماں جی میری بھی شادی پاکستان میں ہی کریں۔ اس سے اچھا موقع اور ہو نہیں سکتا تھا۔ بہن کی خوشی بھی پوری ہو جائے گی اور بیٹے کے لئے رشتہ بھی دیکھ لیں گے۔ سامی صاحب اور بچوں کے مشورہ سے پھر پاکستان کا پروگرام بن گیا۔

پروگرام یہ بنا کہ عزیز کو نہ بتایا جائے اور یہ اُس کے لئے سرپرائیز ہو بلکہ لاہور میں کسی کو بھی نہیں بتایا۔ چھوٹے بہنوئی رفیق کو بتا دیا کہ تم ائرپورٹ سے لے لینا۔ وہ اُس وقت لاہور میں ہی تھا۔

میری بکنگ 25 دسمبر کرسمس والے دن کی ہوئی۔ اُس دن کراچی کے لئے چارٹرڈ فلائٹ تھی۔ بتایا گیا کہ جب تک مسافروں کی تعداد پوری نہ ہو گی وہ نہیں چلے گا۔ ہم نے تقریباً پانچ یا چھ گھنٹے بیٹھ کر وائیرپورٹ پر انتظار کیا۔ اللہ اللہ کر کے ہم اندر لاؤنج میں پہنچے۔ لائن لگ گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ دو پی آئی اے کی یونی فارم میں ائیر ہوسٹس کچھ پیپر ہاتھ میں پکڑے معلومات لے رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ جب میرے قریب پہنچ رہی تھیں تو مجھے لگا میرا نام لیا گیا ہے۔ میں تھوڑی پریشان ہو گئی کہ نہ جانے میں نے کیا کر دیا ہے۔ ایک سیکنڈ میں ہزاروں خیال آ گئے۔ آخر میرے پاس پہنچ کر میرا نام پوچھا۔ ساری انفارمیشن کے بعد کہتی ہیں مبارک

ہوقرعہ میں آپ کا نام نکلا ہے۔آپ ہمارے ساتھ آئیں اور فرسٹ کلاس میں ہمارے ساتھ سفر کریں۔سب ڈر جاتا رہا اور الحمدللہ بہت آرام دہ سفر گزرا۔

ہم رات کو چلے تھے۔علی الصبح کراچی پہنچ گئے ،ہمارے جہاز کے ساتھ کی connected flight لاہور جا چکی تھی۔کچھ مسافروں کو پی آئی اے والوں نے کسی دوسرے جہاز میں روانہ کر دیا۔کچھ کو'انتظار فرمایئے' کہہ کر بٹھا دیا۔یہ نہیں بتایا کہ کب تک انتظار فرمائیں،سارا دن گزر گیا۔رات بھی انتظار میں گزر گئی۔پھر تیسرا دن مسافروں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔عملہ والوں کے ساتھ مسافروں کا لڑائی جھگڑا دیکھ کر میرا بھی بہت دل کر رہا تھا کہ میں بھی لڑائی والوں کے ساتھ شامل ہو جاؤں لیکن جو لڑ رہے تھے اُن کا بھی کچھ نہیں بن رہا تھا۔میری پریشانی یہ بھی تھی کہ نہ لندن والوں کو علم کہ میں کہاں ہوں اور لاہور والوں کو تو خبر ہی نہیں دی تھی۔جن کو علم تھا وہ سوچتے ہونگے (نہیں تو نہ سہی) مَیں تیسری رات کو لاہور رات کے دو بجے پہنچی۔مجھے لینے والا کوئی نہیں تھا۔مَیں بہت حوصلہ مند ہوں مگر پھر بھی پاکستان جا کر ڈر لگ رہا تھا کہ کیا کروں۔گھر فون کیا،سب سوئے ہوئے تھے۔آواز آئی ٹیکسی لو اور آ جاؤ۔میرا جواب تھا پلیز مجھے کوئی لینے آئے میں یہاں انتظار کرتی ہوں۔لندن سے دو مسافر جو میرے ساتھ سفر کر رہے تھے،اُن سے درخواست کی کہ جب تک مجھے کوئی لینے نہ آئے آپ نہیں جائیں گے اور وہ نہیں گئے۔اس طرح میں چار دنوں میں لندن سے لاہور گھر پہنچی۔فرسٹ کلاس کا سارا مزہ برباد ہوگیا۔

دسمبر کے آخری دنوں میں میری بہن کی بیٹی حمیرا کی شادی ماشاءاللہ بہت اچھی ہوگئی۔بہت سارے رشتہ داروں سے ملاقات ہوگئی اور پھر میں اپنے مشن پر نکل کھڑی ہوئی۔بلال کے لئے لڑکی بھی جلدی مل گئی۔بچوں کے لئے رشتوں کی کوئی خواہش یا مانگ نہیں تھی اس لئے

مجھے رشتے کرنے میں زیادہ پریشانی نہیں تھی۔پہلی دوسری ہی لڑکی مجھے پسند آجاتی تھی۔الحمد للہ میرے بچوں نے میری ہر پسند کو پسند کیا اور بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔

1996ء میں جنوری کے آخر پر پاکستان سے لندن واپس آگئی اور اب یہ طے پایا کہ بیٹے کی شادی جلدی ہونی چاہیئے، لہٰذا مارچ 1996ء کے آخر میں شادی کی تاریخ طے پائی اب میرے ساتھ بلال اور میری چھوٹی بیٹی سارہ لاہور گئے۔شادی کے بعد بلال کو جلدی واپس آنا تھا۔مجھے واپس آنے کے لئے ایک ماہ کا عرصہ لگا کہ بہت سارے کاموں کو نپٹانا تھا۔

1997ء۔میری بہن بشریٰ اپنی زندگی کی کینسر کے ساتھ جنگ لڑ رہی تھی۔ہمیں علم تھا وہ بہت باہمت ہے، بہادر ہے۔میری دوسری بہن نے بھی اپنا گھر بار چھوڑ کر اُس کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔لیکن پھر بھی وہ امی ابو کے لئے بہت بے چین تھی تڑپتی تھی کہ کسی طرح زندگی میں اُن کے ساتھ ملاقات ہوجائے، لیکن یہ ہو نہ سکا کہ وہ خود اس عمر میں تھے کہ سفر کرنا اُن کے لئے ممکن نہیں تھا۔اُمی ابا جان کے لئے بھی بہت مشکل وقت تھا۔اپنی بیٹی کے لئے بیقرار اور بے چین تھے۔مگر مجبور تھے۔بشریٰ کے متعلق دل ہلا دینے والی خبریں مل رہی تھیں۔مَیں خود بھی اپنی بہن کے لئے بہت بے چین اور فکر مند تھی۔اب پھر سامی صاحب نے میرا ساتھ دیا اور مجھے اسلام آباد کے لئے تیار کر دیا۔مَیں ہمیشہ چار یا پانچ ہفتوں سے زیادہ کبھی گھر سے باہر نہیں گئی، اور اب پھر پانچ ہفتوں کے لئے تیار ہوگئی۔

بشریٰ کے علاوہ سب گھر والوں کو علم تھا۔بشریٰ کے لئے سرپرائیز تھا۔میری یہاں سے پی آئی اے کی بکنگ ہوئی۔جہاز میں مجھے اُوپر کے حصہ میں سیٹ ملی جہاں صرف چالیس لوگوں کے لئے سیٹیں تھیں۔اسلام آباد میں سیدھی بشریٰ کے پاس ہسپتال گئی۔ظاہر ہے ہم

دونوں بہنوں کا ملاپ بہت جذباتی تھا۔ وہ خوش ہوگئی میرے لئے یہی خوشی کی بات تھی کہ اُس کی زندگی میں مَیں کچھ خوشی لا سکی۔ اللہ اُس کے درجات بلند سے بلند فرمائے۔ آمین۔

دو تین ہفتوں کے بعد ربوہ اور لاہور کا چکر لگا کر واپس پھر بشریٰ کے پاس اسلام آباد ہی آنا تھا۔ لاہور میں ہمیشہ اپنی بہن عزیز کے گھر ہی جاتی ہوں۔ اب وہاں سے میرے بہنوئی صاحب نے مجھے ریل کار پر سوار کروانا تھا۔ مَیں ہمیشہ سفر میں وقت سے پہلے تیار ہو کر چل پڑتی ہوں۔ اب بھی مجھے جلدی تھی کہ ریل کار وقت پر چل پڑے گی مگر ہم لیٹ ہو رہے تھے۔ پھر میرے بہنوئی بھاگ کر رکشہ لائے اور رکشہ والے کو ڈانٹ رہے ہیں جلدی چلاؤ۔ غلطی تو ہماری تھی ہم لیٹ نکلے۔ جیسے تیسے اسٹیشن پر پہنچے۔ ریل کار نے چلنا شروع کر دیا۔ میرے بہنوئی نے چلتی ٹرین میں پہلے میرا اٹیچی پھینکا۔ پھر اُسی طرح مجھے بھاگتی ہوئی ٹرین میں دھکا دیا۔ شکر ہے ریل کے دروازہ میں بیرا کھڑا تھا اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اندر گھسیٹا۔ اب باقی میری حالت کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میری ہارٹ بیٹ 100 میل کی رفتار سے چل رہی تھی۔ آنسوؤں کا طوفان تھا۔ اُس آدمی نے مجھے سیٹ پر بٹھایا پانی لا کر دیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے آج مر جانا ہے اور وہ بھی اپنے گھر سے ہزاروں میل دور کوئی میری لاش بھی نہیں پہچان پائے گا۔ یہی غم سب سے زیادہ تھا اگلے اسٹیشن پر ایک میاں بیوی سوار ہوئے۔ اُنہوں نے میری حالت دیکھی اور ایک دعاؤں کی کتاب نکال کر مجھے دی کہ یہ لو پڑھو اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔ (وہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے) لیکن وہ کتاب آج بھی میرے پاس ہے۔ دِل میں غصہ بھی تھا کہ اب کبھی لاہور نہیں جاؤں گی (لیکن اُس کے بعد بھی بہت بار گئی ہوں)۔ خیر کسی نہ کسی طرح اسلام آباد پہنچ گئی۔ الحمد للہ۔

مَیں ابھی اسلام آباد میں ہی تھی کے سامی صاحب کے بہنوئی صاحب کی ربوہ میں وفات

ہوگئی۔سامی صاحب کا مجھے فون آیا کہ بہتر ہے کہ تم ربوہ جا کر جنازے میں شامل ہو جاؤ۔ بہت مشکل فیصلہ تھا مگر جانا تھا۔ بشریٰ نے اپنی چھوٹی بیٹی بینا (ثمینہ) کو میرے ساتھ تیار کر دیا۔رات کو چناب ایکسپریس پر ہم نے سرگودھا تک کی فرسٹ کلاس میں بکنگ کروالی (ربوہ کا ڈرتے ہوئے ٹکٹ نہیں لیا کہ ہم دونوں اکیلی تھیں) یقین کریں شاید میں زندگی میں اتنا نہیں ڈری جتنا اُس رات۔اُس کی وجہ یہ تھی کے کمپارٹمنٹ پورے کا پورا پاکستانی پولیس والوں سے بھرا ہوا تھا اور اُن کی آنکھیں ایسی تھی کے آج کی رات زندگی کی آخری رات ہے۔مجھے فکر تھی تو یہ تھی کہ میرے ساتھ ایک جوان بچی تھی۔باتھ روم کے دروازے کے آگے تک وہ ایسے تھے کہ ہماری مجال نہیں تھی ہم سوچ بھی سکیں کہ ہم نے باتھ روم جانا ہے۔

الحمد للہ کیا کہ سرگودھا آیا سارے راستہ کوئی مسافر یا ٹکٹ چیکر نہیں آیا جیسے ہی سرگودھا آیا ٹکٹ چیکر آ گیا کہ آپ کا ٹکٹ ختم ہو گیا ہے۔سرگودھا سے ہم نے نیا ٹکٹ لیا اور ربوہ تک کھڑے ہو کر سفر کیا کیونکہ اب ٹرین پولیس والوں سے خالی ہوگئی تھی اور باقی لوگوں سے بھر گئی۔دو یا تین دن کے بعد اسلام آباد کے لئے ہمیں ساتھ مل گیا اور ہم آرام سے گھر پہنچ گئے الحمد للہ۔

کچھ دنوں کے بعد میری واپسی تھی۔بشریٰ نیچے دروازے تک مجھے چھوڑنے آئی۔مجھے اپنی بہن آج بھی اُسی پوز میں کھڑی نظر آتی ہے جو آخری بار میں نے دیکھی تھی۔اللہ تعالیٰ پر کامل یقین رکھنے والی صابرہ وشاکرہ میری بہن 29 ستمبر 1997ء کو اپنے حقیقی رب کے حضور حاضر ہوگئی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرا بیٹا منیر امریکہ سے واپس آ کر اور لندن پانچ سال گزار کر سوئٹزرلینڈ ملازمت کے سلسلہ میں چلا گیا۔

2001ء۔اب اُس کی خواہش تھی کہ آپ مجھے سوئٹزرلینڈ ملنے کے لئے آئیں۔سامی صاحب کی بیماری کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو چکا تھا۔مگر ابھی چلتے پھرتے تھے۔اُس کے مجبور کرنے پر ہم اپنے بیٹے عکاشہ کے ساتھ غالباً تین ہفتوں کے لیئے وہاں اُس کے پاس چلے گئے ۔وہاں بہت سیریں کیں ،اُونچے سے اُونچے پہاڑوں پر گئے۔اگرچہ سامی صاحب جانے کو تیار نہیں ہوتے تھے پر بچوں نے اپنے ابو کے لئے ہر سہولت مہیا کی اور خوب سیر کروائی۔جنیوا بھی گئے اور وہاں کی مسجد میں نفل ادا کئے۔

2001ء۔سامی صاحب کی وفات کے بعد بیلجیم یوروٹنل سے اور پھر کینیڈا کے بھی بہت سفر کئے۔پھر میرا پاکستان جانے کا پروگرام 2005ء میں بنا۔میری بھانجی حمیرا شارجہ میں رہتی ہے۔اُس کا اصرار تھا کہ خالہ اب آپ جب بھی پاکستان جانے کا پروگرام بنائیں تو میرے پاس ضرور آنا ہوگا۔اب میرا پروگرام بنا تو میں نے اپنی بہن عزیز کو یہاں سے تیار کیا کہ واپسی پر ہم اکٹھے سیٹ بُک کروالیں گے کیونکہ اُنہوں نے بھی اپنی بیٹی کو ملنے آنا تھا واپسی میں کچھ میرا ساتھ بھی ہو جائے گا۔میں نے ایک ہفتہ شارجہ میں رُکنا تھا۔جب لاہور سے ہماری واپسی تھی تو مَیں نے خود اُن کے سارے پاسپورٹ ،ٹکٹ وغیرہ چیک کر لئے سب مکمل تھے، ہم لاہور ائیر پورٹ پر چلے گئے ۔مَیں نے اپنی بہن اور بہنوئی کو اپنے آگے کیا اُن کا سامان جب چیک ہونے لگا اور ایمیگریشن آفیسر نے پاسپورٹ چیک کئے تو کہا آپ ٹریول نہیں کر سکتے کہا آپ کے ڈاکومنٹ مکمل نہیں ہیں۔کہنے لگا پلیز آپ اپنا سامان سکیل سے اُتار لیں۔اب ہم حیران کھڑے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔بہر حال کوئی ضروری سٹمپ لگوانی تھی جونہیں لگوائی گئی۔اُن کا سامان بیلٹ سے اُتار دیا گیا، مَیں بہت پریشان ہوگئی جن کے ساتھ اتنی محنتوں سے پروگرام بنایا تھا وہ سب ختم ہو گیا،لیکن مَیں کسی صورت رُک نہیں سکتی تھی کہ

شارجہ سے لندن کے لئے میری پرواز تھی۔ بے چینی اور پریشانی کی حالت میں مَیں نے پھر اکیلے ہی سفر کیا۔ مشکل یہ بھی تھی کہ جس گھر مَیں جا رہی تھی وہ میری بہن اور اُس کی بیٹی کے سسرال تھے۔ میرا اُن کے ساتھ بہت کم تعلق تھا۔

میری بہن اور بہنوئی واپس گھر چلے گئے اور میں فکرمند جہاز میں بیٹھی تھی۔ مَیں نے اُن کو تاکید کر دی کہ وہاں اُن کو فون کر کے بتا دیں اور کوئی مجھے ائیر پورٹ سے لینے بھی آ جائے۔ گھر کے بڑوں کو تو علم ہو گیا کہ عزیز اور منظور نہیں آ رہے لیکن یہ ریکارڈ پیغام کسی نے نہیں سنا کہ مجھے بھی کوئی ائیر پورٹ سے لینے آ جائے۔ جب مَیں دوبئ پہنچی مجھے کوئی بھی لینے والا نہیں تھا۔ اب میں گھر فون کر رہی ہوں کوئی بھی فون نہیں اُٹھا رہا۔ ایک تو چھٹی کا دن دوسرے ابھی صبح کے تقریباً پانچ بجے تھے۔ یہ بھی تھا میں کسی کو پہچانتی بھی نہیں تھی ہر ایک کو غور سے دیکھ رہی تھی شاید یہی مجھے لینے والے ہوں۔ آخر اب میں نے یہ سوچ لیا اگر کوئی بھی نہ آیا تو لندن کی سیٹ کنفرم کروا لوں گی۔ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ دیکھا سامنے سے حمیرا اپنے میاں کے ساتھ بھاگی آ رہی ہے۔ شکر الحمدللہ گھر پہنچ گئی۔ اب میں صوفے پر بیٹھی ہوں اور گھر میں صبح ہی صبح جو بھی اُٹھ کر آ رہا تھا، پہلا سوال یہی کر رہا تھا کہ یہ کون ہیں؟ آنٹی عزیز اور منظور کہاں ہیں۔ سب کو میری نہیں عزیز اور منظور کی انتظار تھی۔ اب میں سب کو شرمندہ سی ہو کر باری باری اپنی سٹوری سُنا رہی تھی۔ گھر والوں نے رات کو اپنی پوری فیملی کو دعوت پر بلایا ہوا تھا کہ لاہور سے عزیز اور منظور نے آنا ہے۔ اب سب لوگ یہ پوچھ رہے تھے مہمان کہاں ہیں؟ ٹیبل پر صرف میں بیٹھی تھی جسے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ لیکن مَیں انجانے میں پھر چیف گیسٹ بن گئی۔ اگلے دن وہ اصل مہمان بھی شارجہ پہنچ گئے جن کی وجہ سے میری خاطر مدارات ہو رہی تھی۔ پھر باقی دن بہت اچھے گزرے۔

2007ء۔ میری بہن عزیز کا فون آیا کہ آپا دل اُداس ہے آپ آ جائیں۔ بہنوں کے بغیر تو میں بھی اُداس ہی رہتی ہوں مجھے بھی جانے کے لئے بہانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سامی صاحب کی وفات کے بعد ویسے بھی کوئی مصروفیت نہیں۔ فارغ ہی ہوتی ہوں کوئی بھی بلائے تیار ہو جاتی ہوں۔

میرے ماشاءاللہ پانچ بچوں کی شادیاں ہوئیں۔ اُن سب میں میری بہن عزیز کی محنت شامل رہی ہے۔ اب اُس نے مجھے اپنے لئے بلایا تھا میں بھی تیار ہوئی، لاہور گئی وہاں سے اسلام آباد، پنڈی وغیرہ کا چکر لگانے کے بعد اُس کے بیٹے کے لئے رشتہ دیکھنے ربوہ گئے۔ ہم نے دو دن کے لئے ٹیکسی بک کروالی تھی۔ ربوہ میں ہم بہت آرام سے خوب گھومے اور اپنی پرانی یادیں تازہ کیں اور واپس گھر آ گئے، اب میری واپسی میں شاید صرف باقی آٹھ یا دس دن باقی بچے تھے جن میں ایک دو دعوتیں بھی شامل تھیں۔

جمعہ کا دن تھا۔ میرے بہنوئی جمعہ پڑھ کر گھر آئے تو کھانا میز پر رکھا ہوا تھا۔ مَیں ہاتھ دھونے واش روم میں گئی۔ ہاتھوں کو صابن لگا ہوا تھا کہ یکدم زوردار گولیوں کے چلنے کی آواز آئی جو میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی، جیسے گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ ڈر کے باہر بھاگی تو کیا دیکھتی ہوں میرے بہنوئی کرسی پر بیٹھے ہیں بازو نیچے لٹکا ہوا ہے اور زمین پر خون ہی خون۔ یقین جانئے آوسان خطا ہو گئے سمجھ نہیں آئی کہ یہ کیا سین ہے۔ باہر محلہ میں شور مچا ہوا تھا۔ میری بہن کے سب سسرال والے ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔

سب لوگوں نے اکٹھے ہو کر اُن کو سہارا دیا ہوا تھا۔ مَیں بھی اُن میں شامل ہو گئی لیکن سمجھ نہیں سکی کہ ہوا کیا ہے۔ ڈر اور خوف سے جان نکل گئی تھی، میرے بہنوئی کے بازو میں گولی لگی اور بازو سے نکل کر گولی زمین پر پڑی تھی ہوا کیا؟ باہر نیچے گلی میں ہمارے گھر کے دروازے

کے سامنے لڑکوں کے دو گروہوں کی لڑائی ہوگئی۔ گولیوں کی آواز سُن کر میرے بہنوئی نے اپنی کھڑکی کھول کر باہر دیکھنا چاہا۔ شکر ہے منہ باہر کی طرف نہیں تھا بلکہ بازو باہر کی طرف تھا اور سیدھی گولی کھلی کھڑکی میں سے بازو کو چیرتی نیچے زمین پر گر گئی۔

بہت خوفناک منظر تھا۔ اُسی وقت گھر کے مرد اُن کو گود میں اُٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ میں زمین سے خون صاف نہیں کرنے دے رہی تھی کہ ابھی پولیس آئے گی مگر جب میں نے بھی کھڑکی سے باہر دیکھا تو پولیس والے آرام سے بیٹھے کوکا کولا پی رہے ہیں اور سچ پوچھیں میرا تو جسم کانپ کانپ گیا۔ یہ گھر کے اندر بیٹھے بٹھائے بھی سب کچھ ہوگیا۔ اب حال پوچھنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اپنی بہن کو دیکھ کر رحم آرہا تھا کہ کن مشکل حالات میں یہاں رہ رہی ہے۔ رات کو میرے بہنوئی بھی ہسپتال سے گھر آگئے جو کافی تکلیف میں تھے۔

میرے باقی کے دن بہت مشکل میں گزرے۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ مَیں واپس اپنے گھر جا بھی سکوں گی کہ نہیں؟ جب واپسی کے لئے جہاز میں بیٹھی اور سیٹ بیلٹ باندھی جہاز نے اُڑان بھری تو میری جان میں جان آئی۔ گھر پہنچ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

2007ء۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے سعادت بخشی اور مَیں نے ایک مبارک سفر اختیار کیا اور اللہ نے مجھے حج کی نعمت سے نوازا۔ الحمدللہ۔ اس کی تفصیل علیحدہ لکھی ہے۔

2010ء۔ کینیڈا گئی۔ 27 مئی کو خلافت احمدیہ کا صد سالہ جوبلی کا جلسہ میں نے کینیڈا میں دیکھا۔ اُس کے بعد جون میں بذریعہ کار امریکہ چلی گئی۔ وہاں بھی جلسہ سالانہ دیکھا جس میں حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ نے بھی از راہ شفقت شرکت فرمائی تھی۔ واپسی بھی بذریعہ کار ہوئی جولائی میں میری لندن واپسی ہوئی۔

2011ء۔ پھر کچھ اپنا شوق اور کچھ بہن کا بلانا۔ شاید مجھے بہانا ہی چاہئے تھا۔ پاکستان

جانے کا۔ پروگرام بنا لیا جانے سے پہلے اچھی طرح اپنی بہن کو سمجھا دیا تھا کہ میری فلائٹ رات کو قریباً ڈیڑھ دو بجے کے قریب پہنچے گی۔آپ کو مجھے اس وقت رات کو ائیر پورٹ سے لینے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی ۔ جواب ملا کوئی فکر کی بات نہیں ہم آپ کو لینے آ ئیں گے۔جب رات کو دو بجے میں لاہور پہنچی باہر نکلی کوئی اپنا نظر نہیں آیا۔ پاکستان کے حالات تو سب جانتے ہیں ۔ باہر سے بہت بہادر بنی اندر سے جان نکلی ہوئی تھی ۔گھر فون کر رہی ہوں کوئی بھی نہیں اُٹھا رہا۔یقین تھا کہ بس نیند آ گئی اور سو گئے اُن کو وقت کا پتہ ہی نہیں چلا ہوگا۔

ائیر پورٹ پر پولیس والے تھے۔اُن سے درخواست کی کہ مجھے ابھی کوئی لینے آئے گا۔ میں اندر لاؤنج میں بیٹھ جاؤں ۔غصہ سے بولا بی بی وہ سامنے باہر بینچ پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ میں نے کہا میں اکیلی ہوں ڈرتی ہوں ۔ابھی بیٹھی ہی تھی کہ دیکھا تو میری بہن اور بہنوئی ہانپتے ہوئے بھاگم بھاگ آ رہے ہیں ۔ بچاروں کا سانس پھولا ہوا تھا۔ بولے جس ٹیکسی پر ہم آ رہے تھے وہ راستہ میں خراب ہو گئی اُس نے ہمیں راستہ میں ہی اُتار دیا اور رات کے وقت کوئی سواری نہیں مل رہی تھی ۔اب ہم ایک دودھ والے کے ٹریلر پر بیٹھ کر آئے ہیں ۔معذرت ہے کہ آپ کو تکلیف ہوئی۔

کیا بتاؤں میں اپنی بات تو بھول گئی ۔اُن پر اتنا رحم آ رہا تھا کہ میری خاطر ان بیچاروں نے رات کے وقت کتنی بے آرامی اور تکلیف اُٹھائی ہے۔ہم نے وہاں ائیر پورٹ سے ہی ٹیکسی لی اور گھر پہنچے۔ٹیکسی ائیر پورٹ کمپنی کی تھی اس لئے میں نے اُن سے اُن کا نمبر لے لیا پھر اس طرح واپسی پر میں نے اپنا انتظام خود ہی کر لیا۔

2012ء۔بشریٰ کے بیٹے عمر یعنی میرے بھانجے کی شادی تھی اور پھر وہی بات خالہ ہم سب بہنوں اور بھائی کی شادی میں آپ نہیں آ ئیں ۔اب یہ ہمارے گھر کی آخری شادی ہے

آپ نے ضرور آنا ہے۔ بشریٰ کی وفات کے بعد سب بچوں کی شادی ہوئی میں واقعی کسی میں بھی شامل نہیں ہوسکی۔ میں نے بھی عمر سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ جب بھی تمہاری شادی ہوگی میں انشاءاللہ ضرور آؤں گی۔ اب اس بار مَیں نے اپنے آپ کو بہت زبردستی تیار کیا اور صرف پندرہ دن کے لیئے سیدھی اسلام آباد گئی اور وہاں سے ہی میری واپسی ہوئی۔ لگتا ہے یہ میری زندگی کا پاکستان کے لیئے آخری سفر تھا۔ بے شک پاکستان بہت یاد آتا ہے اچھا بھی لگتا ہے مگر عمر اور ہمت کے لحاظ سے اب میں یہ مشکل سفر نہیں کرسکتی۔

لیکن ہاں یہاں یورپ میں جرمنی، بیلجیم اور ہالینڈ وغیرہ کے سفر معمول کے مطابق ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ہر ایک دوسال کے بعد کینیڈا کا سفر ہوجاتا ہے۔

2017ء۔ پہلی بار تین ماہ کے لئے گئی ہوں اس لئے کہ اب میرا دوسرا بیٹا بلال بھی کینیڈا شفٹ ہوگیا ہے۔ الحمدللہ میری اپنے پوتوں پوتیوں، نواسے نواسیوں سے بہت اچھی دوستی ہے۔ مَیں اُن کے ساتھ اور وہ میرے ساتھ بہت پیار کرتے ہیں جس وجہ سے مجھے ہر حال میں اس عمر میں بھی یہ مشکل سفر مشکل نہیں لگتے۔ لیکن جو سب سے زیادہ مشکل پیش آتی ہے۔ وہ ہے امریکہ اور کینیڈا جاتے ہوئے جہاز میں ایمیگریشن فارم بھرنا۔ میری انگلش اتنی اچھی نہیں اور بہت بڑا فارم۔ لیکن الحمدللہ ہر بار میرے انگریزی دان ہمسفر میری مدد کردیتے ہیں۔ یہ اتنے جہازوں کے سفر اس خوشی میں طے کرلیتی ہوں کہ بچوں سے ملنا ہے۔ لیکن سفر میں اگر کوئی اپنا ساتھ نہ ہو تو مشکل ضرور لگتا ہے۔

جہاز میں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمیشہ میں سفر میں اکیلی ہی کیوں ہوتی ہوں؟ اور صرف گوروں کے ساتھ ہی سفر کیوں ہوتا ہے؟ گو کہ تنہائی کا یہ سفر ہمیشہ میں نے دعاؤں میں ہی گزارا ہے کیونکہ سفر میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے اور بہت بہت دعا کی توفیق بھی ملتی

ہے۔الحمدللہ۔

اللہ کا بے حد شکر ادا کرتی ہوں اللہ نے مجھے ہمت اور طاقت بخشی کہ مَیں یہ سب کچھ اپنی زندگی میں کر سکی۔الحمدللہ ان کھٹے میٹھے سفروں نے مجھے بہت کچھ سکھایا بھی اور مجھے اپنوں سے بہت قریب بھی رکھا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے احسان ہیں مجھ پر۔

اب میں اپنے بچوں کا شکر یہ بھی ادا کر دوں جو اب میری اِس عمر میں سفر کی مشکلات کو کم کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔اس بار میرے بیٹے عکاشہ نے مجھے فرسٹ کلاس میں کینیڈا کا سفر کروایا۔ وھیل چیر تو ہمیشہ کرواتے ہیں۔فرسٹ کلاس کی وجہ سے میرا سفر بہت آرام دہ گزرا۔ جہاں بیٹوں کے گھروں میں یا رشتہ داروں کے ہاں جاتی ہوں، الحمدللہ سب ہی اپنی بساط سے بڑھ کر میرے آرام کا خیال رکھتے ہیں۔ مجھ پر لازم ہے کہ میں دل کی گہرائی سے سب کا شکر یہ ادا کروں۔

یہ مَیں نے کینیڈا جاتے ہوئے جہاز میں لکھنا شروع کیا تھا۔اب اس کو واپس اپنے گھر پہنچ کر ختم کرتی ہوں اس دعا کے ساتھ کہ میرے سب بچے اور رشتہ دار جہاں بھی ہیں خوش رہیں آباد رہیں۔سب کی طرف سے مجھے اچھی اچھی اور خوشی کی خبریں آتی رہیں۔آمین۔ثم آمین۔

لیکن اب مَیں نے اپنے سب بچوں کہ کہہ دیا ہے کہ یا تو اب میرے ساتھ کوئی ہم سفر بنے یا سب مجھے میرے گھر ملنے آئیں۔

اللہ سب کا حافظ و ناصر ہو۔آمین

10 جنوری 2018ء　　　　صفیہ بشیر سامیؔ

○○

سناٹا

ماہِ رمضان کا آخری روزہ تھا اور میں اپنے کمرے میں اپنی Rocking Chair پر جھولتے ہوئے بیٹھی آہستہ سے پانی کا ایک ایک گھونٹ اپنے حلق سے اُتار رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی... گہری خاموشی... بالکل سناٹا..

مَیں آنکھیں موندھ کر کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔ مجھے یقین تھا کہ عید کا چاند ضرور نظر آ گیا ہوگا۔ نیچے میرے گھر سے شور ہنگامے کی آوازوں نے تصدیق کر دی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی تو سامنے عید کا چاند نظر آ گیا۔ حسبِ عادت دعا کے لئے ہاتھ اُٹھ گئے اور اُن اُٹھے ہوئے ہاتھوں میں مجھے وہ سب اپنے نظر آنے لگے جو آج میرے ساتھ نہیں تھے۔ مَیں کچھ دیر بعد اُسی کرسی پر اپنی ٹانگوں پر ہلکا سا کمبل ڈال کر نیم دراز ہوگئی اور ایک ایسے ماضی میں کھوگئی جس کو بیتے سالوں گزر چکے ہیں۔

اپنی بہنوں اور بھائی کے ساتھ عید مناتے ہوئے اور عید سے پہلے چوڑیاں اور مہندی نئے کپڑے اور نئے جوتوں کا ہنگامہ اور پھر عید والے دن امی جان کے ہاتھ کے بنے ہوئے مزے دار کھانے خاص طور پر بازار سے لائی ہوئی برفی اور نمک پارے کھانے کی خوشی کبھی نہیں بھولتی۔ کھا تو ویسے بھی لیتے تھے مگر جو مزا عید والے دن برفی اور نمک پارے کھانے کا

آتا اُس کی ایک الگ سے ہی خوشی ہوتی تھی۔ وہ اپنوں کے ساتھ عیدوں پر گزری باتیں بہت یادگار ہیں۔

پھر ایک دن یہی اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ماں باپ کے گھر سے ایک اجنبی شخص، جس کو میرا شوہر کہا گیا، کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ رخصتی کے وقت میں نہیں جانتی تھی کہ اس بھری ہوئی بس میں مَیں کس کے ساتھ جارہی ہوں۔ جو سیٹ میں میرے ساتھ شخص بیٹھا ہوا تھا یقیناً وہی میری زندگی کا ساتھی ہوگا۔ شادی کی خوشی والی کوئی بات نہ تھی بلکہ ایک ڈر تھا کون ہیں یہ لوگ جن پر اعتبار کر کے میرے والدین نے ان کے حوالے کردیا۔ دل کو یہی تسلی تھی اور یقین تھا کہ میرے والدین نے ضرور کچھ اچھا ہی میرے لئے سوچا اور دیکھا ہوگا۔

سسرال میں بہت خوشی منائی گئی، بہت اچھا استقبال ہوا۔ تقریباً چھ یا سات دنوں کے بعد جہاں میرے شوہر سروس کرتے تھے، مجھے بھی ان کے ساتھ وہیں جانا تھا۔

جانے کا دن آ گیا اور مَیں اُس شخص کے ساتھ، جو یوں تو ابھی اجنبی ہی کی طرح محسوس ہوتا تھا لیکن اب میرا شوہر بن چکا تھا، جانے کے لئے تیار بھی ہوگئی۔ مجھے اُنہوں نے اپنے ساتھ مردانے کمپارٹمنٹ میں ہی بٹھا لیا۔ پشاور ہمارے قصبہ سے اٹھارہ گھنٹے کا سفر تھا اور میں جس نے کبھی بھی اپنی فیملی کے علاوہ کبھی کسی کے ساتھ سفر نہیں کیا تھا اور اب میں ایک ایسے شخص کی خاطر، جس کا اور میرا ساتھ ابھی صرف آٹھ دن ہی کا تھا، سب اپنوں کو چھوڑ کر جارہی تھی۔

مَیں برقع میں لپٹی ہوئی تھی لیکن برقعے میں سے جھانکتا لال پراندہ، کلائیوں میں لال چوڑیاں اور مہندی لگے ہاتھ صاف بتا رہے تھے کہ یہ ابھی کچھ دنوں کی دلہن ہے۔ مردانہ ڈبہ اور ڈبے میں میری طرف دیکھتی ہوئی سب کی نگاہیں۔

یہ سفر میرے لئے انتہائی مشکل تھا... اور میرے رکھوالے نے جانے سے پہلے پوری

برتھ میرے لئے ریزروکروائی ہوئی تھی۔ بیچارے پوری کوشش میں تھے کہ میرا سفر آرام سے گزرے۔ ان کو احساس تھا کہ اس نوعیت کا یہ میری زندگی کا پہلا سفر ہے۔ اس اجنبی ماحول اور غیر مردوں کی موجودگی میں مَیں ایک پل بھی اونگھ نہ سکی... لیٹنا تو بہت دور کی بات تھی۔

آخر ہم پچھلی شام چھ بجے رات کو سوار ہو کر اگلی صبح، دس گیارہ بجے پشاور اسٹیشن پر اُترے۔ ہمارے پاس کافی سامان تھا۔ چھوٹا سامان تو ہم نے ساتھ لے لیا۔لیکن بڑا سامان جو بک کیا ہوا تھا، وہ میرے شوہر نے کہا مَیں تمہیں گھر چھوڑ کر آتا ہوں اور کسی بڑی سواری کا انتظام کر کے لاتا ہوں۔اُن دنوں میں تانگہ کی اچھی سواری تھی سو ہم تانگہ میں اپنا چھوٹا سامان لے کر گھر پہنچ گئے، اندر داخل ہوئے۔ میرے شوہر بہت خوش تھے کہنے لگے یہ لو یہ اب سارا گھر تمہارا ہے۔تمہیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں چوکی دار باہر ہے،لیکن اندر سے تالا لگا لو، مَیں بقایا سامان لے کر تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔

مَیں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا ہلکا سا گھر کا جائزہ لیا۔ کمرے میں ایک چار پائی نظر آئی جو کافی موٹے بان سے بُنی ہوئی تھی۔ بغیر تکیہ یا کوئی چادر کے نہ جانے کب اور کیسے اُس چار پائی پر لیٹی ہوں اور نہیں جانتی کیسے اور کب آنکھ لگی اور مَیں دنیا جہان سے ایسی کٹ گئی کہ کچھ ہوش نہیں۔ چار پانچ گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی ہڑ بڑا کر اُٹھ کر بیٹھ گئی کہ مَیں کہاں ہوں؟ چاروں طرف نظر دوڑائی میرے گھر کے ہر دروازے کے پَٹ پر نیلے، پیلے، ہرے اور لال غرض ہر رنگ کے دوپٹے لہرا رہے تھے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مَیں ہوں کہاں؟ پھر ایکدم سے وہی اجنبی چہرہ یعنی میرے شوہر میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ میز پر کھانا لگا ہوا تھا جو ظاہر ہے بازار سے لائے ہونگے۔ مجھے کہنے لگے اُٹھو منہ ہاتھ دھو لو اور کھانا کھا لو بھوک لگی ہوگی، مَیں حیران پریشان اُن کو دیکھ رہی تھی، مَیں نے پوچھا آپ اندر کیسے آئے ہیں دروازہ تو اندر سے

لاک تھا؟ پھر اُن کا جواب تھا پہلے کھانا کھالو پھر سب بتا دوں گا۔لیکن مجھے تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ ڈر بھی لگ رہا تھا کہ اگر گھر اندر سے بھی بند ہو تو کیونکر کوئی اندر آ سکتا ہے۔

کہنے لگے کہ اچھا سنو پھر... ہماری ساری کالونی والوں کو یہ علم تھا کہ آج اس گھر میں دلہن آنے والی ہے اور میں چوکی دار کو بتا کر گیا تھا کے میں سامان اسٹیشن سے لینے جا رہا ہوں آپ سامان اندر شفٹ کروانے کے لئے تیار رہیں۔ جب مَیں ایک گھنٹہ کے بعد آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔تقریباً ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ ہم نے انتظار کیا۔ہمسائی عورتیں بھی آ گئیں کہ نئی دلہن ہے نہ جانے کیا بات ہوگئی ہے جو دروزاہ ہی نہیں کھول رہی۔ کہتے ہیں کہ مجھے بھی بہت فکر لاحق ہوگئی کہ اب کیا کریں،آخر ہمارے چوکی دار نے تجویز دی کہ ٹھہریں میں کچھ کرتا ہوں۔ وہ ہمسائیوں کے گھر گیا وہاں سے دیوار پھلانگ کر ہماری چھت پر آیا، ہماری چھت پر ایک لوہے کا جنگلہ لگا ہوا تھا اُس کو ہٹایا۔اُوپر سے کچھ لوگوں نے رسے کی مدد سے اُس کو نیچے اُتارا اور اُنہوں نے اندر سے دروازہ کھولا۔ کہتے ہیں پھر جب دروازہ کھل گیا اور سارا سامان بھی اندر آ گیا، میں نے تمہیں اس لئے نہیں اُٹھایا کہ رات بھر کی تھکی ہوئی ہو، آرام کرلو۔ مَیں نے پوچھا اور یہ دوپٹے جن کو میں نے خود بھی ابھی تک نہیں دیکھا تھا تو کہنے لگے میں نے تمہارے سونے سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے گھر کو تمہارے دوپٹوں سے سجا لیا... گھر میں کوئی اور تو ہے نہیں جو تمہارا استقبال کرتا، سو چا میں خود ہی کچھ کرلوں۔

پھر کہتے ہیں اُٹھو اور دیکھو ہمارا گھر تمہارے آنے سے کتنا اچھا لگ رہا ہے، پہلے میرا گھر سونا سونا تھا اب بہار آ گئی ہے۔اور مَیں، جس کے ہاتھوں منہ اور بازوؤں پر چارپائی کے موٹے بان کے بے شمار نشانوں سے حُلیہ بدل چکا تھا۔ حیران پریشان اُن کی ان تمام باتوں سے اسقدر شرمندہ ہو رہی تھی کہ میں بیان نہیں کرسکتی میں زمین میں گڑی جا رہی تھی کہ کالونی

کے لوگ اور چوکیدار کیا سوچتے ہونگے کہ یہ کس لڑکی کو بیاہ کر لایا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ مجھے خوب خوب ڈانٹ ڈپٹ کریں گے کہ تم کتنی غیر ذمہ دار ہو کہ پہلے دن ہی مجھے تمہاری وجہ سے شرمندگی اُٹھانی پڑی، لیکن یہاں معاملہ بالکل مختلف تھا ہر بات بہت آرام اور تحمل سے سمجھائی جا رہی تھی۔

مجھے سارا گھر دکھایا ہم دونوں کے لئے کافی بڑا تین بیڈ روم کا گھر تھا جو ان کو اپنے آفس کی طرف سے ملا ہوا تھا، مَیں نے اتنا اچھا گھر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دل میں گھر تو بہت اچھا لگ رہا تھا، آنکھ جھپکتے ہی اتنے بڑے گھر کی مالکن بن گئی تھی۔ مگر یاد مجھے اپنے اُسی گھر کی آ رہی تھی جہاں سب میرے اپنے تھے جن کو چھوڑ کر میں اس شخص کے لئے آ گئی ہوں۔ وہاں کے ہنگاموں اور رونق کے بعد مجھے یہاں بہت سناٹا لگا۔

آہستہ آہستہ زندگی گزرنے لگی۔ یہ صبح اپنے آفس چلے جاتے، مجھے بہت سکون ملتا، جیسے جیسے ان کے گھر آنے کا وقت ہوتا یہی سوچ دامن گیر رہتی مَیں کیوں اس شخص کے ساتھ رہتی ہوں جس کو میں نہیں جانتی، کیا صرف ایک کاغذ پر دستخط کرنے سے کیا ہم زندگی بھر کیلئے ایک دوسرے کے ہو گئے؟

یہ بہت اچھے تھے۔ ہینڈسم خوبرو نوجوان... پڑھے لکھے، اچھی ملازمت پر، خوش اخلاق، نرم مزاج..غرض ہر وہ خوبی ان میں تھی جس کی کوئی بھی لڑکی خواہش کر سکتی ہے۔ میری سہولت کے لئے ایک مائی بھی کام کے لئے رکھ دی کہ جب میں کام پر جاؤں تو تم اکیلا پن نہ محسوس کرو۔

چھوٹے موٹے کاموں کے لئے دروازے کے باہر چوکیدار بھی تھا۔ شام کو گھر سے باہر سیر کے لئے بھی لے جاتے۔ غرض ہر طرح کا خیال رکھتے۔ پھر بھی مَیں نہیں جانتی تھی کہ مَیں

کس کشمکش کا شکار تھی۔ بظاہر ان کے سامنے کوشش کرتی تھی کہ یہ میرے اندر کا حال نہ جانیں مگر مجھے یقین تھا کہ وہ جانتے تھے یہ لڑکی بے چین ہے، ہاں میں تھی بے چین۔ اس بے چینی کی اب وجہ یہ بھی تھی کے مجھے اپنی امی بے حد یاد آ رہی تھیں اور اُن پر بے حد پیار اور رحم آ رہا تھا کہ مَیں شادی کے بعد جس مشکل میں ہوں تو میری امی نے یہ حد کیسے پار کی ہو گی اُنہیں کتنی مشکل اُٹھانی پڑی ہوگی اور کیا واقعی ہر لڑکی کو اس مشکل سے گزرنا پڑتا ہے؟

کالونی کی عورتیں دلہن دیکھنے آتیں۔ پیار بھری نظروں سے دیکھتیں ہلکا پھلکا مذاق بھی کرتیں، سچ پوچھیں مَیں اُن کے چہرے غور سے دیکھتی رہتی کے انہوں نے کیسے اپنی زندگی کا آغاز کیا ہوگا؟ یہ جو اتنی مسکرا کر مجھے دیکھتی ہیں کیا ان کے اندر بھی کوئی بھڑکتا ہوا سناٹا ہے؟ لیکن مجھے وہ سب بہت پُرسکون لگتی تھیں میں کیوں نہیں ہوں؟ یہ سوال مَیں اپنے آپ سے ہر وقت کرتی رہتی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس طرح کی زندگی عورتوں پر ظلم ہے کہ لڑکی کو ایک غیر مرد کے حوالے اسے جانے بنا ہی کر دیا جاتا ہے۔

غرض مَیں اسی اُلجھن میں تھی۔ ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا اور عید آ گئی۔ یہ کام سے واپس آئے مَیں چولہے کے پاس بیٹھی رو رہی تھی کھانا بھی نہیں بنایا تھا۔ یہ گھبرا گئے کہ کیا بات ہے؟ مَیں نے کہا میں واپس گھر جانا چاہتی ہوں۔ یہ حیران پریشان میرا منہ دیکھ رہے تھے کہ کیا کہہ رہی ہوں، ابھی تو صرف ایک ماہ ہوا ہے۔ لیکن میری ضد تھی کہ واپس گھر بس اور کوئی بات نہیں۔ انہوں نے بہت سمجھایا کہ اچھا سوچنے تو دو مجھے، سب رشتے دار کیا سوچیں گے؟ میرے گھر والے کیا کہیں گے؟ بہت ساری باتیں تھیں۔ لیکن میری ایک ہی بات تھی واپس گھر اور پھر ہم واپسی کے لئے تیار ہو گئے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی اور مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کوئی کیا سوچتا ہے اور نہ ہی مجھے ان کے چہرے کی پریشانی کی کوئی فکر تھی۔

مجھے اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ ابھی ایک ماہ پہلے شادی پر کافی خرچ ہوا ہوگا اب ان کی کوئی مالی مشکلات تو نہیں ہیں۔ شاید انجانے میں مَیں اس مرد کو یہ سزا دے رہی تھی کہ وہ مجھے اپنوں سے چھڑا کر لے آئے ہیں اور مَیں جیت گئی ہوں اور واپس جا رہی ہوں۔

مَیں واپس اپنے گھر آ کر بہت خوش تھی، لیکن اپنی امی جان کے چہرے پر پریشانی دیکھی وہ اور میرے سسرال والے سب ہی کے چہروں پر پریشانی تھی کہ لڑکی اتنی جلدی واپس آ گئی۔ میرے شوہر سب کو تسلی دے رہے تھے کہ مَیں خود لے کر آیا ہوں، شادی کے بعد پہلی عید تو والدین کے ساتھ ہی کرنی چاہئے۔ مَیں ان کے اس طرح بات بنانے پر حیران تھی کہ یہ کیوں میرے لئے سب کچھ کر رہے ہیں؟ اپنے گھر والوں کی پریشانی پر غصہ تھا کہ بجائے اس کے کہ سب خوش ہوں میں آ گئی ہوں، یہ سب مجھ سے اُلٹے سیدھے سوال کر رہے ہیں، کچھ دنوں کے بعد یہ واپس چلے گئے کہ چھٹی نہیں تھی۔ انہوں نے جاتے ہوئے مجھ سے پوچھا واپس جانا ہے میرا جواب نفی میں تھا۔ مَیں ان کے ساتھ نہیں گئی۔

یہ واپس چلے گئے۔ میرے سب گھر والے ان کے دیوانے ہو گئے کہ کتنا اچھا انسان ہے، گھر والے تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اور میں صرف ان سب کو اُن کے گُن گاتے سنتی تھی مگر میں نہ دل سے اور نہ زبان سے کوئی لفظ بھی ان کے لئے نہیں بولتی تھی۔

پھر ہر روز ان کے خطوط آنے شروع ہو گئے۔ خط میرے ہی نام ہوتا مگر یہی سب گھر والوں کے لئے بھی۔ یہ ایک کھلا خط ہوتا اور ہر خط اتنا پیار بھرا، مزاح سے بھرپور میری امی اور بہن بھائیوں کی تعریفوں سے بھرا ہوتا۔ یہ بات مجھے بہت اچھی لگنے لگی۔ ان خطوط سے پھر آہستہ آہستہ مَیں وہ آگ کا دریا پار کرنے لگی جس میں مَیں جل رہی تھی۔ پھر ایک دن ایسا خط آیا جس میں مجھ سے پوچھا گیا کیا میں آپ کو لینے آ جاؤں؟ اس بات کا بھی مَیں نے کھل کر

جواب نہیں دیا بس آپ کی مرضی کہہ کر ٹال گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد میں پھر اُسی گھر میں تھی جہاں میں ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اب یہ گھر مجھے اچھا لگنے لگا۔اس گھر کو میں سجانے سنوارنے لگی ہمسائی عورتوں کے ساتھ بھی دوستی اچھی لگنے لگی۔

زندگی نارمل ہوتی جا رہی تھی۔کبھی کبھی مذاق میں مجھے کہتے واپس گھر امی کے پاس جانا ہے تو لے چلتا ہوں۔ میرے پاس جواب تو کوئی نہیں تھا بس شرما کر چپ ہو جاتی۔ وہ سارا غصہ ضد آہستہ آہستہ سب پیار میں بدلنے لگا اور ہم نے ایک بہت ہی محبت بھری زندگی کا آغاز کیا۔اس میں میرا کوئی کمال نہیں تھا اگر یہ اتنے سمجھدار، تحمل والے نہ ہوتے تو شاید میں کبھی بھی ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں نہ بن پاتی۔

بچے ہوئے...بچوں کے ساتھ بہت مصروف زندگی گزری پھر کچھ بچوں کی شادیاں بھی ہو گئیں۔اتنی مصروف اور اتنی محبت بھری کہ نہ کبھی مجھے ہنگاموں کی یاد ستائی اور نہ کبھی سناٹوں سے خوف آیا۔

پھر اچانک...میرے ساتھ وہ ہو گیا جس کا مَیں سوچ بھی نہیں سکتی تھی، میری محبت، میری آہیں، میرے آنسو، میرے بچوں کی پکار..کوئی بھی اُن تک نہ پہنچ پائی، وہ جو میری ایک بات اور ایک سانس پر جان دیتے تھے وہ اپنی ہی جان سے چلے گئے۔اب تو بس اُس ہاتھ کا لمس یاد ہے، گرم پیشانی پر آخری بوسہ یاد ہے اور ایک خلا ہے جو پُر نہیں ہو سکتا، ایک یاد ہے جو دل سے نہیں جاتی، ایک خوشبو ہے جس کی مہک باقی ہے۔ایک آہ ہے جو اندر ہی دب جاتی ہے۔اِک کسک ہے جو دل میں ہر وقت چبھی رہتی ہے۔

سوچتی ہوں کہاں چلے گئے...! سب لوگ...مجھے چھوڑ کر...عید کا موقع ہے اور کوئی مجھے عید مبارک بھی کہنے نہیں آ رہا۔ یکبارگی دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے چیخی اور پھر رونا شروع

کر دیا۔شاید سب بچے اب جوان ہو چکے تھے اور اپنے اپنے گھروں میں آباد تھے۔ مجھے اپنی گزری تمام عمر کی عیدیں یاد آنے لگیں۔ آنسو ایک بار پھر میرے ضبط سے باہر ہو گئے۔ میرے پیارے کہاں چلے گئے۔ پہلی بار بن روئے میری آنکھیں برسے چلی جا رہیں تھیں۔ میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بغیر کوشش کہ آنکھ نم ہو۔

وہ جو میرے لئے کبھی اجنبی تھا اُس کو مجھ سے بچھڑے ہوئے سالوں بیت گئے ہیں، الماری کھولتی ہوں، اُن کے وہ پرانے خطوط پڑھتی ہوں، تو سوچتی ہوں اگر مجھے اپنا دل و جان سے بنا ہی لیا تھا اور مجھے اب اس قابل بھی نہیں چھوڑا تھا کہ آپ کے بغیر زندہ رہوں تو مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے ہیں؟ اس بات کا مجھے کوئی جواب نہیں ملتا۔ اب جبکہ میں 70 سال سے بھی بہت آگے جا چکی ہوں، جسم کمزور ہو گیا ہے، طاقت بھی کم ہو گئی ہے۔ چہرے پر بے تحاشا جھریاں ہیں، ہر وقت یادوں کا بسیرا رہتا ہے۔

کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی...موت کی سی سردی محسوس ہونے لگی۔ بوڑھا جسم ہلکی سی ہوا سے بھی تھرتھرانے لگتا ہے، مَیں نے بیڈ کا سہارا لیتے ہوئے کانپتی ٹانگوں سے چل کر کھڑکی کے پٹ بند کئے اور لرزتی ہوئی بے جان ہو کر کھلی آنکھوں سے اپنے لحاف میں سسکیاں لیتے ہوئے جا گھسی۔

رات کی بھیگی بھیگی چھتوں کی طرح
میری پلکوں پہ تھوڑی نمی رہ گئی
مَیں نے روکا نہیں وہ چلا ہی گیا
بے بسی دور تک دیکھتی رہ گئی
زندگی میں تمہاری کمی رہ گئی

بچے بہت اچھے ہیں...خیال رکھتے ہیں...سب اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔لیکن بہت مصروف ہیں،فون کر لیتے ہیں۔کبھی کبھار چکر بھی لگا لیتے ہیں۔

مگراب میرے اردگرد ایک سناٹا ہے...ہولناک...بہت ہی گہرا سناٹا۔

اوراب یہ سناٹا مجھے اچھا بھی لگتا ہے...مَیں اسی سناٹے میں گم رہنا چاہتی ہوں۔

(النصرت-شمارہ2-لجنہ اماءاللہ یوکے-2016-2017)

○○

My Late Father
Bashiruddin Ahmad Sami

(Ballal Ahmad Sami - London)

30th of September 2001

My father had been diagnosed with Cancer in January 2001; during the early stages of his illness you would not have known what was going on inside him physically or mentally. He was a quiet man who never spoke unless he had something worthwhile to say and hated time wasting. He would control his own feelings and pain to avoid causing any inconvenience to any member of his family or friends and refrained from discussing his illness. During this period he would always look content and continued to carry a smile on his face even though he knew that his life was about to change.

Known as Sami Sahib, he had volunteered on a semi-permanent basis the last 15 years of his life to Jaamat work. He would be proud when any of his children would contribute to Jammat activities and always reminded his children of the importance of Khilafat. By the grace of Allah he continued to serve the Jammat until the last possible opportunity even during his illness.

In April 2001, during standard keyhole surgery doctors hit complications and had to carry out a major operation, this was the

beginning of the downhill struggle for my father. From this point onwards there were several operations and on each occasion we knew that this could be the last time we would see him, yet each time he would fight back, he had extreme faith in Allah and never lost the will to live.

He would be astonished that so many people would phone my mum and would ask about his health, he would continue to say “Allah ka Shukar Hai,” he never lost faith and was always content and kept reminding us that everything was in the “Hand’s of Allah” and he would be satisfied with whatever Allah has chosen therefore we should not worry but instead we should continue to pray for him.

At this stage the whole family including my sisters Lubna, Sarah and brothers Munir and Okasha had only one thing in mind and that was the care of my father and support of my mother. I lived in Scotland at the time and travelled back to London on several occasions during his illness. He would be excited to see our older son Usman who was three at the time as he would be to see all of his grandchildren who loved him dearly.

My younger brother Okasha (Kashi) who was preparing for his final year dissertation during the nights and continuous round trips to the hospital during the day must have received most of my father’s prayers. He showed complete dedication to his care throughout the illness. He provided moral and physical comfort throughout and was also fortunate enough to be holding his hand with my mother in his final moments.

Towards the end of July 2001, I told my wife about a dream

concerning my father, where he had said “I’m waiting for you”, my wife who was into her 9th month pregency insisted that I should leave for London at once and visit my father. Keeping our faith in Allah I flew to London on Sunday 29th of July.

This was the last time I saw my father, I could not speak as tears would start to flow and I did not want to cause my father any further pain. I knew in my heart that this was the last time I would see him. I just stood over him and ran my fingers through his hair hoping that I could give him some sort of comfort in his last hours. It was nothing like I had expected, my father had lost any form of expressions. I thought he would smile when he met me like I had seen in my dream yet he could not smile nor speak. He knew I had arrived and would just gaze. In my heart I knew that he had been waiting to see me before he would return to Allah and words where not needed as we both knew what each other wanted to say.

This poem reflects the feelings I had when I last met my father two days before his death.

Unspoken Words

To read your face like an open book
With thoughts engraved upon your look

Silence say's more; don't say too much
Pain that can be felt but never touched

Your Gaze recites to Allah’s way
A prayer that reveals all you say

The Smile you've written, sealed in time
Your Love can be found between the lines

My fingers fluent, through your hair
Words so untangled without a care

Unspoken lips to morning woken
A Story told your silence broken

Two days later Allah showed us his mercy on the 31st of July my father passed away and returned to his creator. On the 12th of August 2001 our new baby boy was born he was named Haaris Bashir Ahmad in memory of my late father.

During his entire illness our mother was the tower of strength for the whole family. Regardless of her extreme pain she stayed strong. Late Sami Sahib had been a kind and gentle father who loved all of his family and in return all of his family miss him extremely and pray for him everyday.

By the Grace of Allah Hazoor kindly offered the funeral prayers on the 2nd of August 2001 and my Father was laid to rest at Brookwood cemetery Woking. We will always remember the support provided to us by the UK Jaamat and for all the people who came to visit and offer their condolences there are many who require special thanks but we are forever grateful to Hazoor we will never forget his kindness and prayers for my father during his illness.

☪☪☪

حرفِ آخر

زندگی دینے والے رب کی احسان مند ہوں جس نے مجھے یہ زندگی دی اوراس لئے بھی کہ اِس زندگی کے آخری پڑاؤ میں بھی میرے حواس خمسہ بالکل درست کام کر رہے ہیں ۔ یہ میرے رب کا اوراس انمول زندگی کا مجھ پر احسان ہے۔

آج بھی میں یہ کہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی کہ میں لکھنا نہیں جانتی ۔ ہرگز یہ میری عاجزی یاانکساری نہیں ہے بلکہ یہی سچ ہے۔فارغ ہوتی ہوں اورتو میری کوئی مصروفیت ہےنہیں،تو کیا کروں...بس پھر وقت گزارنے کے لئے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ جاتی ہوں جو اس ناقص سمجھ میں آتا ہے لکھتی جاتی ہوں اوراپنی محسنہ امتہ الباری ناصر صاحبہ کو میل کر دیتی ہوں ۔وہ اُس کی نوک پلک ٹھیک کر دیتی ہیں اور میں خوش ہوکر اُن سب تحریروں کو اکٹھا کر کے اپنا شوق پورا کرتی رہتی ہوں۔ یہ سب حقیقت ہے جس کو میں نے بیان کر دیا۔

مجھے اعتراف کرنے میں معمولی سا بھی عار محسوس نہیں ہوتا کہ میں یہ کہوں کہ اگر میرے اپنے مجھے اس کام میں مدد نہ کریں تو واقعی میں ایک حرف بھی نہیں لکھ سکتی۔ جو بھی لکھتی ہوں سب کی مدد کا مرہونِ منت ہے۔اس میں امتہ الباری ناصر صاحبہ کہ علاوہ میرے ماموں زاد بھائی مولانا عبدالباسط شاہد صاحب اور میری بھانجی سعدی (صدیقہ سلطانہ صاحبہ) بھی شامل ہیں۔

میری اس محنت میں اور بھی بہت لوگ شامل ہو جاتے ہیں جو قدم قدم میری رہنمائی فرماتے ہیں، میں اُن سب کی بھی ممنون ہوں۔ اپنے بھائی اسلم خالد سے بھی مشورے لیتی رہتی ہوں اور اُن کے مشوروں کے تحت لکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔

بہت شکر گزار ہوں محترم شمس الحق صاحب کی جنہوں نے سب سے پہلے ''من کے موتی'' کی پروف ریڈنگ کی۔ جزاھم اللہ۔

مکرم و محترم مولانا لئیق احمد طاہر صاحب کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی شفقت اور رہنمائی نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرمائی اور میرے معمولی لکھے ہوئے کو بھی بہت اچھا کہہ کر حوصلہ بڑھایا۔ میں خوش ہو کر چھپوانے کی ہمت کر لیتی ہوں۔

مکرم و محترم مولانا نسیم احمد باجوہ صاحب کا بھی دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کرتی ہوں، جنہوں نے محترم امیر صاحب کے کہنے پر نظر ثانی کی اور قیمتی تبصرہ فرمایا۔ جزاکم اللہ۔

اللہ تعالیٰ میرے ان تمام محسنوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہمیشہ ان نیکیوں کو قبول فرمائے۔ آمین۔

الحمد للہ ..! میں نے اس دنیا میں بہت اچھی اور خوشگوار زندگی گزاری ہے۔ بے شمار اپنوں اور غیروں سے محبتیں اور پیار پایا۔ اللہ نے میری اوقات سے بڑھ کر مجھ پر احسان اور کرم کئے۔ اپنے حصےّ کے غم بھی پائے لیکن فضلوں کی بارش کبھی کم نہیں ہوئی۔

اللہ تبارک تعالیٰ سے یہی خواہش اور دعا ہے کہ وہ مجھے اپنی رحمتوں اور برکتوں کی چادر میں ڈھانپ لے۔ آمین ثم آمین۔ میں خود بھی اب اِک ''حرفِ آخر'' ہی ہوں۔ اللہ مجھ پر رحم کی نظر فرمائے۔ میری بخشش کرے۔ آمین۔

مستحق ہوں.. میرے لئے دعاؤں کی خیرات کرتے رہیں۔

صفیہ بشیر سامیؔ

○○

'من کے موتی' میری نظر میں

واٹس ایپ پہ دن میں کئی پیغامات آتے ہیں جو کہ اتنی دفعہ نظروں سے گزارنے پڑتے ہیں کہ جھنجھلاہٹ ہونے لگتی ہے، مگر کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دل میں اتر جاتے ہیں۔ ابھی کسی نے بھیجا:

''حکیم لقمان کا قول ہے۔ میں نے زندگی میں تین سو سال لوگوں کا علاج کیا۔ اس طویل تجربے سے اس نتیجے پر پہنچا کہ بہترین صحت بخش دوا عزت اور محبت ہے۔ کسی نے پوچھا اگر یہ اثر نہ کرے تو؟ جواب دیا دوا کی مقدار بڑھا دو۔''

ابھی میں اس کا لطف لے رہی تھی کہ آپا صفیہ صاحبہ کا پیغام آیا:

''کیا باری کے من کے چند موتی میرے 'من کے موتی' کے لئے مل جائیں گے؟ درخواست ہے۔۔زور نہیں۔''

ہوا یہ تھا کہ اس سے پہلے بھی آپا نے کتاب کے لئے کچھ لکھنے کے لئے کہا تھا مگر خود کو اس قابل نہ سمجھتے ہوئے معذرت نما خاموشی اختیار کر لی تھی۔ آج انہوں نے دوا کی خوراک بڑھا دی اور میں لکھنے بیٹھ گئی۔

کتاب 'من کے موتی' من کے موتیوں سے زیادہ آنکھوں کے موتی ہیں۔ اس نوع کی کتب کے لئے جن میں لکھنے والا اپنا دل نچوڑ کر ڈال دے، اصناف ادب میں نیا نام اور مقام

تراشنا پڑے گا۔اس سے پہلے آپا نے 'میری پونجی' لکھی تھی جو اپنی سادگی اور سچائی کی خوشبو میں بسی دلوں میں گھر کر گئی۔آپا بہت حوصلے والی ہیں، اپنے اشک بھی سجا کے پیش کر دئے۔ یہ کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے جو کترنیں پہلے رلی میں لگنے سے رہ گئی تھیں، انہیں ترتیب دیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں قدم قدم ساتھ رہی ہوں مگر ایسا کچھ نہیں کیا جس کے لئے وہ اس قدر شکر گزار ہو رہی ہیں۔اللہ پاک ان کے دل میں ہماری محبت بڑھاتا رہے اور وہ دعاؤں میں ڈھل ڈھل کر مغفرت کا سامان بنتی رہیں۔آمین۔اللھم آمین۔

میری یہ پھوپھی زاد بہن بالکل ایک قدرتی پہاڑی جھرنے کی طرح لکھاری بن گئیں۔ جب پانی کے لئے زیرِ زمین گُھٹ کر رہنا دوبھر ہو جاتا ہے تو وہ پہاڑوں کا دل چیر کر بہہ نکلتا ہے۔ٹھنڈا میٹھا دھیرے دھیرے مسلسل بہنے والا رواں جھرنا جو اپنے طبعی جوش سے بہتا ہے اور دوسرے اس سے فائدہ اُٹھا لیتے ہیں۔سچی کھری بے لاگ تاریخی معلومات کی حامل یہ کتاب ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔اللہ تعالیٰ اس کو نافع الناس بنائے۔عمر کے اس دور میں کئے ہوئے کام اس لئے بھی اہم ہوتے ہیں کہ وہ زبانِ حال سے کہتے ہیں:

ہم تو جس طرح بنے کام کئے جاتے ہیں
آپ کے وقت میں یہ سلسلہ بدنام نہ ہو

خاکسار

امۃ الباری ناصر

○○

یاربّ یہی دُعا ہے کہ ہر کام ہو بخیر
اکرام لازوال ہو انعام ہو بخیر

ہر وقت عافیت رہے ہر گام ہو بخیر
آغاز بھی بخیر ہو انجام بھی بخیر

(حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہؓ)

Safia Bashir Sami - London